JAN 87



بانی: حافظ عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی
بیادگار: زین العابدین ... سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

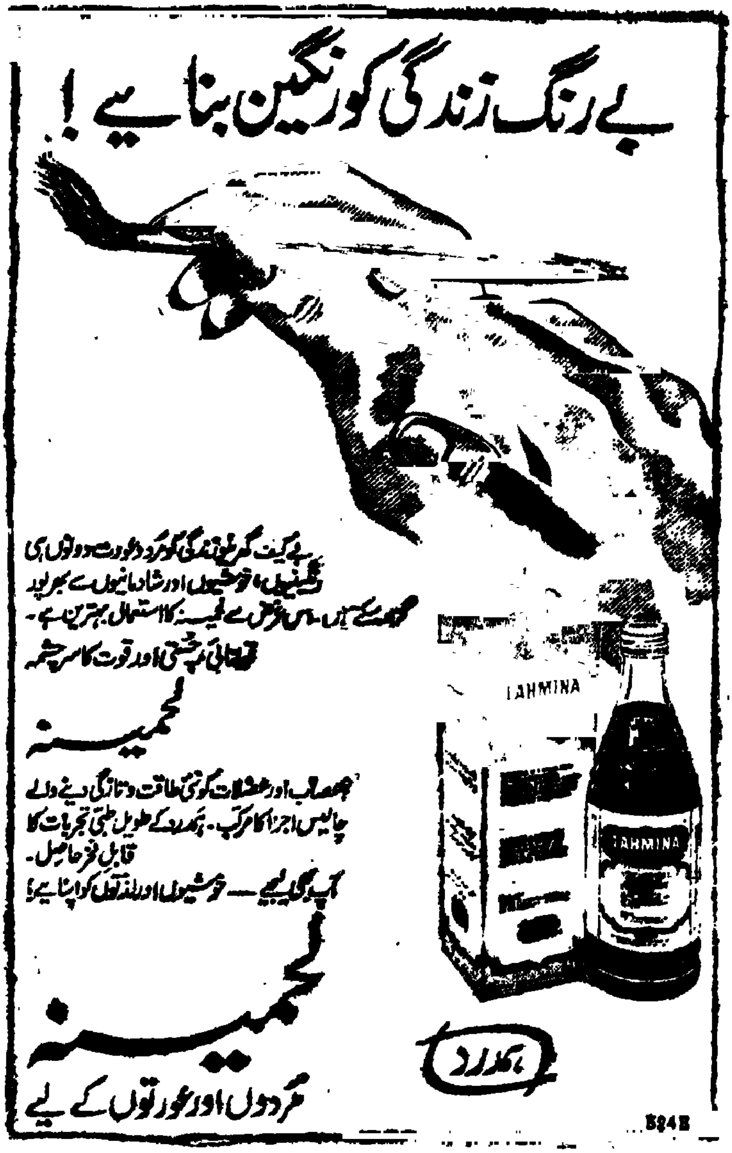
جنوری ۱۹۸۷ء

• چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنسہاروی
• ایڈیٹر: جمیل منظر سنسہاروی
• معاون: شکیل احمد جمالی
عبدالقیوم ابدالی

مجلسِ مشاورت
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر - ڈاکٹر بوجا ریڈی

• جلد - ۴۹
• شمارہ - ۱
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ - گیا

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے - زر سالانہ: ۲۴ روپے - لائف ممبری: پانچ سو اکاون روپے


بے رنگ زندگی کو رنگین بنائیے!
بے کیف گھریلو زندگی کو مرد و عورت دونوں ہی رنگینیوں، خوشیوں اور شادمانیوں سے بھرپور کر سکتے ہیں۔ اس غرض سے تحمینہ کا استعمال بہترین ہے۔
توانائی، چستی اور قوت کا سرچشمہ
تحمینہ
اعصاب اور عضلات کو نئی طاقت و تازگی دینے والے چالیس اجزا کا مرکب۔ ہمدرد کے طویل طبی تجربات کا قابلِ فخر حاصل۔
آپ بھی لیجیے — خوشیوں اور لذتوں کو اپنائیے!
تحمینہ
مردوں اور عورتوں کے لیے
ہمدرد
TAHMINA
TAHMINA
B24B

(نمود)

چھٹی داؤدی بوہرہ عالمی کانفرنس کا استقبال

خبر ہے کہ ۶۔۷ اور ۸ فروری ۸۷ء کو اندور میں داؤدی بوہرہ برادری کی چھٹی عالمی کانفرنس کے اجلاس ہو رہے ہے۔ عام طور پر اس جماعت کے رہبروں نے اسے عام مسلمانوں سے کاٹ کر ایک الگ اجنبی اور نامانوس انداز میں چلانے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی لئے اس کے مذہبی امور میں سرّیت اور اخفا کا احساس ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ روایتی طور پر جماعت کے قائدین نے مذہبی، ثقافتی، سماجی اور انفرادی سطح پر اسے نامانوس بنائے رکھنے میں ہی اپنا فائدہ تصور کیا ہے۔ قائدین نے اسلام اور قرآن کے احکامات کے ساتھ ساتھ اپنے احکامات چلانے کے لئے یہ روش اپنائی تھی چنانچہ اس جماعت کے روایتی ڈھانچے میں استحصال اور استعمار کی متعدد نشانیاں پیدا ہو گئیں ——— اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسی جماعت کے انصاف پسند انسانیت دوست اور حق نواز حضرات نے اصلاح کی تحریک چلائی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ، افریقہ اور دوسرے بہت سے ممالک اور خطوں میں مقبول عام ہو چکی ہے۔

اور اب اندور میں اس اصلاح پسند تحریک کی چھٹی عالمی کانفرنس ہو رہی ہے۔ ہم سبھوں کو چاہیئے کہ ہم اس تحریک کا استقبال کریں، اس لئے کہ اس کے ذریعے داؤدی بوہرہ فرقہ میں قیادت کے نام پر جبر و استحصال کرنے والوں اور اسلام کے نام پر خفیہ انداز میں کام کرنے والوں کا منصوبہ ناکام ہوگا۔ ظلم و استبداد کا خاتمہ ہوگا۔ مسلمانوں کے مختلف گروپ کے عوام ایک دوسرے سے قریب ہونا چاہتے ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی قیادتیں انہیں الگ الگ خانوں میں مقید رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس قید و بند کو توڑنے والی ہر تحریک ہمارے لئے قابل مبارکباد ہونی چاہیئے۔ اس لئے ہم اندور میں ہونے والی کانفرنس کا صدق دل سے استقبال کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔

جمیل منظر سنسہاروی

مس کائنات رشید
ریسرچ اسکالر، گریڈیہہ (بہار)

علّامہ جمیل مظہری کی شاعری میں
تشکیک کا پہلو بہ معنی تضحیک

یہ بات اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ علامہ جمیل مظہری ایک کامیاب صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں اور بیسویں صدی کے چند مشہور اور مثال پرست شعرا میں صفِ اوّل کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی رنگا رنگ اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے معاصر شاعروں میں علامہ اقبالؒ کے بعد یقیناً ان کا درجہ بلند ہے۔ علامہ اپنے ہم عصروں سے متاثر ضرور تھے مگر انھوں نے کسی کی تقلید یا پیروی نہیں کی۔ ان کی شاعری پر ان کا ہی لہجہ حاوی تھا۔ انھیں اپنے طرزِ سخن پر بھرپور اعتماد تھا۔ اور یہی خود اعتمادی نے ان کے خیالات و افکار کو تشکیک کی اس سولی پر لاکھڑا کر دیا جہاں پہنچ کر تضحیک کے پھندے سے بچ نکلنا مشکل تھا۔ موصوف کی نثر اور شاعری میں تشکیک کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ تضحیک کے گمان کو مبالغے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اپنے ایک مضمون "ایک خیال" میں رقم طراز ہیں:

> "..... میں تم سے کہتا ہوں کہ تم خدا سے نہ ڈرو، نہ تم خدا کی عبادت کر کے خدا کی توہین کرو، تمہاری نمازیں اور تمہاری پرستش خدا کی سب سے بڑی توہین ہے، اس لئے سب سے بڑا گناہ اور سب سے گھناؤنا پاپ، مہا پاپ اور کھلا ہوا ظلم اپنی ذات پر بھی اور اپنے خدا پر بھی ہے۔ تم سب سے بڑا ظالم ہو اور ظالموں کی اس دنیا میں سب سے بڑا مظلوم خدا ہے۔"

اسلامی اصطلاحات میں کرامات اور معجزات

وہ ایسے ایسے الگ لفظ ہیں جن کا تعلق اسم اعظم اور ذاتِ نبویؐ کے لئے مخصوص ہیں۔ معجزات نبی کا خاصا ہیں۔ ان سے انحراف یا انھیں شعبدہ بازی سے تعبیر کرنا توہینِ رسول ہے۔ جمیل مظہری کی تشکیک کا وہ پہلو جو تضحیک کے نیزے کی اَنی پہ ٹنگا ہوا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

"..... معجزہ شعبدہ بازی ہے اور اس ایمان کی حقیقت ہی کیا ہے جو ذہنوں کو کھوکھلا کر اور قوتِ ادراک کو دم بخود کر کے حاصل ہو۔"

علامہ کے چند مضامین سے قطع نظر انکی شاعری پہ غائر نظر ڈالی جائے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ جمیل صاحب کی شاعری کا بیشتر حصہ معصیت کا شکار ہوگیا ہے۔ تشکیک کے دوہرے پن نے تضحیک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی رقمطراز ہیں:

"..... وہ ایسے متشکک شاعر نظر آتے ہیں کہ "وجودِ خدا" کو بھی آذر صفت انسان کی صنم تراشی قرار دیتے ہیں۔ اور خدا کے روایتی تصوّر سے بیزاری کا احساس کرتے ہیں۔ وہ اسے انسان کی اپنی بے بسی اور بیچارگی کی خود ساختہ پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔"

(سہیل جمیل مظہری نمبر صفحہ ۱۲۵)

ڈاکٹر ہاشمی کے اقتباس اور اپنی تحقیق کو مزید جلا بخشنے کے لئے میں علامہ کے چند اقتباس پیش کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے تشکیک کی حد سے تجاوز کرکے تضحیک کا سامان پیدا کردیا ہے۔ اور اسم واحد کی ذات کو شرک کی حد تک مشکوک بنانے میں سفلی کارناموں کو بھی مات دیدی ہے:

آذر بھی حیراں ہے اس صنم تراشی پہ
سو بتوں کو جوڑا ہے اک خدا بنایا ہے

ٹوٹتے جاتے ہیں اوہام و عقائد کی طلسم
پردہ ہائے نور و ظلمت پھاڑتا جاتا ہوں میں

وہیں تک خدا ہے، وہیں تک خدا ہے
جہاں بے کسی ڈھونڈتی ہو سہارا

تھی وہ شاید اپنی ہی بیچارگی کی اک پکار
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں

کیسا پردہ جمیل، کیسا جلوہ؟
دیتا رہا تیرگی کو دھوکا جلوہ!
گھیرے ہوتے گئے حجاباتِ فریب
چلاتی رہی نظر کہ جلوہ جلوہ!

تشکیک کا عنصر ہمیں غالب اور اقبال کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ غالب نے جنت کی حقیقت

کو دل بہلانے کا سبب جانا۔ اقبال کے تصور میں
یہ STATE OF MIND ہے۔ مگر جمیل مظہری
کی شاعری میں یہ عنصر کچھ زیادہ ہی بے باک ہوئی
کا شکار ہو گیا ہے۔ جو خود ان کے عقائد کو انا غزل
پہ لاکھڑا کر دیا ہے کہ تشکیک شدت کاملہ سے
انکار کی صورت اختیار کرنے لگی ہے۔ بقول جمیل
مظہری:

"دوزخ تو تم بنا ہی چکے اپنی اس دنیا کو
اب رہی جنت، تو اس کائنات میں،
اس آفاق میں، اس کی چھتوں کے نیچے
یا اوپر جنت کہیں نہیں ہے، اگر کہیں ہے
تو تمہارے ذہنوں میں، ______"

علامہ کی علمی قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف
ایک دنیا کرتی ہے۔ تلاش و جستجو کا عنصر علامہ کی
فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اب چاہے وہ صوفیانہ
اور مابعد الطبیعاتی ارشادات ہو یا فلسفیانہ اور
قلندرانہ اعتقاد۔ جہاں تک شاعری میں تشکیک
کا مسئلہ ہے، کم و بیش اردو کے بیشتر شعرا میں
جزوی طور پہ ہی سہی شامل ہے خصوصاً مرزا غالب کے
یہاں یہ جز کل کے پیکر میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

مگر جب یہی کل جمیل [redacted] کے تخلیقی شعور سے گزر
کر صفحۂ قرطاس پہ نظر آتا ہے تو اس کی تشکیکی شکل
مضحکہ خیز حد تک مسخ ہو جاتی ہے اور تضحیک کا دھندلا
دھندلا عکس نظر دھندلے پن کے باوجود نمایاں
نظر آنے لگتا ہے ؎

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں
مگر نتائج کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آ رہا ہوں

جمیل صاحب کی زندگی میں ہی باشعور قارئین نے
موصوف کو ان کی بڑھتی ہوئی تشکیک کی جانب توجہ
دلانے کی کوشش کی تھی اور اس بات کا احساس شاید
خود علامہ کو بھی شدت سے تھا۔ انھوں نے اپنی صفائی
میں بہت سارے جواز رکھے، دلیلیں پیش کیں اور
آخر کار اپنی خفت مٹانے کے لئے یہ بات اپنی
نوک زبان پہ لانی ہی پڑی ؎

منکر ہوں آئمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا
سارے مرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے

علامہ کی شاعری کے بارے میں بقول رضا مظہری
ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

"..... جمیل مظہری کے کلام کا وہی
حصہ قابلِ قدر ہے جو روحانیت اور
شبابیات سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ
کچھ وہ نظمیں اور اشعار بھی قابلِ توجہ
ہیں جن میں حیات و کائنات سے متعلق
ان کے گہرے اور وسیع مشاہدات، تفکرات
و تاثرات کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔"

("سہیل" جمیل مظہری نمبر ص)

اور حیات و کائنات سے گہرے اشارات سے متعلق
ہیں ثبوت علامہ کا مندرجہ ذیل شعر ہے ؎

اس کو کیا حق ہے کہ قطرے سے سمندر مانگے
جس نے قطرے کو سکھایا نہیں دریا ہونا

بہر حال مجموعی طور پر ہم یہ بات وثوق سے
کہہ سکتے ہیں کہ اگر جمیل مظہری کی شاعری میں
تشکیک کا پہلو اس قدر نمایاں نہ ہوتا تو ان
کی شاعری کا وہ حصہ جو حساس طبقے کے لئے دل
شکنی کا باعث بنا، موصوف کی شاعرانہ عظمت
اور شخصیت پر دال ثابت ہوتی۔ ∞



عبدالحق حقانی القاسمی (ایم اے)
دارالعلوم دیوبند

عیسیٰ فرتاب کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر

شیلے نے کہا کہ "اخلاقیت کی بنیادیں واعظوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ شاعروں کے ہاتھوں رکھی جاتی ہیں"۔ اس جملے کی روشنی میں ہم موجودہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کہنا بجا ہوتا ہے کہ اکثر شعراء کی غزلیں اخلاقیات کی بنیاد رکھنے کے بجائے مخرب اخلاق ثابت ہوئی ہیں۔ غزل نے جب سے عریانیت، جنسی بے راہ روی اختیار کی ہے اسی وقت سے شاعری کا حسن غزل کے ستر پردوں میں رکھ کر دھندلا سا ہو گیا ہے، اسی عریانیت اور بے راہ روی نے کلیم الدین احمد کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ غزل کی صنف کو نیم وحشیانہ صنفِ سخن سے تعبیر کریں۔ اگر دنیا میں سعدی، ولی دکنی جو صنم کدۂ غزل کے آذر ہیں موجود ہوتے تو ایسی صورت حال دیکھ کر یقیناً چیخ اٹھتے۔ اس غزل کی وجہ سے شاعری جو ایک بحرِ بیکراں تھی جوئے کم آب ہو کر رہ گئی۔ غزلیہ شاعری کا سب سے اہم [illegible] کا ناز و غمزہ ہے۔ غزلوں میں اکثر و بیشتر عشاق کے خیالات کی سفارت ہوتی ہے آج کل کے شعراء جن کے ہاتھوں میں شاعری کی باگ ڈور ہے وہ بھی اسی گرداب کے تیراک نظر آتے ہیں اور ان دنوں تو دستِ شعراء میں تہذیب کی ڈوریاں پھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں جب شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں تو تہذیب و متانت کوسوں دور نکل جاتی ہیں۔ متانت و سنجیدگی کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ فراق، نظامی، دجامی جیسے مقدس لوگ بھی اس حمام میں ننگے ہو جاتے ہیں۔ اور فراق و دیگر شعراء کی غزلوں میں تو جابجا جنسی اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی لئے قول شیلے کے مطابق میدانِ غزل کے شہ سواروں کے ہاتھوں اخلاقیات کا سنگِ بنیاد رکھنا ناممکن ہے۔ ہاں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن میں اخلاق و انسانیت کا اجالا موجود ہے۔

ان ہی کی صف میں مولانا عیسیٰ فرتاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جابجا ہمیں انسانیت کی کرن نظر آتی ہے۔ وہ وسعتِ خیال کے شیدائی ہیں

وشتِ حقیقت کے سیاح ہیں۔ حقیقت نگاری، صداقت، خلوص ان کے خامۂ زرنگار کا طرۂ امتیاز ہے ان کی غزلوں میں تہذیبی، اخلاقی اقدار کی آئینہ داری ہے۔ ان کے اشعار میں صرف لفظی بازی گری نہیں ہوتی ہے اور الفاظ کا ایسا مہمل اور ناموزوں سیلاب رواں نہیں ہوتا ہے جس سے معنی فنا ہو جاتے ہوں بلکہ ان کے اشعار میں معنی کی کرن بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے الفاظ سے جہانِ معنی کی آبادکاری کا کام لیا ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ کی خوبصورت اور خوش آہنگ نشست کے ساتھ جذبات و خیالات کا تموج بھی ہوتا ہے۔ یہ عام شاعروں اور شعراء کی طرح صرف جذبات کی دکانیں نہیں سجاتے اور نہ ہی معمولی جذبات و خیالات کے طلسم سے مسحور ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی اور فکر و نظر کی ایسی رفعت ہے جہاں عام شعراء کی رسائی ناممکن ہے۔ یہ عام شعراء کی طرح شراب کے جاں دادہ، دورِ جام کے ستم زدہ، عشق کے زخم خوردہ نہیں لگتے۔ اس لئے ان کی پاکیزہ شاعری میں جا بجا اخلاقی شہ پارے بھی نظر آتے ہیں۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ ساتھ عالمانہ فکر و بصیرت بھی تھی۔ ان کی شاعری میر و غالب و اقبال کی آواز کی بازگشت ہے گویا خم خانۂ غالب و اقبال کی شراب ہے جو دوبارہ کشیدہ کی گئی ہے اور دو آتشہ ہو گئی ہے۔

حضرت فرتاب نے انہیں شعراء کی زمین پر نقش

ادائیاں کی ہیں اور درحقیقت ان کی شاعری کے
موتی انہیں قطروں سے بنے ہیں مگر ان کی نظموں کی وسعت
نے اس میں جدت اسلوب کے نئے نئے پیرائے پیدا
کئے۔ ان کی ساری نظمیں اور غزلیں ترانۂ حقیقت کا
ایک نغمہ ہیں۔ یہ اپنی شاعری میں آب و تاب نہیں
چڑھاتے ہیں اور عروس سخن کو سنوارنے کے لئے
مبالغہ و تحریف کے مشاطہ استعمال نہیں کرتے ہیں۔
شعری و ادبی تناظر میں ان کی ادبی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں
نے صحیفۂ فطرت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اسلئے
ان کی اکثر نظمیں مناظر فطرت کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔
حضرت مولانا کی صبح نظم میں حسن صبیحی کی جھلک اور
شام غزل میں حسن ملیحی کی ادا ہے۔ انکی غزلوں

سے متانت و سنجیدگی اور پختہ کلامی کی شان ہویدا
ہے۔ انکی شاعری میں عام شعراء کی طرح گدایانہ ابرام
نہیں پایا جاتا ہے وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ
غالب کی طرح یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ملک قناعت کے اس شہنشاہ، وادی حقیقت
کے مسافر، دشت حقیقت کے سیاح، اقلیم نظم
کے تاجدار، قلمرو غزل کے شہریار کو پورنیہ ضلع کی کیفیت
کا تاج پہناتے ہوئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے کہ ؎

جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
یہ رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنا
عظیم شاعر زمانہ کی ستم ظریفی، اور اس اجڑے دیار میں
رہنے والوں کی ناقدر شناسیوں اور تنگ نظریوں کا شکار
وقت کے بے رحم ہاتھوں کی نذر ہوگیا۔ یہ بات ضرور رہی
کہ خاموشی کے ساتھ علم و ادب کے گیسو سنوارتا رہا۔

افسوس صد افسوس کہ حضرت فرتاب فقہ، حدیث
تاریخ شعر و ادب میں کمال رکھتے تھے مگر اتنے شاہکاروں
کے ساتھ ان کا افقِ شہرت نہایت ہی تاریک ہے۔
حضرت اوائل عمر ہی سے ایسی ایسی غزلیں اور نظمیں کہتے
کہ لوگ بے ساختہ داد و تحسین کے غلغلے بلند کرتے اور
جب اوجِ شباب کو پہونچے تو ان کا دامن کمالات
کے پھولوں سے لبریز تھا۔ مگر اتنے کمالات کے باوجود
وطن کی ناقدر شناسی نے انہیں شہرتِ دوام نہ بخشی اور
ان کے فکر و فن کو اجاگر نہ ہونے دیا۔

قاضی عبد الغفار کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ
انہوں نے اپنے موتی ان لوگوں کے سامنے بکھیرے جو سنگ
ریزے اور موتی کا فرق نہیں جانتے تھے۔ قاضی عبد الغفار
کی روح سے معذرت چاہتا ہوں کہ انھوں نے یہ جملہ فانی
بدایونی کے سلسلے میں تحریر کیا تھا مگر میں نے یہی فرتاب
کے لئے استعمال کر لیا۔ پورنیہ کے لوگوں نے اس گنجِ گرانمایہ
کی کوئی قدر نہ کی۔ اگر یہی فرتاب کسی اور خطے میں ہوتے
تو شہرت انہیں اپنے دامن میں لیکر ناز کرتی۔ حضرتِ
فرتاب نے اہلِ وطن کی ناقدر شناسی کو دیکھ کر بہت
ہی مایوسانہ لہجے میں یہ فرمایا ہے کہ ؎

اُجاڑ دیس میں کسی قدر گفتگو نہ سہی
ہر ایک غنچہ میں احساسِ رنگ و بُو نہ سہی
زمانہ یاد رکھے گا مری نوا خوانی
یہ سوز وہ ہے جو سازِ زباں نہیں ہوتا

فرتاب کی شاعری کا یہ بھی کمال ہے کہ انھوں
نے اردو میں عربی و فارسی کے جملے جا بجا اس خوبصورتی
سے پیوند کیا کہ گویا انگوٹھے پر نگین جڑا ہو۔ فرتاب
نے اپنے اشعار میں زمانہ سے وابستہ مسائل کی نقاب
کشائی میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔

انھوں نے دنیائے ادب کو "ارمغانِ سخن" کے
نام سے ایک تحفہ دیا ہے جس میں ان کی اقلیم نظم و غزل
کی بادشاہت کے چند سکے ہیں۔ ۰۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔
جس کے پہلے ہی صفحہ پر صبائی کے مرثیہ کے اشعار ہیں اور
وہ بھی خونِ جگر سے رنگین ہے۔ "احساسِ رنگ و بُو"،
"بوستاں برائے دوستاں" فارسی و اردو مجموعۂ کلام انکی
شہرت کے بال و پر ہیں۔ "بوستاں برائے دوستاں" شیخ
سعدی کے منظوم دفترِ اخلاقِ بوستان کا نعم البدل ہے۔
اور بھی دوسرے غیر مطبوعہ شعری و نثری ذخیرے ہیں جو اربابِ
ذوق کی محفل میں یہ صدا لگاتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ ع

بیا و دیدہ گر ایں جا بود سخن دانی

اب ان کے رنگِ تغزل کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔
ملاحظہ فرمائیے ؎

مثالِ شمع مزار یارب جہان میں مجھکو گداز کردے
رخِ حقیقت پہ کر کے شیدا حریفِ بزمِ مجاز کردے

حسین الحق
آنڈاری ہاؤس ـ شاہ ہارون ـ سہسرام

ایک نثری مرثیہ

سنگینوں کی نوک کے نیچے دبا، آزادی کے لئے چھٹپٹاتا، ایک ادھ مرا اظہار

---

(۱) ہوا سے کہو اپنے بال کھولے، پانی سے کہو اپنی باڑھ اُتارے، مٹی سے کہو اپنے کو پریشان کرے، آگ سے کہو اپنے کو پشیمان کرے کہ کئی صدیاں گذر چکنے پہ پیدا ہونے والے لال نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ـــــــ

اے شورہ پُشت آسمان! تیرے ستاروں کی روشنی کم ہو کہ تُو رذیلوں کا دوست ہے!

اے خاک لئیم! تیری قوتِ نمو کم ہو کہ تم نے اپنے لعلِ بدخشاں لٹا دیئے!

اے انسان ضعیف البنیان! تیری ماں تیرا ماتم کرے کہ تُو نے مکر سے شیر کا شکار کیا۔

اے آنکھ! خون بہا کہ شجاعت ظلم اور سازش سے ہار گئی۔

اے ہاتھ! سینہ پیٹ کہ ہاتھ بڑھا کر حق چھیننے والا نہیں رہا۔

اے سیو! گنج ہو کہ میدان کا رزار میں نبرد آزما ہونے والا رخصت ہوا۔

اے سر! احترام میں جھک کہ نہ جھکنے والا سر کٹ چکا

اے قلم! اس کا مرثیہ لکھ جس کی تاریخ لکھنے کے لئے تجھے وقت کا انتظار ہے!!

○ ہو سکتا ہے کہ کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔

(۲) (جنس اور شہوت کو تمام جذبات کا منبع اور مخرج بتانے والے فرائڈ کی رہنمائی قبول کی جاسکتی ہے میکاولی ہماری دانش کا قطب نما بن سکتا ہے جس نے کہا تھا کہ ایفائے عہد سیاستداں کی کمزوری ہے۔ مجیب الرحمٰن کا قاتل ہیرو کی کرسی پر بیٹھ سکتا ہے۔ نواکھالی اور حیدر آباد کے قاتل قومی قائد قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ نطشے اور اقبال جیسے لوگ "سپرمین" کے چکر میں ابلیس، ہٹلر اور مسولینی کی تعریف کرسکتے ہیں)

لیکن اے گبرو جوان! میں تیرا ماتم نہیں کرسکتا کیونکہ میں ایک بزدل اور ڈرپوک انسان ہوں، اور بزدل اور ڈرپوک کو کسی بہادر آدمی کی تعریف یا ماتم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اے گبرو جوان! میں تیرا ماتم نہیں کرسکتا کیوں کہ فی الحال میں پروپیگنڈے کے رنج میں ہوں، اور پروپیگنڈے پر تا حال اقتدار حاوی ہے۔

اے گبرو جوان! ہم رخصت ہوں، اپنی اپنی راہ چلیں اور وقت کا انتظار کریں۔ جو سب سے بڑا منصف ہے!!

○ مجھے خوف ہے کہ پھر کچھ غلط ہو گیا ہے۔

(۳) — ماتم اُس شعلۂ جوالہ کا جو اپنی آتشِ شوق کا لقمۂ تر بنا۔
ماتم اُس قدرِ عنا کا جو گھر سے سج دھج کر چلا اور بیچ راہ میں بے ستر ہو گیا۔
ماتم اُس شمشیر افگن کا جس نے اپنا گلا خود کاٹ لیا۔
ماتم اس لعلِ بدخشاں کا جو کوئلے کے ڈھیر میں جا پڑا۔
ماتم اس درویش کا جو بے خودی کی راہ چلا اور دل شکستی کے دام میں گرفتار رہا۔
ماتم اس قلندر کا جس نے فقر کا ڈھنڈورا پیٹا اور حرص و ہوس کے کوچے میں جا نکلا۔

○ لعنت میرے قلم پر جو خوشبوؤں کے مرکز سے چلا اور بجبجاتے سنڈاس میں گرا۔

(۴) ماتم اُن جالوروں کے زیاں کا جو نظریئے کی بھینٹ چڑھیں
ماتم اُن تمام مرنے والوں کا جو تنظام کے جبر کا شکار ہوئے ——————

ایک مرتبہ پھر لعنت میرے قلم پر جو ظالم اور مظلوم کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں ناکام رہا مگر تب اتنا ضرور ہے کہ قلم میرے ہاتھ سے ابھی تک چھوٹا نہیں ہے —— ▲▲

قیوم خضرؔ — دیوان محلہ، پٹنہ نمبر ۸

ریزۂ شیشۂ دل

[قطعات]

مرے ہی شہر میں مجھکو نہیں پہچانتے ہیں لوگ
زمانے میں یگانوں کا ستم ایسا بھی ہوتا ہے
جہاں گزری جوانی بھی، جہاں گزرا ہے بچپن بھی
وہیں اب اجنبی ہوں میں کرم ایسا بھی ہوتا ہے

مصیبت میں ہمیشہ چُپ رہا بھی تو نہیں جاتا
مگر حالِ درونِ دل کہا بھی تو نہیں جاتا
اُداسی میں کوئی بھی گفتگو اچھی نہیں لگتی
مگر بپتا سُنائے بِن رہا بھی تو نہیں جاتا

زندگی بھر میں چراغِ فن جلاتا ہی رہا
بس یہی مجھ سے قصورِ مجرمانہ ہوگیا
میں نے خونِ دل سے سینچا ہے ادب کے پھول کو
گھر لُٹا کر کوچۂ فن میں دِوانہ ہوگیا

امیری پر تُو نازاں ہے، فقیری میں میں شاداں ہوں
مبارک ہو غرور و تمکنت، شانِ امیرانہ
مِری خود داری نے مجھکو ہمیشہ سرخرو رکھا
متاعِ زندگانی ہے مِرا طرزِ فقیرانہ

ایم۔کے۔اثر

دردِ مشترک

تمہارے
ہونٹوں سے جکڑے ہوئے سکوت نے
سایوں کو
صبحِ فردا کا گوشوارہ پیش کرنے کے ساتھ ہی
نمازِ فجر کی اذاں دیتے ہوئے سُنا ہے
میں بھی
اپنے دشت ریزہ ریزہ جسم سے
ٹپکتی ہوئی بوندوں کی صدائیں
گِن رہا ہوں
سمت، لاسمت کے نرغے میں
کِرم خوردہ انا
تقاضوں کو تک رہی ہے
اور
دوسری جانب
مشیتِ ایزدی بھی
جاہ و جلال میں
نوکِ لامتناہی پر
دردِ مشترک سمیٹ رہی ہے ! ▲

میری موت

صدیوں پہلے کی طرح آج پھر
لاش قبر میں اتارنے سے قبل
لوگوں کی بھیڑ
انتظار میں کھڑی
مجھے تک رہی تھی
کچھ صدائیں آرہی تھیں
"اجازت ہے ؟"
میں نے ایم۔کے۔اثر کی لاش
قبر میں اتارنے سے قبل
صرف اتنا پوچھا
ہاں اجازت دیتا ہوں
لیکن تم لوگوں نے
مجھے قبر میں اتارنے سے قبل
کس سے اجازت لی تھی ؟ ▲

فضل امام ملک

رشتہ

خلوص — !
گم ہو گئی ہے
چائے کی ایک
پیالی میں
اور — !
آدمی تیز تیز
بڑھا جا رہا ہے
نئی صدی کی طرف
کتنا — !
نزدیک کا رشتہ ہے
آدمی
اور چائے کی اس
پیالی میں ▲

اب

اب — !
شیشوں کا شہر
خوفزدہ نہیں ہے
پتھر رہا ہے
بلکہ — !
اب پتھروں کے مکانات ہی
سہمے سہمے سے رہتے ہیں
شیشوں کے
خوف سے ▲

بجھ گئی جب پل میں قندیل حیات
تب سمجھ میں آئی قیمت حیات
پتی پتی سا بکھر جاتا ہے پھول
یوں سمجھ میں آتی ہے تکمیل حیات
زہر سے بڑھ کر ہے ظالم زندگی
اور کیا دیکھیں گے تذلیل حیات
بے خبر ہو یہ بھی تو امکان ہے
تم صدف سے دور ہو تمثیل حیات
جب گیا میدانِ غم خواری سلیم
بھر گئی اشکوں سے زنبیل حیات

سلیم انصاری جبل پور

لاکھ دنیا میں ملے یہاں دولت کوئی
کیا چکائے گا مگر پیار کی قیمت کوئی
کیوں مرا ذکر زمانے میں کیا کرتے ہو
مجھکو درکار نہیں دوستو شہرت کوئی
راز اس میں کوئی پوشیدہ یقیناً ہوگا
مجھ سے کرتا ہے جو اس شہر میں نفرت کوئی
نام تیرا ہے مرے لب پہ برابر جاری
اس سے بڑھ کر نہیں دنیا میں عبادت کوئی
اک جھلک اور مرے یار دکھا دے مجھکو
پھر نہ دیگا کبھی سیفی تجھے زحمت کوئی

سیفی سرونجی، سرونج

لہو گرما، فضا کو نور منظر کر
زمیں کو صبح کا زیور میسر کر
بکھر جائیں نہ تیرے آئینہ خانے
ہماری آرزوؤں کو نہ پتھر کر
کرشمے یوں نہ کر اندھے اندر سب
ذرا کچھ معجزے پردے کے باہر کر
تعلق توڑ دے آنکھوں سے نیندوں کا
وہی پھر خواب سے محروم بستر کر
نہیں کہتا کہ غیروں سے تو برتر کر
مرا حق ہے مجھے میرے برابر کر
میں یوں کب تک، میری کیا عزت رہے گی
مکاں چھوڑ بیٹھا گھر سے بے گھر کر
سفر لد شن دیاروں کا لہو چاہے
بدن بھر دھوپ مجھکو بھی میسر کر

روشن لال روشن بندوا


چمکتی سفیدی کیلئے
موڈی
دھلائی کا صابن
پنجاب سوپ فیکٹری

باہمی امداد

مضطر انصاری
محلہ کنکرہ کلاں۔ شاہجہاں پور (یو۔پی)

رات کے سات بج گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد محمود شہر سے واپس آیا تھا۔ اور اب اپنے مکان کے صحن میں پڑی کھاٹ پر لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا جہاں ستارے جگمگا رہے تھے۔ محمود کو اچانک ننھا عزیزالدین یاد آیا۔ عزیزالدین جو اس کا پہلا بچہ تھا۔ لیکن وہ اسے اپنا بچہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیوں کہ اس نے سیٹھ رحمانی کے ہاتھوں اسے بیچ لیا تھا۔ عزیزالدین کے تعلق سے محمود کو اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ سولہ سال پہلے وہ اسی گاؤں حمایت پور میں پیدا ہوا تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر میں اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ حمایت پور کے نشیبی علاقے میں سیلاب آیا تھا۔ اس کا گھر سیلاب نے ہڑپ کر لیا تھا۔ کئی دوسرے مکانات بھی سیلاب نے تباہ کئے۔ محمود کے والدین کو سیلاب نے نگل لیا۔ ملیٹری کے جوانوں نے محمود کو بچایا۔ وہ سیلاب زدہ افراد کے ساتھ شہر بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ وہ وہاں امدادی کیمپ میں رہا۔ اسی کیمپ میں سیٹھ رحمانی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سیٹھ جی اسے اپنے بنگلے لے گئے۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں کنوارے تھے۔ محمود کو سیٹھ کے بڈھے چپڑاسی نے بتایا تھا کہ سیٹھ جی کی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ میں گزرا تھا بزنس کے سلسلے میں۔ لیکن جب سے انہوں نے ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا تھا یہاں رہنے لگے تھے۔ — محمود نے سیٹھ کے یہاں نوکر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ شکل و صورت کا برا نہیں تھا۔ رحمانی صاحب اس سے محبت کا برتاؤ کرنے لگے۔ سو روپے تنخواہ مقرر کر دی۔ ویسے تو سیٹھ جی کے یہاں کئی عورتیں اور مرد نوکر تھے۔ لیکن سیٹھ جی محمود کو زیادہ چاہتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ صبح پانچ بجے اٹھتا۔ منہ ہاتھ دھوتا اور سیٹھ جی کے بنگلے چلا جاتا جو اس کے کوارٹر سے ملحق تھا۔ وہ رات گئے تک وہاں کام کرتا رہتا۔ سیٹھ جی کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی رات کو گیارہ بجے واپس آتے اور کبھی بارہ بجے۔ وہ کچن کے دروازے کے پاس بیٹھا اونگھتا رہتا۔ دوسرے نوکر بھی بیٹھے رہتے۔ ایسے مواقع پر اسے والدین یاد آجاتے ہیں۔ وہ سوچتا حمایت پور بھاگ جائے۔ کھیتوں میں کام کرے اور پیٹ پالے۔ سیٹھ جی کے یہاں کام زیادہ تھا۔ رات گئے تک جاگنا بھی تکلیف دہ تھا۔ وہ کبھی اونگھتے اونگھتے سو جاتا تو سیٹھ جی ناراض [illegible] اسے ڈانٹتے پھٹکارتے — کچھ ہی عرصے بعد وہ زندگی

سے عاجز ہوگیا اور حمایت پور بھاگ آیا تھا۔ بھاگتے وقت اس نے عہد کیا تھا کہ سیٹھ جی کے یہاں واپس نہیں جائے گا۔ لیکن واپس جانا پڑا۔ سیٹھ جی دو سپاہیوں کے ساتھ حمایت پور آئے اور اسے پکڑ لے گئے تھے۔

انہوں دنوں وہ انجم صاحب کے یہاں جانے لگا۔ وہ سیٹھ جی کے بنگلے کے قریب ایک خوبصورت کالونی میں رہتے تھے۔ بظاہر شریف آدمی تھے۔ انکی بیگم صاحبہ بڑی رحم دل اور عقلمند تھیں۔ کبھی کبھار اسے دو چار روپے انعام دے دیتی تھیں۔ کیونکہ وہ انکو بازار سے سودا سلف لا دیتا تھا۔ حالانکہ صاحب کی نظر بچا کر۔ ایسا اس لئے کرتا تھا کہ سیٹھ جی اور انجم صاحب کے درمیان دشمنی چل رہی تھی۔ دشمنی کا سبب تھا الیکشن۔ انہی میں انجم صاحب نے سیٹھ جی سے دو الیکشن لڑے تھے اور دونوں بار ہار گئے تھے۔ دونوں بار انجم صاحب نے الیکشن کے درمیان سیٹھ جی پر گھناؤنے الزام لگائے تھے۔ مثلاً یہ کہ سیٹھ جی الیکشن جیتنے کے بعد غریبوں کے کام نہیں آتے۔ چوروں ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ٹھیکیداروں سے موٹی موٹی رقمیں اینٹھتے ہیں۔ انکو نئے نئے ٹھیکے دلواتے ہیں۔ یہ بیانات کہاں تک صحیح تھے۔ محمود نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔ اسے سیٹھ جی یا انجم صاحب کی دشمنی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس اتنا معلوم تھا کہ سیٹھ جی ترقی کے میدان میں تیز رفتار گھوڑے کی طرح اڑ رہے تھے۔ اپنے رشتہ داروں کو بھی آگے بڑھا رہے تھے۔

محمود کو سیٹھ جی کا پہلا الیکشن یاد نہیں تھا۔ دوسرا یاد تھا۔ کیونکہ دوسرا الیکشن جیتنے کے بعد سیٹھ جی نے نوجوان ریحانہ بیگم سے شادی کی تھی۔ ریحانہ بیگم جہاں بہت خوبصورت تھیں وہاں ان میں ایک عیب بھی تھا۔ زیادہ چلنے پھرنے سے مجبور تھیں۔ ان کے دائیں پیر کا پنجہ موٹر سائیکل سے ایک تصادم میں اس وقت کٹ گیا تھا جب وہ کنواری تھیں اور بی۔اے کا آخری پرچہ کرکے گھر واپس آ رہی تھیں۔ پیر کے اس عیب کے سبب ہی شاید ان کے والدین نے سیٹھ جی سے انکی شادی کر دی تھی۔ وہ بے حد حساس تھیں۔ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتی تھیں۔ بنگلے کے اندر ٹہل لیتی تھیں۔ تقریبات میں بھی شرکت نہیں کرتی تھیں۔ کیونکہ شریر عورتیں ان کو لنگڑی بی بی کہکر مسکراتی تھیں۔ بچے ہنستے تھے۔

ریحانہ بیگم ایک بری عادت کا شکار بھی تھیں۔ سوتے وقت اپنا سر ضرور دبواتی تھیں۔ سیٹھ جی شادی سے اب تک کئی خادمائیں بدل چکے تھے۔ ان کا سر دابنے کے لئے کوئی خادمہ زیادہ دنوں تک نہ ٹکتی تھی۔ در اصل ریحانہ بیگم کا سر دبانے کا وقت بڑا غیر مناسب تھا۔ وہ جب سونے کے لئے پلنگ پر لیٹتیں تو خادمہ سے سر دبوانا شروع کر دیتیں۔ خادمہ کو نیند آنے لگتی۔ ریحانہ بیگم اسے ڈانٹتیں۔ خادمہ بھاگ جاتی۔ آخر میں یہ خدمت محمود کے سپرد کی گئی۔ مجبوراً اس نے یہ خدمت انجام دینی شروع کی۔ اب وہ تیرہ چودہ سال کا ہو گیا تھا۔ اسے ریحانہ بیگم کا سر دابنے سے شرم محسوس ہونے

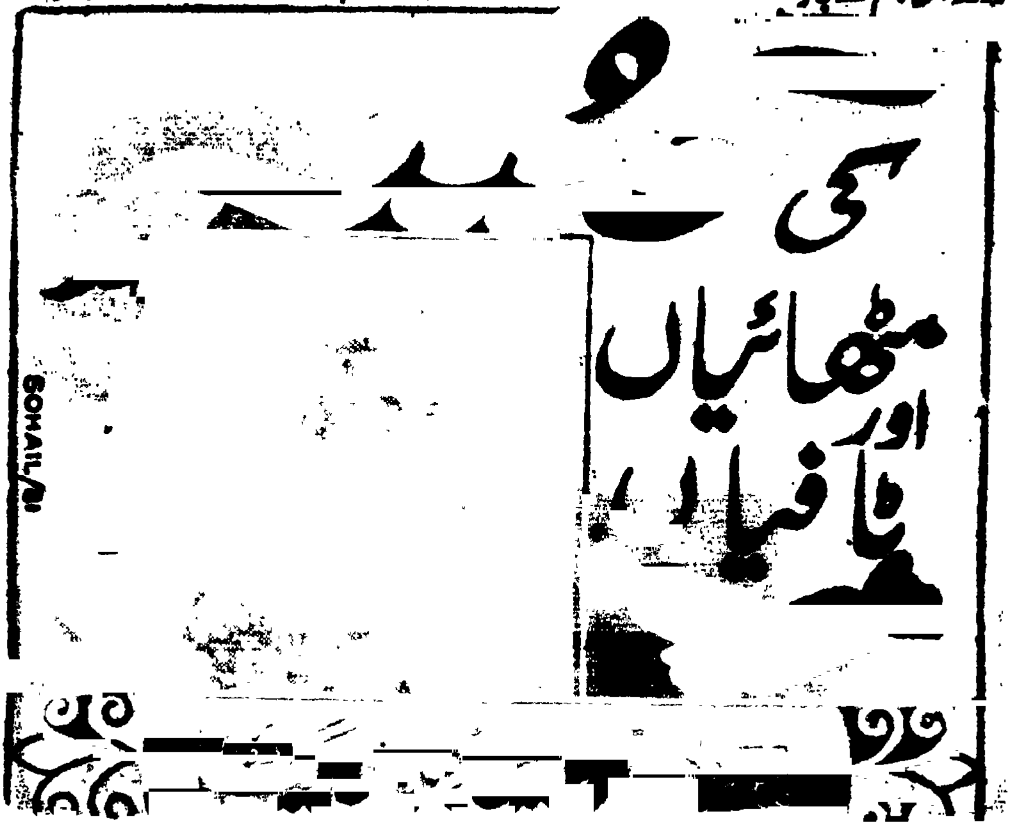
لگی تھی۔ ایک بات اور بھی تھی۔ سر دبواتے وقت ریحانہ بیگم کی عجیب حالت ہو جاتی تھی۔ وہ اسے گھور گھور کر دیکھتی رہتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھی لیتیں۔ کبھی کبھی نائٹی کے اندر سے گوری گوری پنڈلیاں بھی باہر نکال دیتیں۔ اس طرح کہ محمود پنڈلیوں کو دیکھ لے۔ جلد ہی محمود اس خدمت سے پریشان ہو گیا۔ اس لئے ایکدن سیٹھ جی سے اس طرح درخواست کی "آپ مجھ سے بیگم صاحب کے سر دابنے کی خدمت نہ لیجئے۔ مجھے شرم لگتی ہے۔"

سیٹھ جی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا "اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ بیگم صاحبہ تم سے بہت خوش ہیں۔ وہ یہ کام تم ہی سے کرانا چاہتی ہیں۔ فضول باتیں نہ کرو۔ بس کام کئے جاؤ!"

اس لئے مجبوراً ہی یہ کام جاری رکھا۔ تین برس اور گزر گئے۔ اب وہ جوان ہو گیا تھا۔ ریحانہ بیگم کا سر دبانا شروع کرتا تو اس کے جسم میں بجلی کی سی لہر دوڑ جاتی۔ وہ اندر ہی اندر موم بتی کی طرح پگھلنے لگتا۔

کام کی زیادتی محمود کو زندگی سے بیزار کرتی گئی۔ ایک دن اس نے انجم صاحب کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا اور مشورہ بھی چاہا۔ انجم صاحب کچھ سوچنے لگے۔ محمود نے اُن سے کہا "جی چاہتا ہے سیٹھ جی کے یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

انجم صاحب کہنے لگے "بھاگنے کا خیال ذہن سے نکال دو محمود۔ رحمانی صاحب تم پر چوری کا الزام دیں گے۔ تم جیل بھیج دیئے جاؤ گے۔ میری سمجھ میں آ



کیب آئی ہے۔ تم کسی دن تنہائی میں بیگم صاحبہ
ہاتھ چوم لینا۔ وہ تمہیں فوراً بنگلے سے باہر کر دینگی۔
ر انھوں نے تم کو مقدمے میں پھانسنے کی کوشش کی
میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم کو بچا لوں گا۔ اپنے بیان ذکر
بھی رکھ لوں گا۔ تمہیں خوب معلوم ہے ضلع کے جج اور مجسٹریٹ
میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ ان سے جو کہدوں گا وہ مان لینگے۔"

وہ بات ختم کرکے خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر
سوچتے بھی رہے۔ پھر کہنے لگے۔ "ایک بات کا دھیان رکھنا،
جب ریحانہ بیگم تم کو بھگائیں تو تم چلاتے ہوئے سڑک
پر آنا۔ لوگوں کو بلا کر یہ بتانا کہ تم نے ہرگز ریحانہ بیگم کا
ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ انھوں نے خود تمہارا ہاتھ پکڑا تھا۔
وہ نیک چلن نہیں ہیں۔ ضرورت سمجھنا تو جھوٹی قسم بھی کھا لینا۔
خدا تمہارا یہ قصور معاف کر دے گا۔ کیونکہ وہ گنہگاروں
کو معاف کرنے والا ہے۔ اور آج کی دنیا میں جھوٹی قسمیں
کھانا تو فیشن بن گیا ہے۔ ہم سب کو نئے زمانے کے ساتھ
چلنا ہے۔ سمجھ گئے نا!"

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور انجم صاحب
کے یہاں سے واپس چلا آیا تھا۔

دو دن محمود نے انجم صاحب کے مشورے پر غور
کیا لیکن کسی اہم فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ کسی وقت مشورے
پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ کسی وقت بد اخلاقی کے
تصور سے لرز جاتا۔ انجم صاحب سے بدگمان بھی ہو جاتا۔
سوچتا، وہ اسے جیل بھجوانا چاہتے ہیں، جبھی غلط مشورہ
دیا ہے۔ کسی وقت اسے وہ منظر بھی یاد آ جاتا جب

ے اسے پکڑنے حمایت پور آئے تھے۔

اس نے انجم صاحب کے مشورے پر عمل کرنے کا
کر لیا۔ اس دن رحمانی صاحب بزنس ٹور پر گئے
تھے۔ گیارہ بجے تھے۔ ڈنر ختم ہو گیا تھا۔ ریحانہ
روم میں چلی گئی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی اپنا
تم کیا اور ریحانہ بیگم کو سلام کرنے انکی خوابگاہ
پہنچا۔ وہ بستر پر دراز ہو چکی تھیں۔ تیز روشنی
کے جسم کا انگ انگ جھلملا رہا تھا۔ گوری گوری
ن نائٹی کے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ لانبے لانبے بال
پر بکھرے پڑے تھے۔ محمود ان کے پائنتی کھڑا ہو گیا۔
انجم صاحب کا مشورہ یاد آ گیا۔ خوف کا احساس
ہن کو پراگندہ کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ ریحانہ
کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان میں
نا تھا اور سوچوں کے گرداب بھی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔
لیا۔ اگلے پل اس نے انجم صاحب کے مشورے پر
ڈالا۔ تھپڑوں اور گھونسوں کے احساس سے اس
دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، ریحانہ
م شور مچانا ہی چاہتی ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ شور
کے بجائے وہ دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔
ش تو نہیں ہو گئے محمود ——— خواب گاہ کا دروازہ
ند کر دو۔“

اس نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
گھنٹے کے بعد وہ خواب سے باہر نکلا۔ انجم صاحب
مشورے پر مسکراتا ہوا۔ اسے اپنے عمل کے ردِ عمل پر حیرت
ہو رہی تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ جب بھی سیٹھ جی بزنس ٹور پر گئے
اس نے ریحانہ بیگم کی خواب گاہ کا دروازہ اندر سے
بند کر لیا۔ ایک سال اسی طرح گزرا۔ ریحانہ بیگم
ایک خوبصورت لڑکے کی ماں بن گئیں۔ جس کا نام عزیز الدین
رکھا گیا۔ عزیز الدین ایک سال کا ہوا تو اس کی سالگرہ
منائی گئی۔ اس سلسلے میں شاندار پارٹی بھی دی گئی۔
جس میں شہر کے سرمایہ دار، معزز عہدہ دار اور عمائدین
شہر نے شرکت کی۔ پارٹی کے دوسرے دن سیٹھ جی نے
محمود کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اور اسے پچاس ہزار روپے
کا چیک دیتے ہوئے کہا تھا۔

”تم نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ ایسی خدمت
بھی سرانجام دی ہے جس کے بارے میں تم کو یہ خوش فہمی
ہے کہ میں تمہاری اس بے نام خدمت سے ناواقف ہوں۔
حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں تمہاری ہر خدمت سے
باخبر ہوں۔ یہ آگاہی مجھے کیسے ملتی رہی؟ اس پر روشنی
ڈالنا بیوقوفی ہوگی۔ بہرحال یہ چیک اپنی عزت اور
شہرت کو بحال رکھنے کے لئے نہیں دے رہا ہوں بلکہ
تمہاری مدد کرنے کے خیال سے دے رہا ہوں۔ تم اس
رقم سے اپنا مکان تعمیر کروانا۔ کوئی دھندہ بھی شروع
کر دینا۔ اور ہاں ——— ایک بات کا دھیان رکھنا،
کبھی مجھ پر یا بیگم پر کیچڑ اچھالنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔
ایسا کر بیٹھے تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔
سمجھ گئے نا!

محمود بغور اُن کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے چیک سیٹھ جی سے لے لیا تھا۔ اور اپنے کوارٹر میں آگیا تھا۔ اور اسی دن اپنے گاؤں حمایت پور چلا آیا تھا۔ گاؤں آئے ہوئے اسے اب تین مہینے گزر گئے تھے۔ اسکا چھوٹا سا مکان بن گیا تھا۔ آج وہ دالان کے لئے ٹین کی چادریں خریدنے شہر گیا تو اسے انجم صاحب مل گئے تھے۔ وہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ انھوں نے محمود کو ہنس ہنس کر بتایا کہ سیٹھ جی پچھلے دو مہینوں سے اپنے دوستوں اور واقف کاروں کو اس چیک کی اسٹیٹ کاپی دکھا رہے ہیں جو انھوں نے تم کو دیا ہے۔ وہ لوگوں کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ چیک تمہاری غریبی دور کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آنے والے الیکشن میں وہ اس چیک کو پروپیگنڈے کی بنیاد بنائیں گے۔ اس سے ثابت کریں گے کہ وہ ہمیشہ غریبوں کے ہمدرد رہے ہیں"۔

محمود مسکرا دیا۔ انجم صاحب نے کہا "اب کے بار میں اس بوڑھے خبیث سے الیکشن نہیں لڑوں گا۔ وہ بڑا چالاک ہے۔ اتنے دور کی کوڑی لاتا ہے کہ دیکھے اچھے چت ہو جاتے ہیں۔ اب وہ حج کو جانے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔ تاکہ الیکشن میں مسلمانوں کے سارے ووٹ سمیٹ لے۔ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ضلع میں ایک مندر تعمیر کرنے کا اعلان کر دیا ہے OO

بقیہ: فلسفے کا کوئی گھر نہیں ہوتا ہے

کو تار تار کر دیا۔ لیکن میں اپنے لہولہان ہاتھ اور تار تار دوپٹے کو اپنی کامیابی سمجھتی رہی اور بڑے فخر سے اپنے لہولہان ہاتھ کو فضا میں اچھالتی ہوئی جھوٹی طاقت کا ثبوت دیتی رہی۔ اتنی سخت محنت سے میری پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی ہیں۔ جنھیں میں اپنے ریشمی دوپٹے سے بڑے احتیاط سے صاف کر لیتی ہوں اور اپنے کام میں محو ہو جاتی ہوں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ ہر تخریب کے پیچھے تعمیر کی جھلک پوشیدہ ہوتی ہے

اور آج بہت خوش ہوں کہ میری محنت رنگ لائی اور فلسفوں کے گھنے کنٹیلے دشت میری محنت سے ریگستان میں تبدیل ہو گئے۔ اور میرا وجود فلسفوں کی قید سے آزاد ہو کر اس ریگستان میں تنہا رہ گیا ہے۔

تو ہوا یوں کہ میری لاش کو میرا وجود واپس تو مل گیا لیکن میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب میرا وجود فلسفوں کے گھنے کنٹیلے دشت سے آزاد ہو کر بھی میری لاش پہلے سے زیادہ کھوکھلا اور بے جان ہو چکا ہے۔

اور میں اپنے کھوکھلے اور بے جان وجود کے ساتھ اسی ریگستان میں تنہا رہ گئے ہوئے دشت کی مانند جہاں تھی وہیں رہ گئی ہوں ..... OO

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر مسعود منظر نے ... آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ سے چھپوا کر دفتر سہیل ... سلطان گنج پٹنہ ۶ سے شائع کیا

فلسفے کا کوئی گھر تو نہیں ہوتا ہے

تبسم فاطمہ
ملکی محلہ ۔ آرہ ۔ بھوجپور (بہار)

ننّا جانے کب سے وضو کا پانی مانگ رہی ہیں۔ لیکن میں کیسے بتاؤں کیسے سمجھاؤں کہ میرے کھوکھلے اور بیجان ہاتھ تمہیں وضو کا پانی نہیں دے سکتے ننّا۔ کیوں کہ جب سے میرا وجود فلسفوں کے گھنے کٹیلے دشت میں گم ہوا ہے۔ میں بالکل کھوکھلی اور بے جان ہو گئی ہوں۔ ایک لاش کی مانند۔ لیکن میں جانتی ہوں اب زیادہ دیر ہوگی تو ننّا ناراض ہو جائیں گی۔ نئی نسل پر لعنت بھیجتی ہوئی اپنے زمانے کا قصہ لے بیٹھیں گی۔ میں بڑی مشکل سے اپنی کھوکھلی لاش کو سنبھالتے ہوئے وضو کا پانی لئے ہوئے ان کے پاس چلی آئی ہوں۔

ننّا وارفتہ جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی دعاؤں کی بارش کرنے لگی ہیں۔ "جیتی رہو، خوش رہو بیٹیا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔"

میں نے اپنی بے جان نگاہوں سے ننّا کی جانب دیکھا۔ خواہش ہوئی خوب قہقہہ لگاؤں، بلند و باوقار

لیکن میرے قہقہے بلند ہونے سے پہلے ہی میری کھوکھلی اور بے جان آواز کی نذر ہو گئے۔ جب جب اپنے کو کھوکھلا اور بے جان محسوس کیا ہے۔ تب تب زندہ رہنے کی تمنا اور بھی زور پکڑتی جاتی ہے۔ اور اس تمنا کے بیدار ہوتے ہی میں نے چاہا ہے کہ اپنی لاش کو ایک حصار میں قید کر لوں۔ لیکن میری سوچوں نے مجھے سمجھایا کہ اس طرح تو تیری لاش اور بھی وزنی اور ناقابلِ برداشت ہو جائیگی۔ اور ہمیشہ کے لئے اس حصار میں قید ہو جائیگی۔ اور تب میں ایکبارگی چیخ پڑی۔ "نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اب میں کسی حصار میں قید ہونا نہیں چاہتی، لفظوں کی کٹیلی جھاڑیوں سے اپنے جذبوں کو لہولہان کرنا نہیں چاہتی۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اب مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ نہ شام کی پیاری پیاری باتیں، نہ فائل میں پڑے ہوئے زندگی بخشنے والے شام کے خطوط، نہ دو سالہ سونو کی پیاری پیاری حرکتیں، نہ امّی کی شفقتیں۔۔۔۔ کچھ

"کیا بات ہے بیٹا! کیسی پریشانی آ پڑی ہے کہ کھانا
سے التجا کی جا رہی ہے۔ چلو کھانا کھا لو" میرے جملے کو
اچکتی ہوئی امی میرے قریب چلی آئی ہیں.....

"خواہش نہیں ہے امی!" میں اپنی ڈوبتی آواز
میں صرف اتنا کہہ سکی۔

اس سے پہلے کہ امی پھر کچھ بولیں تسبیح پر وظیفہ پڑھتی
ہوئی نانا کی تقریر شروع ہو گئی۔ "بیٹا پڑھنے والے
بچوں کو رات میں بغیر کھائے نہیں سونا چاہیئے، دماغ کمزور
ہو جاتا ہے بیٹا...."

میں جانتی ہوں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب بھی میں
نے کھانے سے انکار کیا ہے بدلے میں نانا کی لمبی چوڑی
تقریریں سننی پڑی ہیں۔ ان تقریروں میں الجھنے سے بہتر
ہے یا کہ کھانا کھا لوں!..... نانا کی تقریر جیسے ہی
شروع ہوئی میں فوراً اٹھ گئی۔ بڑی بے دلی سے صرف
سوپ پیالہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ کمرے کی جان لیوا
تنہائی میں جانے کتنی یادیں سمٹ آئی ہیں۔ یادیں جو
میرا مقدر بن گئی ہیں۔ میری کھوکھلی لاش کی توانائی بن
گئی ہیں۔ جب جب یادیں مجھ پر حاوی ہوتی ہیں میں
نے خود کو پریشان محسوس کیا ہے ——— اور میری ایک
عجیب عادت ہے کہ جب بھی پریشان ہوتی ہوں اپنے
سارے ناخن دانتوں سے کتر ڈالتی ہوں، یہاں تک کہ
ناخن کے ارد گرد کے سارے گوشت ادھڑ جاتے ہیں۔
کبھی کبھی میری انگلیاں بھی لہولہان ہو جاتی ہیں....
پتہ نہیں ایسا کرتے ہوئے میں کہاں کھو جاتی ہوں۔ اور
ان بے معنی عادتوں میں میں سب کچھ بھول کر اپنی تسکین کا
سامان کر لیتی ہوں۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی تنہائی میں یادوں کے آکٹوپس
نے میرے کھوکھلے ذہن کو جکڑ لیا ہے۔ اور میری انگلیاں
میری پریشانیوں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ ذہن کو جھٹک کر بڑی
مشکل سے اپنی لہولہان انگلیوں کو پریشانیوں کی قید سے
آزاد کرتی ہوئی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ اسی لمحے
ایک خیال ذہن میں کوندا۔ اور اس خیال کے کوندتے ہی میں
سب سے پہلے کچن میں آئی سبزی کی ٹوکری سے چھری اٹھا کر
دھیرے دھیرے دبے پاؤں دروازے کے قریب چلی آئی۔
ایک نظر سارے کمروں پر ڈالی۔ سارے کمروں کی لائٹ آف
تھی۔ شاید سب سو گئے ہیں۔ اور پھر میں آہستہ سے دروازہ
کھول کر ایک پختہ عزم کے ساتھ اپنی کھوکھلی لاش کو کسی طرح
سنبھال کر ایک انجانی منزل کی طرف چل پڑی ہوں۔
بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر اپنی گھنے کٹیلے دشت کے
قریب لانے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔ اور پھر اس کے
قریب پہنچتے ہی پوری تندہی کے ساتھ اپنے خیال کو
عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئی ہوں۔

اپنے ساتھ لائی ہوئی چھری سے میں نے فلسفیوں
کے گھنے کٹیلے دشت کو کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے اس
خیال سے آسودگی مل رہی تھی کہ میں اپنے وجود کو اب فلسفیوں
کی قید سے آزاد کر رہی ہوں۔

اس دشت میں اُگے ہوئے فلسفیوں کے کٹیلے پودے
نے میرے تمام ہاتھ لہولہان کر دیئے۔ میرے ریشمی دوپٹے

(جاری ہے)

توفیق الحکیم
ترجمہ: ارشد مسعود ہاشمی

ایک ریگستانی گلی

[ایک ریگستانی گلی۔ صرف ایک مکان جس کے دروازے پر ایک لیمپ جل رہا ہے۔ ہوا کی لہروں پر موسیقی کی آواز دور سے آتی سنائی پڑتی ہے۔ اماوس کی رات ہے۔ مکان کے عقب سے ایک جادوگر غلام لڑکی کے ساتھ آتا ہے۔ وہ اس سے سوال کر رہا ہے۔]

جادوگر: وہ پردیسی نیگرو غلام، وہ تم سے کیا کہہ رہا تھا۔

غلام لڑکی: وہ شہر میں جشن منائے جانے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ اور میں نے اس کو کہا کہ ہماری دوشیزائیں یہ جشن ملکہ شہرزاد کے اعزاز میں منا رہی ہیں۔

جادوگر: تب تمہارا جسم کیوں کانپ رہا ہے؟

غلام لڑکی: (سرسراتی آواز میں) میں نہیں جانتی!

جادوگر: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر خبردار کر رہا ہوں۔ اس بوڑھے غلام سے دور رہا کرو۔ میں اس کی آنکھوں میں عیاشی کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔

غلام لڑکی: (سرگوشیوں میں) وہ بوڑھا نہیں ہے۔

جادوگر: تم ایسے بڑبڑا رہی ہو جیسے تمہارے اوپر خبیث روح کا سایہ ہو۔ مجھے اپنا ہاتھ دو اور اندر آؤ۔ شاید اس کی بدصورتی اور ہیبت ناکی نے تمہیں ڈرا دیا ہے۔

غلام لڑکی: (ہچکچاتے ہوئے) وہ بدصورت نہیں ہے۔

وہ گھر کے اندر جاتے ہیں۔ نیگرو، لڑکی [کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا ظاہر ہوتا ہے]

نیگرو: وہ دوشیزاؤں میں حسین ترین۔ اسکا جسم ایک مرد کی پناہ گاہ کی مانند ہے۔

ایک آواز: (ٹھیک اس کے عقب سے): یا ایک ابلیس کی یا میری تلوار کی۔

نیگرو: (پیچھے گھومتے ہوئے) یہ تم ہو، تم ہی ہو!

جلّاد: تم نے مجھے بڑی آسانی سے پڑھ لیا۔

نیگرو: تم نے اپنی تلوار کہاں چھوڑ دی؟

جلّاد: میں نے سیبوں کے بدلے اسے بیچ دیا۔

نیگرو: اب میں سمجھا کل شراب خانے میں تم اتنے شاہ خرچ کیوں تھے؟ خوشبودار حشیش کی مہک اب بھی باقی ہے جو واضح کرتی ہے کہ کل کس فیاضی سے تم نے مجھ پر خرچ کیا۔

جلّاد: اپنے پردیسی مہمانوں کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا جانا چاہیے، ہم اسے کرنا پسند کرتے ہیں۔

نیگرو: اور اب تم محل میں اپنی ملازمت کے لئے کیا کر رہے ہو؟

جلاد: میں نے اپنی نوکری کھو دی۔ بادشاہ کو اب تیغ زن کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

نیگرو: آہ!... میں سمجھا۔

جلّاد: تم کیا سمجھے؟

نیگرو: کیا آج دوشیزائیں ضیافت کا انتظام نہیں کر رہی ہیں؟

[illegible]د: ہاں ایسا ہے۔ بادشاہ کو اب تیغ زن کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

[illegible]نگرو: (توصیفی انداز میں) اور شہزادہ کا جسم ایسا پیا[illegible] ہے۔

شہزادہ کو پیار کرتا ہے لیکن دوشیزاؤں کو مارنا اس وجہ سے نہیں چھوڑا۔

نیگرو: (اچانک کچھ سنتے ہوئے) نغمہ سنو! کتنا پیارا اور انوکھا۔ کس کا مکان ہے یہ؟

جلّاد: (سرگوشیوں میں) جادوگر کا۔ بادشاہ خفیہ طور پر اس سے ملنے آتا ہے۔

نیگرو: جادوگر! کیا وہ اس غلام لڑکی کا باپ ہے؟

جلاد: وہ ایسا ہی کہتے ہیں۔

نیگرو: ایک گانے والی چڑیا، تمہارے قبضہ سے باہر۔

جلاد: (جانے کے لئے گھومتے ہوئے) میں کچھ بھول گیا ہوں۔

نیگرو: مت جاؤ! میں سوچتا ہوں تمہارے جانے کا کوئی سبب نہیں۔

جلّاد: میں سوچتا ہوں۔ میرا وجدان مجھے کسی سرخ سمت کی اطلاع دیتا ہے۔

نیگرو: نہیں اگر تم غور کرو تو سیاہی پاؤ گے۔ تمہارا وجدان بے رنگ ہے۔

[اسی لمحے مکان کی کھڑکی سے ایک پُراسرار سی کراہنے کی آواز آتی ہے]

جلّاد: کیا تم نے اسے سنا؟

نیگرو: کیا؟

جلّاد: ایک اُلّو کی چیخ جیسی آواز۔

نیگرو: اُلّو! ... میں نے اُلّو نہیں دیکھا۔ ماحول کو بدشگونیوں سے پُر مت کرو۔ تم بیروزگار شمشیرباز!

...مشغول ہو گیا

...د: (دور ہوتے ہوئے) بہتر! خداوندا بہرے کی
مدد کرنا۔

...س و: چند لمحوں کے لئے رکو۔ حسین شہزادے کے
متعلق بتائے بغیر مت جاؤ۔

...بلّاد: تم اس کے متعلق اور کیا جاننا چاہتے ہو؟
میں نے سب کچھ تمہیں کل کہہ دیا۔ کوئی بھی
سمجھ سکتا ہے کہ ہزاروں میل دور سے یہاں
آنے کا تمہارا سبب یہی ہے، اور کچھ نہیں۔

...یگ و: (دور اشارہ کرتے ہوئے، جوشیلے
انداز میں چلّاتا ہے) وہاں! اس درخشاں
اور تابناک خطّے کو دیکھو۔ ایک دھماکے کی طرح
جیسے روشنی کا ایک فوارہ۔

...د: وہ بادشاہ کی قیام گاہ ہے۔

...و: اور ملکہ کی بھی!

...بلّاد: نہیں ملکہ کی رہائش گاہ محل کی دوسری
جانب ہے۔

...یگ و: اوہ کیا بادشاہ کو اب اس کی ضرورت
نہیں کہ ملکہ سورج طلوع ہوتا دیکھنے تک اسے
کہانی سنائے؟

...د: (سرسراتی آواز میں) بادشاہ پاگل ہوا جاتا
ہے۔

...یگ و: لیکن یہ اس کی محبت کا پاگل پن ہے۔

...بلّاد: نہیں! ایک حقیقی پاگل پن۔

...یگ و: سخت غمزدہ ہے، تاریکی میں بھٹکنے کی

سزا پانے والا۔

[پراسرار کراہنے کی آواز کھڑکی سے
آتی ہے۔ "آہ!"]

ننیگ و: کون ہے یہ؟

(کھڑکی سے آتی ہوئی آواز)

کوئی: جو تمہیں دیکھتا ہے، اور تمہاری
آنکھوں کی جھلملاہٹ دیکھتا ہے۔"

ننیگ و: کوئی جو مجھے جانتا ہے۔

آواز: ہاں! اور جانتا ہے کہ سورج کی روشنی
پانے کی شدید خواہش لئے تم اپنے وقت سے
پہلے یہاں آ گئے۔

ننیگ و: کیا اب تک گھڑیال نے اسے دیکھنے کے لئے،
جو سورج ہے، گھنٹہ نہیں بجایا؟

آواز: اگر تمہیں زندگی کی خواہش ہے، تاریکی میں
کھو جاؤ۔ اور صبح کی سپیدی میں بھی باہر آنے
کی کوشش مت کرو۔

ننیگ و: ایسا کیوں ہے میری دوشیزہ!

آواز: انسان کو ایک بچے کی طرح ہونا چاہیئے،
جس نے کالے آدمی کو دیکھ کر اسے الگ ہٹانا
نہ سیکھا ہو۔

ننیگ و: کیا میری زندگی خطروں میں گھری ہوئی ہے؟

آواز: جاؤ، اس سے قبل کہ بادشاہ کی نگاہ
تم پر پڑے۔ بادشاہ اب بھی یاد کرتا ہے کہ
ایک دن اس نے اپنی بیوی کو ایک نیگرو غلام

کی باہنوں میں دیکھا تھا۔ خود کو چھپاؤ غلام! روپوش ہو جاؤ ۔۔۔۔ تاریکی میں واپس ہو جاؤ۔

نینگ و: میری بات سنو!

آواز: جلدی کرو۔

نینگ و: میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

آواز: کیا تم اسی وجہ سے آئے ہو؟

نینگ و: ہاں! جہاں میں جان کر رہوں گا' وہ کیا ہے؟

آواز: وہ سب کچھ ہے اور اسکے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔

نینگ و: اور تم! تم بھی نہیں جانتی۔

آواز: میں نہیں جانتی۔ وہ مجھ سے اس کے متعلق سوال کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے جواب دینے کی التجا کرتے ہیں۔ لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ میرا سر کاٹ سکتے ہیں' اور اس سے اگر پوچھیں' شاید یہ انھیں بتا دے۔ اب جاؤ۔

نینگ و: ایک بات اور۔

آواز: جاؤ! میں کہتی ہوں جاؤ۔

نینگ و: کیا تم اس گھر میں اکیلی ہو؟

آواز: میرے سوا ایک آدمی ہے جو چالیس دنوں سے تم سم کی چربی میں ڈوبا ہوا ہے۔ جادوگر اسے صرف انجیر اور اخروٹ کھلاتا ہے۔ اس کے جسم کا تمام گوشت گھل چکا ہے۔ اور صرف نسیں اور اس کا سر سے تعلق باقی ہیں۔ آج رات جادوگر اسے باہر نکال کر ہوا میں سوکھنے کے لئے کھڑا کریگا۔

نینگ و: اس نے ایسا کیوں کیا؟

آواز: تاکہ وہ ہر بات کا جواب دے سکے' جو اس سے پوچھی جائے۔

نینگ و: اور اس سے سوال کون کرے گا؟

آواز: بادشاہ!

نینگ و: اور بادشاہ کیا جاننا چاہتا ہے؟

آواز: چلے جاؤ غلام! اس جگہ سے دور ہٹ جاؤ۔ وہ لیمپ بجھانے آرہے ہیں۔

نینگ و: لیکن تمہارا باپ اسے بجھا چکا ہے۔

[پھر دوشیزہ کے کراہنے کی آواز آتی ہے۔]

نینگ و: تم پاگلوں جیسی عجیب سی آواز کیوں پیدا کر رہی ہو؟

آواز: اگر تاریکی میں ایک سبز بادل تم پر سے گذرے' پاگل زاہدہ کو یاد کر لینا۔

○○

بقیہ: عیسیٰ فرتاب

شبِ جدائی ہے وحشت افزا گھٹا دے اپنے کرم سے اسکو
شبِ وصالِ حبیب یارب جتنا چاہے دراز کر دے
کرم ہے تیرا جو سب سے بڑھکر کیوں نہ انکو دعاؤں میں
خلافِ دستورِ فن و اعظ گناہ کو بھی نماز کر دے

یہ انکی شاعری کے ناقص نمونے ہیں انشاء اللہ آئندہ کسی دوسری صحبت میں انکی شاعری پر تبصرہ کرونگا ۔۔۔

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ انھیں مطبوعات پر کیا جاتا ہے جن کی دو جلدیں دفتر سہیل کو برائے تبصرہ موصول ہوتی ہیں۔ (مدیر)

نام کتاب : **فصیل**

مصنف : تسکین زیدی

صنف : افسانے ، ضخامت : ۱۵۲ صفحات

قیمت : ۲۵ روپے

پتہ : بزم خضر راہ، گوال ٹولی۔ کان پور

تبصرہ نگار : علیم اللہ حالی

تسکین زیدی کے یہ افسانے اظہار کی تازگی، کہانی پن، عصری موضوعات، استعجاب، اور غیر متوقع نتائج نیز دلچسپی کے متواتر عناصر کی وجہ سے غیر معمولی کشش کے حامل ہیں۔ یہ آج کے لکھے ہوئے افسانے ہیں مگر ان میں وہ موضوعاتی فقدان نہیں جو اکثر و بیشتر دوسرے فن پاروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اسلوب کی وہ پیچیدگی اور تصنع نہیں جسے بہت سے نئے افسانہ نگار تخلیقی زبان بتا کر دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ تسکین زیدی کو افسانہ نگاری کے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ وہ زندگی کے عام تجربات میں ایک ایسا خفیف سا موڑ پیدا کر دیتے ہیں جس سے کہانی جنم لے لیتی ہے۔ تسکین زیدی کا باشعور ذہن متعین موضوعات کی بنیاد پر افسانے تعمیر کرتا ہے۔ وہ دھند میں باتیں کہنے کے قائل نہیں۔ ان کے یہاں واقعات، کردار، مکالمات، اور افسانہ کی پوری فضا واضح اور روشن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے، افسانے ہونے کے باوجود حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ تسکین زیدی قصے تو سناتے ہیں ہماری سماجی، مادی اور خارجی زندگی کے، لیکن وہ انسان کی داخلی کیفیات سے غافل نہیں رہتے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کا ذہن اور اس کا ضمیر ہی اس کی شخصیت کی بہترین علامت ہیں۔ چنانچہ ضمیر کی یہ آواز اور ذہنی کیفیت کی متنوع پیچیدگی تسکین زیدی کے خاص موضوع ہیں۔ وہ ان پیچیدگیوں میں سے ایک راہ نکال لیتے ہیں جو غیر محسوس طور پر ہمیں زندگی کی صالح، صحت مند اور غیر فرسودہ منزلوں کی طرف لے جاتی ہے۔

تسکین زیدی کا اسلوب منفرد بھی ہے اور دلکش بھی۔ ان کے یہاں ذہنی کشاکش اور شدید تناؤ سے دوچار کردار صورت حال کی معمولیت سے تیزی سے ایک نئی فضا میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لینے لگتے

ہیں۔ وہ انسانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس کی وکالت نہیں کرتے بلکہ کہانی کے تانے بانے میں انسانی اور اخلاقی اقدار کے دھاگے ملا کر تعمیر ماجرا کرتے ہیں۔

عورت تسکین زیدی کے یہاں ایک مجبور و کمزور مخلوق نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرتی ہے۔ وہ اگر آزاد ہے تو اپنی آزادی کا صحیح مفہوم بھی جانتی ہے۔ اگر کوئی شاہد، اختر اور عزیز کی مختلف شخصیتوں میں مبتلا ہو کر تا دیر کشمکش میں پڑی رہتی ہے تو پھر ایک ایسی منزل بھی آجاتی ہے جہاں سماجی رشتہ کے حصار میں وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہے۔ (افسانہ حصار) کوئی اوشا ہے جو دوسروں کی ریاکاری سے تنگ آکر تنہائی پسند ہو جاتی ہے مگر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ "جن سہاروں کی آڑ میں زندگی گزارنا چاہتی تھی وہ سہارے اجنبی اجنبی سے لگنے لگے تھے۔" اور یہ کہ "ایک مرد کی کھردری اور سخت محبت ہی میرے زخموں کا پھاہا بن سکتی ہے۔" (افسانہ جذبوں کی آنچ) ایک روحی ہے جو بہت دیر تک جاوید اور یزدانی کے چہروں پر محبت کے نقوش ڈھونڈتی رہتی ہے اور جب اسے یہ علم ہوتا ہے کہ یزدانی نے ہی جاوید کو کھڈ میں ڈھکیل دیا تھا تو وہ سوئے ہوئے یزدانی کے کمرہ میں آگ لگا دیتی ہے اور خود بھی اس کے ساتھ جل مرتی ہے۔

(افسانہ شعلوں کا حصار) غرض تسکین زیدی کا بالیدہ شعور احساسات و جذبات کی کشاکش اور انتشار میں اپنے کردار کے توسط سے قاری کے لئے اطمینان کی ایک راہ نکال لیتا ہے۔

فصیل کی کہانیاں جدیدیت کی آندھی کے بعد ایک کامیاب، دلکش اور مؤثر فضا کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اور ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ اب بھی اردو کی صنف افسانہ میں VITALITY موجود ہے اور ہمارے خارج و باطن کے بہت سے احوال ہیں جنھیں ہم کہانی کا روپ دے سکتے ہیں، اگر ڈاکٹر مظفر حنفی سے پیش لفظ اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی و عابد سہیل سے فلیپ کی عبارتیں نہیں بھی لکھوائی جاتیں تو بھی قاری فصیل کی کہانیاں پسند کرتا —— اور سچ تو یہ ہے کہ قاری سب سے بڑا جج ہے۔

نام کتاب شمارِ نفس

صفحات ۹۶ قیمت: دس روپے

پتہ: تمثیل پبلی کیشن۔ گول گھر۔ جہریا (بہار)

مبصر: فرحت قادری

"شمارِ نفس" نجم عثمانی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو بہار اردو اکاڈمی کے جزوی مالی تعاون سے ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ میرے پاس یہ کتاب بڑی تاخیر سے پہنچی اس لئے تبصرہ بھی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ نجم صاحب کو میں بہت

سر پہ اُٹھائے بارِ غمِ زیست عمر بھر
چلنا پڑا دہکتی ہوئی آگ پر سبھی

چھایا ہوا ہے ذہن پہ آسیب خوف کا
لگتا ہے نجم اپنے ہی سائے سے ڈر مجھے

مقید مجھکو رہنا ہے اِس گرتے ہوئے گھر میں
ہر اک پل دب کے مرجانے کا ڈر قسمت میں لکھا ہے

اِک آگ سی لگ جاتی ہے سوتے ہی بدن میں
شعلہ سا ویک اُٹھتا ہے بستر کئی دن سے

وہ شخص کا اب تک میں گلا گھونٹ نہ پایا
جو چیخ رہا ہے مرے اندر کئی دن سے

بچھڑ کے خود سے میں گم ہو گیا ہوں جانے کہاں
مرا وجود برابر مری تلاش میں ہے

ب سے جانتا ہوں۔ ان کی شاعری کم و بیش ایک
ھائی صدی پہ محیط ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ مجموعۂ کلام
دینے کے بعد کیوں منظرِ عام پہ آیا' اسے کم از کم دس سال
قبل شائع ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی وجہ بھی شاید وہی
ہ جو اُردو کے عام شاعروں کا مقدر بنی ہوئی ہے۔
معاشی پسماندگی ـــــــ نجم عثمانی بڑے حساس
عر ہیں۔ کم عمری میں سایۂ پدری سے محروم ہو جانے کی
نا پر فکرِ معاش نے انھیں درماندہ و پراگندہ کر دیا
ی شاعری در اصل آپ بیتی ہے جس میں ان کے
نے تجربات' مشاہدات اور سچے جذبات ہیں جو حسنِ شعو
ے ہی شعروں میں ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے
کی غزلوں میں بڑا تسلسل اور اشعار میں تاثر ہے

شاخ سے لپٹا ہوا اِک زرد سا پتّہ ہوں میں
اور ہواؤں کی بغاوت ہے مِرے چاروں طرف

پنچھی جو آسمان میں اُڑتا تھا رات دن
نرغے میں فاصلوں کے وہ دفتر میں قید ہے

یہ آواز نجم عثمانی کی ہے جو حالات کے شکنجے میں بُری طرح قید ہے اور نہایت ایمانداری سے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے معاشرے کے تمام ناسوروں کو اُجاگر کر رہا ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کے لئے ضروری ہے کہ ہر لفظ کو مکمل حسّی اور تجرباتی پسِ منظر کے ساتھ لکھا جائے اور فن کارانہ صلاحیتوں کے ساتھ مشاہدے کی گہرائی اور شدّتِ احساس

کی تہہ داری کو شعر کے قالب میں ڈھالا جائے۔ لیکن نجم عثمانی کو "مستقبل کا نوحہ گر" کہنا اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ نوحہ گر نہیں اپنے عہد کا عکاس ہے۔ اور مستقبل سے نا اُمید بھی نہیں ہے۔ اس بات کی تائید میں اُن کے اشعار دیکھئے ۔

لمحے دو لمحے کا ہے یہاں اندھیرا !
توڑ رہا ہوں چاند ستارے اِک پل ٹھہرو

مدّت سے اس زمیں پہ اندھیرے کا راج ہے
اب آسماں پہ کوئی سورج اُچھال دو !

پھونک دے جو شعور کی دُنیا
ذہن میں ایسی آگ بھڑکاؤ

اِک نہ اِک روز حقیقت میں بدل جائیگا

خواب سینے میں جو پلتا ہے کئی برسوں سے
جاگے گا کسی روز تو ، افکار کا جادو
دیکھے گا زمانہ مرے اشعار کا جادو

اشعار کا یہ جادوگر دراصل غزلوں کا شاعر ہے ___ ویسے اس شعری مجموعہ میں دس آزاد نظمیں بھی ہیں جو زیادہ تر بیانیہ اور سپاٹ ہیں ہیں۔ صرف "اندھیرے کا قیدی" اور "سبھی منتظر ہیں" ایسی نظمیں ہیں جن میں امیجری اور علامتی اسلوب کا اظہار ہے۔ نجم عثمانی سنجیدہ ماحول کا پروردہ ایک ایسا شاعر ہے جو فنی ارتقا اور فکری صلاحیتوں کے ساتھ نئے لہجے میں نئی بات کہنے کی کاوش کرتا ہے۔ نیز لفظوں کا مزاج آشنا ہے اور ان کے موزوں استعمال پر قادر بھی ہے۔ ویسے شاعر کا یہ مجموعہ کلام ہم جیسے ناپختہ کاروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ "تمازت فن" کا سرورق خوبصورت اور معنی خیز ہے کتابت و طباعت صاف ستھری ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

نام کتاب: گمشدہ موسم

شاعر: شمیم قاسمی مبصر: فریاد آکمل (کشمیر)
صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۲۵ روپے
رابطہ: علی ہاؤس۔ نو گنج۔ سہسرام (بہار)

شمیم قاسمی گمشدہ موسم کا شاعر ہے۔
شمیم قاسمی نئے موسم کا شاعر ہے۔
شمیم قاسمی نئے رنگ و بو کا شاعر ہے۔
شمیم قاسمی ایک منفرد غزل گو ہیں لیکن وہ شاعر محض نہیں۔ اگر محض شاعر ہوتا تو یہ شعر کیسے کہتا؎

مرے اندر ہنگاموں اور لہو کا شور رہتا ہے
کبھی یہ دل دھڑکتا ہے کسی کے آنے جانے سے

گمشدہ موسم میرے سامنے ہے اور میں دیر سے بیٹھا یہی سوچ رہا ہوں کہ قاسمی نے خود گمشدہ موسم کا شاعر کیوں کہا۔ کہیں وہ فیشن کا شکار تو نہیں۔ یہ زمانہ فیشن کا ہے ہی اور فیشن ہمارے اندر کتنی دور تک سیندھ مارے بیٹھا ہے، کس کو خبر؟ تب ایک صفحہ پر اس کا یہ شعر اپنی پوری انفرادیت صاف گوئی [illegible] نظر آتا ہے؎

کبھی تو اتنا مخالف کہ سانس لے نہ سکوں
کبھی تو میری غزل میرا ہمنوا موسم

شمیم قاسمی کو یہی بڑی خبر لگی ہے کہ وہ سچ بولنے بیٹھ جاتا ہے اور آج کے دور میں سچ بولنا......! لیکن آج ہی کے دور پر کیا منحصر، سچ بولنا تو کبھی آسان نہ تھا کچھ سخت جان ہی اس کا حوصلہ رکھتے ہیں؎

[illegible]

ہیں نہیں۔ کہ ایسے لوگ اپنی گمشدہ صلاحیتوں کا دائرہ

اور یک رنگ جداگانہ رکھتے ہیں ؎

میرؔ اور غالبؔ سے اِک ذرا الگ ہوں میں
ساقیا غزل میری اور شراب ہے موسم

شمیم قاسمی گمشدہ موسم کا شاعر ہے اور یہ گم شدہ موسم مختلف اشکال میں شاعری کا سبب بنا ہے۔ قاسمی کی شاعری میں فکر کے کئی دریچے کھلتے ہیں جن کے راستے تازہ ہواؤں کے جھونکے زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو لئے نتھنوں سے ٹکراتی ہیں ؎

وہ گم شدہ سا جو موسم نفس نفس میں تھا
تمام عمر میں عرفانِ دسترس میں تھا

جب تک بھی نبھاتے رہے رسم زندگی
پھر یوں ہوا کہ تمہارے اصولوں کے پر چلے

تمہارے چہرے پہ لکھا ہے دلربا موسم
ہے زندگی کا مری ایک حادثہ موسم

چہرے پہ اُس کے ہونٹ نہیں پھول ہی تو ہے
اس کا بدن نہیں تھا، ندی کی ڈھلان تھی

شمیم قاسمی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُسے بھیڑ میں ڈھونڈ نکالنا بہت آسان ہے، اس کے لئے بہت دُور تک چھان بین کی ضرورت نہیں اور شاید ایسا صرف اس لئے ہے کہ قاسمی کی شاعری زندگی سے عبارت ہے اور اس کی زندگی کے تلخ و شیریں شب و روز بکھرے پڑے ہیں گم شدہ موسم کے اوراق میں ایک جگہ وہ یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے ؎

مجھے قریب سے دیکھو، مجھے پڑھو، سمجھو،

نئے سفر، نئے موسم کا قافلہ ہوں میں

اس شعر کا پس منظر پروفیسر احتشام حسین کے اس قول پر پورا اترتا ہوا نظر آتا ہے کہ تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے کیونکہ عملِ تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ رہے ہیں۔

قاسمی کی شاعری کسی بیساکھی کے سہارے سے دور اور یاسیت زدگی کے عناصر سے پاک نظر آتی ہے۔ اس کے یہاں کھلے ہوئے آسمان، ہوا، خوشبو، بادل اور موسم کا تصور شدت سے ملتا ہے۔ قاسمی کی شاعری ایسی خوشبو کی شاعری ہے جو زمین سے بارش کے بعد اٹھتی ہے۔

جہاں شمیم قاسمی کو پڑھتے وقت ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک کمی کا بھی احساس کھٹکتا ہے اس کی شاعری میں جنگل، پہاڑ، کہسار، پھول، پتے سب ایک فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ کبھی قریب بھی آتے ہیں تو اتنا نہیں کہ روح کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔

مجھے یقین ہے آنے والے دنوں میں اس کی شاعری اور بھی نکھرے گی۔ اس قول کے مصداق کہ سونا جیوں جیوں بھٹی میں تپتا ہے اور بھی کندن بنتا جاتا ہے۔

قاسمی جینا اگر تجھ کو ہے شہرِ سنگ میں
ہر نئے موسم کو اپنے نام سے موسوم کر

مجھے یقین ہے یہ مجموعہ خاص و عام میں یکساں پسند کیا جائے گا۔

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

محبی جمیل صاحب! آداب

سہیل کا "ادریس سنسہاروی نمبر" ملا۔ ممنون ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ جناب ادریس سنسہاروی کی یاد میں یہ خاص نمبر نکالا۔ ع "نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن"۔ مجھے ان کے گراں قدر کارناموں کا اندازہ اسی نمبر سے ہوا ہے۔ اور اسے پڑھ کر یہ دو لائنیں حافظے میں تازہ ہوگئیں:

"LIVES OF GREAT MEN ALL REMIND US / WE CAN MAKE OUR LIVES SUBLIME"!

اب یاد نہیں آرہا کہ کس کی ہیں!

"ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، معین شاہد، شفیع مشہدی، فیاض حالی اور کمال جعفری کے مضامین بہت پسند آئے۔ سہیل کے اس نمبر میں جتنے مضامین شامل ہیں، اگر ممکن ہو تو انہیں ایک کتاب کی صورت میں شائع کردیجئے۔ کتاب بالعموم رسالے سے زیادہ عمر باقی ہے۔ اس طرح سے جناب ادریس مرحوم کی یاد خاص نمبر کے ذریعے سے بھی باقی رہے گی اور کتاب کی صورت میں بھی ـــــ ویسے سہیل تو ان کی زندۂ جاوید یادگار رہے ہی۔ خدا کرے آپ اور مسعود صاحب کی ادارت میں یہ یادگار مدتوں باقی رہے۔ ـــــ بلکہ ہمیشہ زندہ رہے! والسلام

دعاگو: جگن ناتھ آزاد (جموں)

بھائی جمیل! ہدیۂ خلوص۔ "ایک شمارہ ادریس سنسہاروی کے نام" ملا۔ اس کا انتظار شدت سے ہو رہا تھا۔ میں ان کی زندگی میں ان سے کبھی نہیں مل پایا مگر ان کے متعلق اتنی ساری باتیں جان کر ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ان سے ہزاروں بار ملا ہوں۔ اور برسوں سے جانتا ہوں۔

در اصل آدمی اپنے خیالات اور کام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ جس مسلک کے پیرو تھے اور ان کے مزاج کی پرورش جس انداز سے ہوئی تھی، انہوں نے زندگی بھر جس اقدار کو کلیجے سے لگائے رکھا ـــــ اور آج جو کچھ ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں انہیں سرمایہ سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو ان سے کبھی نہیں ملے وہ بھی انہیں اپنا، اور بہت اپنا سمجھنے پر مجبور ہے۔

ان کی خودداری کی مثال کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ "سہیل" کے "جمیل مظہری نمبر" کو بغیر دیکھے ایک طرف رکھ دینے پر انھوں نے جواباً چائے کی پوری پڑیا ہی پھینک دی تھی۔ (بقول ڈاکٹر احسن مثنیٰ) ـ ایسے خوددار لوگ اب کہاں ملتے ہیں۔ ـــ آپ لوگوں نے ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو ہمارے سامنے لاکر ایک بہت ہی اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ مگر بھائی میرے ـــ کچھ اہلِ قلم نے صرف

فسانہ پڑھ کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ کاش اتنی ہی سنجیدگی سے
ان پر قلم اٹھاتے جتنی سنجیدگی سے مرحوم نے اپنے مسلک
کو تاعمر نبھایا۔ ایک تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔
مضمون نگاروں کے خطوط سے بھی ان کی ہمہ گیر
مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور نمود کے انتخاب سے
ان کے خیالات کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے۔ خدا کرے
سہیل ان کے نقشِ قدم پر چلتا رہے۔ اور نئی نئی راہیں اس
کے قدم کی زینت بنیں۔ مشتاق احمد نوری، بستی پور۔

محترمی! سلام مسنون

تازہ شمارہ (ستمبر، اکتوبر) کو ادریس سنسہاروی کے نام
سے منسوب کر کے مرحوم کی ادبی خدمات کے اعتراف کو محض
رسم کی ادائیگی کہا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی صحافتی خدمات
کے اعتراف کے لئے ایک ضخیم نمبر کی ضرورت تھی۔ اور اس
کے لئے ملک کے مشاہیر قلمکاروں کو دعوت دے کر ادریس
صاحب کی شایانِ شان خدمات کا احاطہ کرنا تھا۔
بہرحال نظر زد شمارہ ادریس سنسہاروی کی ادبی
زندگی کے ہلکے تاثرات کا محاسبہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔
اس لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔
غالباً آپ کی ذات سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ مستقبل
قریب میں ادریس سنسہاروی مرحوم کی مکمل ادبی خدمات کو
سہیل کے خاص نمبر میں پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کریں گے
میری تمام نیک خواہشات آپ کے اور آپکے حوصلہ اور
کے ساتھ ہیں۔ یوسف جمال۔ راجگانگ پور

عزیزم جمیل صاحب! دعائیں

ستمبر، اکتوبر کا "سہیل" موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔
خصوصی شمارہ کی طباعت اور کتابت دیدہ زیب ہے
ابتدائی مضامین کا ابھی سرسری مطالعہ کیا ہے۔ ایسا لگا
کہ آپ کے مرحوم والد صاحب بڑی شخصیت کے مالک
تھے۔ اللہ انکو مغفور فرمائے۔
اس قدر بے باک و نڈر صحافی شہرت یافتہ ادیب
تبصرہ کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہر
خیال میں وہ شخصیت پرکشش ہوتی ہے خوش طبعی، خوش اخلا
اور خوش وضعی کا پیکر ہوتی ہے۔ آپ کے والد صاحب
شخصیت ان ہی رنگوں سے معمور ہے۔ دیتی ہے۔ اس لئے
دل چاہتا ہے کہ شمارے کا مطالعہ روز کرتی رہوں۔ مجھے
ہے کہ یہ خصوصی شمارہ مرحوم کی شہرت و مقبولیت کا باعث
خیر اندیش، (ڈاکٹر) فریدہ کول۔ سر

برادرِ محترم! سلام مسنون

سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ "ایک شمارہ ادریس
سنسہاروی کے نام" اچھی پیشکش ہے۔ اپنے بزرگ
کی یاد کو تازہ رکھتے رہنا خود اپنے کو زندہ رکھنے
مترادف ہے۔ اس شمارہ سے ادریس سنسہاروی
کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آئے۔ ان
اداریئے جن کا انتخاب آپنے پیش کیا ہے وہ انکی ادبی
حیثیت متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔
مخلص، شمس بدایونی۔ بدایوں



Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya-823001
48 years of Publication Phone : 22

جشن جمہوریت

جمہوریت

وفاؤں کا تذکرہ

تعمیر ملک و قوم بھی، تفریق رنگ و نسل
انسانیت کا پاس و لحاظ اور جہل بھی
منظر عجیب طرح کے دیکھے گئے، ادھر
جمہوریت کا جشن کہ اک عہد آرزو
خوابوں کی سرزمیں پہ نقوش وفا کے رنگ
کیسی روایتوں کی ہوئی پائمالی ہے
[illegible]
[illegible]

فروری [illegible]
قیمت ۲/۵۰ روپے


JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE·44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES

ہم
بھارت کے لوگ

اپنی جمہوریہ کے محبوب آدرشوں

جمہوریت
سوشلزم
سیکولرزم
انصاف
آزادی
مساوات
اخوت
ہم آہنگی
اتحاد
سالمیت
امن اور
ترقی

کے علمبردار ہیں

ہم ہمیشہ ان پر قائم رہیں گے

davp 86/445

بانی: حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنبھاروی ● بیادگار: زین العابدین احمر و ادریس سنبھاروی

ماہنامہ سُہَیل

فروری ۱۹۸۴ء

فون نمبر ۲۱۵۷۳

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
ایڈیٹر: جمیل منظر
معاونین: شکیل احمد جمالی
جمیل احمد ابدالی

مجلس مشاورت
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی!
ڈاکٹر محمد رئیس
اصغر علی انجینئر۔ ڈاکٹر برنا حیرمی

جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۲
بدل اشتراک: فی شمارہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: ۳۰ روپے
لائف ممبری: ۵۰۱ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل ریلوے سائیڈ روڈ۔ گیا

نمود

یومِ جمہوریہ

آزاد ہندوستان ایک ۳۰ ویں سال ہم ہندوستانی جمہوریہ کے ۳۰ ویں سال میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی مدت نہیں ہے۔ اس مدت کی کامیابیوں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس مدت میں ترقی کے پرپیچ وادی راستے نے سنگین مسائل بھی کھڑے کئے ہیں جو ہمارے ملک کی ایکتا اور یہاں کی جمہوری ڈھانچے پر سنگین خطرات پیدا کر رہی ہیں۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد ہندوستان کے لوگوں نے جس آئین کو اپنایا اس کو تیار کرنے والوں نے ایک خوش حال ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ آج یہ خوش حال ہندوستان کہاں ہے؟ آزادی کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والی کانگریس پارٹی اور اس کی حکومت نے عوام کے کن طبقوں کو خوش حال بنایا ہے؟ خوش حالی کا ڈھول خود پیٹا جا رہا ہے لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی آبادی کا حصہ ۴۷ فیصد غریبی کی سطح سے نیچے ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ ہریجنوں، آدی باسیوں اور دوسرے غریب طبقوں کا قتل عام ہوتا ہے، انہیں زندہ جلا دیا جاتا ہے، ان کی بستیاں جلا کر خاک کر دی جاتی ہیں، ان کی بہو، بیٹیوں کی عزت سے کھلواڑ کیا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہ آزاد ہندوستان کی پولس بھی زمینداروں اور انکے غنڈوں کی طرف سے انہیں غریبوں کا خون بہاتی ہے؟ ——— آخر خوش کون ہے؟ کسان کہتا ہے کہ نوکری چاکری والا ٹھیک ہے۔ نہ باڑھ نہ سوکھا لیکن یہ کسان کا بھرم ہے۔ سوئی سے سلائی مشین تک انہیں خریدنا پڑتا ہے۔ اور قیمتیں بے لگام ہو گئی ہیں۔ مشاہرہ تو ان کا بڑھا ہے لیکن بڑھتی ہوئی قیمتوں کا رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے لئے بچوں کی اچھی پڑھائی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کوئی خرچیلی بیماری ہو جائے تو مشکل ہی ہے۔ بیٹیوں کی شادی کیسے کریں۔ ملک جہیز کی مصیبت ہے۔

ڈگریاں لے کر مستقبل کی "امید" در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ یہی حال نوکری کرنے والوں کے بیٹوں کا ہے۔ یہی حال کسانوں کے بیٹوں کا ہے۔ اناج اور دوسری پیداواری چیزوں کا دام تو بڑھ گیا ہے لیکن اس کا فائدہ کسانوں کو نہیں بیچولیوں کو ملتا ہے۔ کسانوں کی کڑی محنت سے لہلہاتی فصلیں سوکھ جاتی ہیں لیکن بجلی نہیں ملتی۔ اگر اندر بھگوان کی مہربانیوں سے فصلیں ہو بھی گئی تو بازار کی قیمت گھٹا کر سیٹھ ساہوکار جھپٹ لیتے ہیں۔

ہم آزاد ہندوستان میں آخر کب تک غلام بن کر جیتے رہیں گے؟ آخر کب تک ہمارا استحصال اسی طرح ہوتا رہے گا؟

آج حکومت وقت سے اپنی جمہوریت کی ۳۰ ویں سالگرہ پر ہم سوال کرتے ہیں کہ ان سنگین مسائل سے آخر کب ہمیں نجات ملے گی؟

جمیل منظر سنبھاروی

زیر تصنیف کتاب "روداد اقبال" کا ایک غیر مطبوعہ باب

اقبال انگلستان میں

جگن ناتھ آزاد

گذشتہ باب میں یہ بتا چکا ہوں کہ اقبال ۴ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے۔ ایک رات انہوں نے سر عبدالقادر کے یہاں قیام فرمایا اور دوسرے دن (۵ ستمبر کو)عہ کیمبرج تشریف لے گئے۔

کیمبرج پہنچ کے انھوں نے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا اس وقت ٹرنٹی کالج اپنی زندگی کی پانچ سو بچپن بہاریں دیکھ چکا تھا۔ سرزمین انگلستان کا یہ کالج محض ایک کالج نہیں تھا بلکہ علم و فضل کا ایسا گہوارہ تھا جس کی روایات دنیائے علم کی روایات بن چکی تھیں۔ اسی کالج کے احول میں ان لوگوں نے پرورش پائی جو علم و ادب شاعری، فلسفہ اور سائنس کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ لیکن نیوٹن، بائرن، ٹینی سن اور فٹز جیرلڈ اسی کالج کی سرزمین سے اٹھے اور چار دانگ عالم میں اپنے علم و فن کی روشنی پھیلا گئے۔ آج ٹرنٹی کالج ان ناموں کے ساتھ اقبال کے نام پر بھی فخر کر سکتا ہے کہ ہندوستان سے روانہ ہونے کے بعد اقبال کے ذوقِ علم کی تشنگی کی تسکین کے لئے ٹرنٹی کالج پہلی منزل تھا۔ جہاں تک فارسی ادب کا تعلق ہے گِب، براؤن، آرتھر آربیری، نکلسن یہ سب اسی آسمانِ علم کے ستارے ہیں۔ اس وقت جب اقبال اس کالج میں داخل ہوئے پروفیسر میکٹیگرٹ، پروفیسر وائٹ ہیڈ، پروفیسر سارلے اور پروفیسر جیمز وارڈ کیمبرج ہی میں فلسفہ پڑھاتے تھے۔ گویا اقبال کی خوش نصیبی کا یہ سلسلہ کہ انھیں استاد بھی ایسے ملے جو نابغۂ روزگار تھے یہاں بھی جاری رہا۔ اب ایک نظر اگر ان اساتذہ کے ناموں پر بھی ڈال لی جائے تو اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قدرت شخصیتِ اقبال کی تعمیر و تکمیل کے لئے کیسے کیسے انتظامات کر رہی تھی۔

عہ اوپر ۲۴ دسمبر لکھا ہے اور نیچے ۵ ستمبر، مہینے کی تصحیح جناب جگن ناتھ آزاد ہی فرما سکتے ہیں۔ محققین ان سے رجوع کریں۔ (ادارہ)

ان کے پہلے اُستاد ان کے والد محترم ہی تھے، شیخ نور محمدؒ اور پھر یہ سلسلہ یوں چلتا ہے: مولوی سید میر حسنؒ، نواب مرزا داغ دہلوی، سر ٹامس آرنلڈ، استاذی قبلہ الٰہی بخش عالی آرام، میکٹیگرٹ، وائٹ ہیڈ، جیمز وارڈ، سارلے، فرالین سینے شال، پروفیسر فرادیگے نامٹ، فرالین رین۔ اور کیمبرج کی تعلیم کے دوران میں ای جی براؤن، پروفیسر نکلسن اور آرتھر آربیری بھی تو ہیں تھے۔ اقبال کے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ اور ان کے ساتھ اقبال کی اکثر ملاقات رہتی تھی۔ پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا اور آرتھر آربیری نے "جاوید نامہ" لالۂ طور (پیامِ مشرق) اور زبورِ عجم (حصۂ غزلیات) کا انگریزی میں ترجمہ کرکے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء

جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اقبال نے یورپ کے تین سالہ قیام کے دوران میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے تو اس نابغۂ عصر کی صلاحیتوں پر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ اقبال اگرچہ ہندوستان سے فلسفے میں ایم اے کی ڈگری لے کر گئے تھے کیمبرج لیکن کیمبرج کے ضابطے کے مطابق انھیں وہاں پھر گریجویشن کا امتحان دینا پڑا۔ یہ امتحان انھوں نے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس امتحان کے لئے انھوں نے ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء (THE DEVELOPMENT OF METAP-HYSICS IN PARSIA.) پر ایک تحقیقی مقالہ (DISSERTATION) لکھا جس پر کیمبرج یونیورسٹی نے انھیں سرٹیفکیٹ آف میرٹ دیا۔ اور میونخ یونیورسٹی (جرمنی) نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ انگریزی میں یہ مقالہ لندن کے ایک اشاعتی ادارے LOZAC AND COMPANY نے شائع کیا۔ ہندوستان میں اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد کے ایک عالم میر حسن الدین نے "فلسفۂ عجم" کے نام سے کیا اور یہ حیدرآباد ہی سے چھپا۔ اس مقالے سے متعلق اجس کے بارے میں ہم لوگوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ یہ دراصل پی ایچ۔ ڈی کا تھیسس ہے جو انھوں نے میونخ یونیورسٹی کے لئے لکھا۔ ایک الگ باب زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

بیرسٹر اور عربی کے اُستاد: اسی دوران میں اقبال بیرسٹر ایٹ لا کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ چنانچہ جرمنی سے واپسی پر لنکنز ان سے انھوں نے بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ اور ساتھ ہی معاشیات اور پالیٹکس پڑھنے کے لئے لندن اسکول آف اکنامکس اینڈ پالیٹیکل سائنس میں بھی داخلہ لیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ ۰۸-۱۹۰۷ء میں جب پروفیسر آرنلڈ لندن یونیورسٹی سے چھ ماہ کی رخصت پر گئے تو اقبال ان کی جگہ لندن یونیورسٹی میں عربی پڑھانے پر مامور کئے گئے۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود انھوں نے قیامِ انگلستان کے دوران میں اسلام پر چھ لکچر دیئے۔

ط علامہ اقبال اپنے اُستادوں کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے (اقبال ایک مطالعہ)

ان تمام مصروفیات کے باوجود انھوں نے قیامِ انگلستان کے دوران میں اسلام پر چھے لکچر دیئے۔ پروفیسر آرنلڈ اور میکٹیگرٹ تو اقبال کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہی تھے پروفیسر براؤن نے جن سے اقبال نے خاصا فیض حاصل کیا تھا ایک دفعہ کہا تھا: "فلسفے میں اقبال سے زیادہ دقتِ نظر رکھنے والا طالب علم میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔" جہاں تک پروفیسر نکلسن کا تعلق ہے انھوں نے تو اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ایک استاد کی طرف سے ایک شاگرد کو اس سے بڑھ کر کیا خراجِ تحسین ادا ہو سکتا ہے؟

اقبال کی بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

> بیرسٹری کے امتحانوں کے لئے بھی کسی نہ کسی اِن (INN) میں ٹرمیں پوری کرنے کی خاطر داخلے کی ضرورت تھی۔ لندن میں مستقل رہائش اختیار کرنا یا قانون کے لکچروں میں حاضر ہونا ضروری نہ تھا۔ قواعد کے مطابق کسی اِن سے منسلک ہو کر اس کے عشائیوں کی مخصوص تعداد پوری کرنے سے ٹرموں کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ پہلے حصے کے چھے پرچوں کا امتحان علیحدہ علیحدہ دیا جا سکتا تھا البتہ دوسرے حصے کے چھے پرچوں کا امتحان اکٹھا دینا ضروری تھا۔ سال میں تین یا چار بار یہ امتحانات انز آف کورٹ میں دیئے جاتے تھے۔ اقبال نے ۶ نومبر ۱۹۰۵ء کو لنکنز اِن میں داخلہ لیا اور کیمبرج سے لندن جا کر ٹرمیں پوری کرنا شروع کردیں۔" ؎۱

> "بہر حال یہ بتانا ممکن نہیں کہ اقبال نے بیرسٹری کے پہلے حصے کے سارے پرچوں کا امتحان ایک ہی بار دیا علیحدہ علیحدہ کر کے یا یہ امتحان کب دیئے گئے۔ ہمیں تو اتنا معلوم ہے کہ انھیں بار ایٹ لا کی ڈگری یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو ملی۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے امتحانات کے پہلے حصے کی تکمیل کیمبرج میں اپنے قیام کے دوران کرلی ہوگی۔ مگر دوسرے حصے کی تیاری اور تکمیل بعد میں لندن میں رہائش کے دوران کی۔" ؎۲

اقبال کی بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کے متعلق شیخ سر عبدالقادر ہمیں صرف اتنی ہی وضاحت بہم پہنچاتے ہیں:

> "جو دو سال میرے اور اقبال کے انگلستان میں مشترک گزرے وہ بہت دلچسپ تھے۔ گو وہ کیمبرج میں رہے اور میں لندن میں تھا مگر ان سے ملنے کے بعد سے موقعے ملتے

؎۱ ؎۲ "زندہ رود" ڈاکٹر جاوید اقبال۔ جلد اوّل ص ۱۱۳

رہے....... جب اقبال لندن آتے تو بیرسٹری کے ڈنروں یا کھانوں کے لئے ہم مل کر جاتے۔ بعض علمی مجالس میں بھی اکٹھے شریک ہوتے تھے اور ہمارے بعض احباب بھی شریک تھے۔" ؏١

کیمبرج سے بی۔ اے: کیمبرج میں علامہ اقبال کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ انور بیگ لکھتے ہیں:

"اقبال کیمبرج میں تین سال رہے۔ انھوں نے ٹرنٹی کالج کے ایک ADVANCED طالب علم کے طور پر صوفی مش فلسفی میکٹگریٹ کے لکچروں کے ایک کورس میں حاضری دی۔ یونیورسٹی آف کیمبرج نے انھیں فلسفے میں ایک بہت بلند پایہ ڈگری دی۔" ؏٢

معلوم نہیں عبداللہ بیگ فلسفے کی ایک بہت بڑی ڈگری سے کیا مراد لے رہے ہیں حالانکہ اقبال کو کیمبرج سے بی اے کی ڈگری ملی تھی۔ ہاں ان کے بی اے کے ڈسرٹیشن THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA اور کیمبرج یونیورسٹی نے اقبال کو ایک certificate of merit دیا تھا۔ ہو سکتا ہے عبداللہ انور بیگ اسی certificate of merit کو فلسفے کی بہت بلند پایہ ڈگری کہہ رہے ہوں۔

محمد عبداللہ قریشی نے بھی اس سلسلے میں گول مول سی بات لکھی ہے۔ وہ بی اے کی ڈگری کے متعلق لکھتے ہیں: "انھوں نے اپنے فلسفیانہ مطالعے اور تحقیقی انہماک سے فلسفۂ اخلاق پر ایک مقالہ لکھ کر بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ یہی کیمبرج یونیورسٹی کا سب سے بڑا امتحان تھا۔" ؏٣ گویا محمد عبداللہ قریشی نے بی اے کے تحقیقی مقالہ کی جانب اشارہ تو کر دیا ہے لیکن صحیح صورتِ حال

؏٣ حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں ص۳۰

؏١ "نذرِ اقبال" مرتبہ محمد حنیف شاہد ص١۔ شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی اس تحریر کا باقی ماندہ حصہ اگرچہ اقبال کے بیرسٹری کے امتحان سے متعلق نہیں ہے لیکن چونکہ اقبال کے قیامِ انگلستان سے متعلق ہے اس لئے یہاں اسے درج کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں: "میں جب آخری مرتبہ وہاں (کیمبرج) گیا تو میرے ایک دوست نے میری چائے کی دعوت کی۔ ہم سب دریائے کیم کے کنارے جس سے کیمبرج کا نام بنا ہے سیر کے لئے گئے۔ ایک خاتون کے پاس (فوٹو کا) کیمرہ تھا۔ وہ ہمارے مجمع کی تصویر لینے لگیں۔ مجمع کیمرے کے سامنے ترتیب پا رہا تھا کہ روشنی نے دھوکا دیا۔ اور آفتاب نے بادل کا نقاب منہ پر ڈال لیا۔ یوں تو دھوپ چھاؤں بدلتے رہتے ہیں لیکن مشرقی ملکوں میں تو سیر بھی برسات کے سوا ان کا کچھ ٹھکانہ ہوتا ہے اور ان کے وقتوں پر انحصار ہو سکتا ہے۔ مگر انگلستان میں آفتاب اکثر نایاب ہوتا ہے۔ کسی دن صبح کو شکل دکھاتا ہے تو کسی دن نادار اور کسی دن شام کے قریب ذرا سی جھلک

انہیں بھی معلوم نہیں تھی۔

اقبال کی کیمبرج سے بی اے کی ڈگری کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحریر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ اقبال نے کیمبرج سے بی اے کی ڈگری لی مگر یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیمبرج میں بی اے کا امتحان جسے ٹرائی پوس کہتے ہیں۔ میٹرک کے بعد تین مضامین تین سال کی مدت کے بعد دیا جاتا ہے۔ اور اس امتحان کو انڈر گریجویٹ دیتے ہیں۔ یونیورسٹی میں مخصوص عرصہ کی رہائش کے بعد ہر پوسٹ گریجویٹ کو ایم۔ اے کی ڈگری اعزازی طور پر مل جاتی ہے۔"[1]

لیکن دراصل اس تحریر سے اقبال کے بی۔ اے کے امتحان کے متعلق گرہ کھلتی نہیں۔ یہ گتھی بعد میں پروفیسر سعید اختر درانی (یونیورسٹی آف برمنگھم) نے سلجھائی۔ جب انھوں نے اپنی تحقیق کا نتیجہ یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ دراصل اقبال نے کیمبرج سے بی۔ اے ٹرائی پوس نہیں کیا تھا بلکہ بی۔ اے کا امتحان ایک تحقیقی مقالے (DISSERTATION) کے ساتھ دیا جس کا عنوان تھا The development of metaphysics in persia. یہی وہ مقالہ ہے جس پر میونخ یونیورسٹی نے اقبال کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری دی۔

ڈاکٹر درانی کی یہ تحقیق جو مطالعۂ اقبالیات میں ایک بالکل ہی سیوم باب کھول رہی ہے ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور باعثِ رشک ہے اور اس کی تفصیل آئندہ باب میں کیا جا رہا ہے

---

[1] "زندہ رود" ڈاکٹر جاوید اقبال ص۱۱۳

(تیسرے صفحہ کا حاشیہ) سنہ فی البدیہہ یہ دو مصرعے موزوں کئے سرخیاں سرِ لب جو کا کشد تصویر ما منتظر باشیم آید برون — یہ مجھے اب یاد نہیں کہ آفتاب پھر نکلا اور وہ خاتون تصویر کھینچ سکی یا نہیں مجھے اپنے پروگرام کے مطابق ایک سال پہلے انگلستان چھوڑنا پڑا۔ وہ میرے بعد آئے۔

ترقی اردو بورڈ کی نئی کتابیں

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم	صفحات	قیمت
۱۔	فسانۂ آزاد (جلد اوّل)	رتن ناتھ سرشار	صفحات ۱۰۸۸	قیمت ۱۰۰/-
۲۔	فسانۂ آزاد (جلد دوم)	رتن ناتھ سرشار	۷۱۸	۶۵/-
۳۔	فسانۂ آزاد (جلد سوم)	رتن ناتھ سرشار	۱۸۸۸	۱۳۵/-
۴۔	رباعیات انیس	علی جواد زیدی	۳۸۶	۳۵/-
۵۔	تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ	سگمنڈ فرائڈ / ظفر احمد صدیقی	۳۸۶	۳۵/-
۶۔	اسکول لائبریری	سید حسین رضا نقوی	۱۵۶	۲۰/-
۷۔	کوئلہ	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	۲۰۴	۲۲/-
۸۔	ناوابستگی	رشید الدین احمد خاں / سید محمد مہدی	۲۶۴	۳۷/-
۹۔	مسابقتی صنعت کی ساخت	ای۔ اے۔ جی۔ رابنسن	۱۸۲	۲۲/
۱۰۔	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	۲۰۶	۲۷/
۱۱۔	وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی قدیم لوک کہانیاں	مرتب: محمد امین	۱۰۰	۱۰/
۱۲۔	عام لسانیات	ڈاکٹر گیان چند جین	۹۱۰	۷۵/
۱۳۔	اصطلاحات لسانیات	ترقی اردو بورڈ	۱۲۸	۲۲/
۱۴۔	ہندو فلسفۂ مذہب اور نظام معاشرت	مولفہ ڈاکٹر سید حامد حسین	۷۹	۹/
۱۵۔	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	۱۴۷	۸/۵۰
۱۶۔	عسکری درجہ بندیاں	میلول ڈیوثار / سید محمود حسن قیصر	۹۰۸	۸۰/-

(ب) چند اور خصوصی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم	صفحات	قیمت
۱۔	چولا راجگان	کے۔ اے۔ نیل کنٹھ شاستری	۱۱۱۵	۶۰/
۲۔	منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	۷۲۴	/
۳	ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی۔ سی۔ سرکار۔ ملیحہ سمیع الزماں	۶۸۴	۴۹/
۴۔	جامع تاریخ ہند	محمد حبیب و خلیق احمد نظامی	۵۶۹	۳۲/
۵۔	نوریات	ایف ڈبلیو سیرس / آر۔ کے رستوگی	۱۰۴۰	۵۸/۴۵
۶۔	بین الاقوامی معاشیات	چارلس پی کنڈل برجر / ڈاکٹر لیاقت علی	۷۴۴	۳۵/-
۷۔	ہندوستان میں بیوپاری کمپنی کا فروغ	رادھے شیام رنگٹا / غلام حیدر	۵۲۸	۲۱/۵۰
۸۔	کلاسیکی برقی مقناطیسیت	ولف گانگ اینڈ پینوفسکی / ربابی سکینہ	۶۵۴	۵۰/
۹۔	سرطان کیا ہے؟	محمد برہان محسن	۱۵۲	۷/-
۱۰۔	مسیر طالبی (سفرنامہ)	ابوطالب اصفہانی / ثروت علی	۳۵۹	۳۲/-
۱۱۔	ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	۷۴۰	۴۶/-
۱۲۔	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورلین / سلامت اللہ	۱۰۰۳	۴۷/-
۱۳۔	تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	۷۶۷	۶۵/-
۱۴۔	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	ڈی آر گیڈگل / ایم صدیقی	۳۴۳	۱۳/-

ملنے کا پتہ: **شعبہ فروخت و نمائش**
ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے پورم، نئی دہلی
فون نمبر ۶۰۹۴۴
۶۰۳۹۳۸
۶۰۳۳۸۱

محمد قیصر الزماں قیصر

مولانا آزاد چوک، گری ڈیہہ (بہار)

اُردو کی خواتین افسانہ نگار: ایک پس منظر
(تحقیق کی روشنی میں)

سردار محمدی بیگم کے بعد دوسری خواتین افسانہ نگاروں میں سید النساء ہیں اس کے بعد کئی نام ملتے ہیں جن میں فاطمہ، صغرا ہمایوں مرزا، حجاب امتیاز علی تاج، اور مسز عبد القادر کے نام نمایاں طور پر جانے جاتے ہیں۔ یوں تو نذر سجاد نے بھی افسانے لکھے ہیں لیکن وہ بھی کے برابر۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں واقعات کی سماجی نوعیت ضروری ہے ن فن سے ناواقفیت کی بنا پر یہ افسانے بوجھل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بھی ان میں صغرا ہمایوں مرزا کا نام اہم ہے ں نے اوروں سے زیادہ لکھا۔ صغرا کی تصنیف "مشیر النسواں" ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ تمام افسانہ نگار سماجی لی کے ترجمان ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق مسلم معاشرے سے تھا۔ اس لئے ان کے موضوعات بھی اس سے لئے گئے ہیں۔ کے تخلیقات سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کے نظریات پر نذیر احمد کا گہرا اثر ہے۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں یہ ندو ستاجس کی اتفاقی کڑیاں حجاب اور مسز عبد القادر ہی مانی جاتی ہیں۔

حجاب، یلدرم سے متاثر ہیں۔ ان کے افسانوں میں گوتھک (GOATHIC) اسکول کی خصوصیات ح طور پر ملتی ہیں۔ گوتھک افسانے بھی رومان کی ایک قسم ہیں۔

حجاب کے بعد دوسری خاتون افسانہ نگار جنھوں نے گوتھک اسکول کی نمائندگی کی مسز عبد القادر ہیں۔

ان خاتون افسانہ نگاروں کے بعد ہی اردو افسانے میں ایک بڑا انقلاب آیا۔ اور اردو افسانے کو ماحول اور یات کے پس منظر میں لاکھی دریافتوں کو تلاش کرنے کا کام سب سے زیادہ عصمت چغتائی نے کیا لیکن عصمت قبل ڈاکٹر رشید جہاں نے بھی اس روایت کو مستحکم کیا۔ یہ دور "انگارے" کا دور تھا، خواتین میں پہلے

پہلا۔ رشید جہاں نے ہی ترقی پسند رجحانات کی ابتدا شعوری طور پر کیا۔ انہوں نے پرآشوب حالات کو تلخ حقائق کے ساتھ پیش کیا۔ اور سماجی حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔

ڈاکٹر رشید جہاں کے بعد لکھنے والیوں کی ایک تعداد میں عصمت چغتائی کو ممتاز مقام حاصل ہے اس کے بعد ممتاز شیریں اردو کی چند غیر معمولی خواتین افسانہ نگار خواتین میں ایک منفرد مقام بنالیا۔ جس کے متعلق شہزاد منظر کا خیال ہے :

"ممتاز شیریں کا شمار ان خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنی پہلی ہی تخلیق کے ذریعہ قارئین اور ناقدین کی توجہ مبذول کرالیتے ہیں۔ اور آتے ہی دنیائے ادب پر چھا جاتے ہیں۔ ممتاز شیریں بھی دنیائے ادب میں نقارے بجاتی ہوئی بڑے ہی طمطراق سے آئیں اور آتے ہی اپنے چند مضامین اور افسانوں کے ذریعہ اپنا ایک الگ اور منفرد مقام بنالیا۔ [1]"

ممتاز شیریں کی افسانہ نگاری کی عمر عصمت چغتائی سے کم نہیں ہے لیکن عصمت کے مقابلے میں انہوں نے کم لکھا کیونکہ ان کا زیادہ تر وقت مطالعے میں گذرا یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں تکنیک اور ہیئت کے بے شمار تجربے ملتے ہیں جنھیں اردو کی دوسری خواتین افسانہ نگاروں نے کم ہی سمجھا۔ عصمت نے خارجی دنیا سے بکھرے ہوئے مظاہر سے اپنے موضوعات چنے۔ لیکن ممتاز شیریں کا فن اکتسابی ہے۔ اس لئے ان کا موضوع بھی محدود ہے۔ وہ نہ عصمت کی جنسی حقیقت نگاری سے سماجی حقیقت نگاری کی منزل طے کرتی ہیں اور نہ رومان کی سیر کرتی ہیں۔

یہ جائزے ہمیں بتاتے ہیں کہ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے کارنامے نہ صرف گرانقدر ہیں بلکہ انہیں کسی بھی قیمت پر ناقدین فن نظر انداز نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ابتدا سے اب تک تاریخی تسلسل کے ساتھ خواتین افسانہ نگاروں نے اس صنف ادب کو سینچا۔ ان میں صغرا ہمایوں مرزا سے خالدہ اصغر تک ہر عہد میں خواتین افسانہ نگار اہمیت کے نقوش پر نشانیاں کرتی رہیں۔ بعض افسانوی رجحانات کی آئینہ داری بھی نہ صرف خواتین افسانہ نگار کی مخصوص ہے، مثلاً اردو میں گوتھک طرز کے افسانے عام طور پر کسی مرد افسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ بلکہ یہ انفرادیت حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر کی نمایاں پہچان بن گئی۔ ہاں البتہ تعجب ضرور ہے کہ موجودہ عہد میں اس کی قدر و قیمت معدوم ہوگئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے بے شمار افسانوں کے ذریعہ جس گوتھک آرٹ اور کلچر کی نمائش کی وہ آج بھی حیرت کی بات ہے۔

اس طرح حقیقت نگاری کا سہرا سیدالنساء کی "شریف بیوی" اور صغرا ہمایوں مرزا کے سر ہے یہ ضرور ہے کہ ان کی حقیقت نگاری بہت محدود تھی۔ لیکن یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا کہ حقیقت نگاری کی پہلی کڑی خواتین افسانہ نگار ہی ثابت ہوں گی۔ جسے بلاشبہ منشی پریم چند نے وسعت عطا کی "کفن" کے بعد جن

ماہنامہ سہیل گیا
لوگوں نے اردو ادب میں پہلی بار "احتجاجی" ادب کی تخلیق کی۔ اور حقیقت نگاری کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان میں ڈاکٹر رشید جہاں پہلی خاتون ہیں۔ پریم چند کے بعد حقیقت نگاری خارجی حقیقتوں کے بکھرے ہوئے مظاہر سے ہٹ کر فرد کی اندرونی کشمکش کے اظہار کا فن بن گیا۔ اس لئے ناقدین ادب نے "کفن" کو پہلا جدید افسانہ قرار دیا ہے۔ اس طرح سپاٹ حقیقت نگاری کی جگہ تہہ داری اور معنویت نے لے لی۔

مغربی افسانوں نے جس طرح اردو افسانے کو متاثر کیا کہ وہ بالکل عیاں ہے۔ موضوع، مواد، اور ہیئت کے اعتبار سے افسانہ نگاروں نے تجربے کئے۔ ان تجرباتی دور میں بھی خواتین افسانہ نگار پیش پیش ہیں۔ اس طرح اردو میں مختصر افسانے کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ فطری طور پر خواتین افسانہ نگاروں کی ابتدا اور ان کے فن کے تدریجی ارتقا کی تاریخ بن جاتی ہے۔

افسانوی موضوعات بے شمار ہیں۔ اور افسانہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے، دلویندر اسر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> افسانہ کسی بھی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے کسی افسانے میں سیاسی حل کی تلاش ملتی ہے یا اس کا کوئی مخصوص حل پیش کیا جاتا ہے تو کوئی سماجی پہلو کو اجاگر کرتا ہے، کسی کے لئے معاشی بحران اہم ہے تو کسی کے لئے اخلاقی یا اصلاحی نقطہ نظر، کوئی فن کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے، تو کوئی لاشعور کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے، کوئی حسن کا پجاری ہے تو کوئی انقلاب کا نقیب۔[1]

افسانوی ادب کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا یہ الگ سی بات ہے جبکہ بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر افسانے کا محور انسان ہی ہوتا ہے جس کے گرد ساری زندگی گھومتی ہے یہ انسان ہی تو ہیں جو سیاسی اور معاشی زندگی بسر کرتا ہے اور اس سے پیدا شدہ جبریت کا مسئلہ ہے۔ وہ بھی انسان ہی محسوس کرتا ہے لاشعور کی غلامی اور شعور کی عملی قدم یہ بھی انسان ہی اٹھاتا ہے مختصر یہ کہ باتوں کا تعلق انسان اور صرف انسان ہی سے ہے۔

اردو افسانوں کے ابتدائی دور میں دو نمایاں رجحانات ہمیں نظر آتے ہیں۔ ایک کا سرخیل پریم چند تھے اور دوسرے کا نقیب رومانوی افسانہ نگار تھے۔ مثلاً نیاز، مجنوں وغیرہ کا۔ ان سبھوں پر مغرب کا اس رومانویت کا اثر تھا جو آسکر وائلڈ کے ذریعہ پروان چڑھی۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، مہدی آفادی، سجاد انصاری، اور قاضی عبدالغفار ان اہم رومانی افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے اردو ادب میں باقاعدہ اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ان کے یہاں انفرادیت پسندی، آزادی، حسن، عورت اور

---

[1] اردو افسانہ روایت اور مسائل صفحہ ۶۰۳

ماہنامہ سہیل گیا۔

فطرت انسانی سے محبت کے جذبے کی فراوانی ہے جو رومانیت کی خصوصیت سمجھی گئی۔ انہوں نے عقل سے زیادہ دل پر زور دیا جو عورت حسن اور عشق کا آماجگاہ ہے۔

اردو افسانے کی ابتدا بھی فطری طور پر رومانیت سے ہی شروع ہوتی ہے لیکن رومانیت کی مختلف قسمیں افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہیں۔ حجاب اور مسز عبدالقادر کے افسانے بھی رومانی نوعیت ہی کے ہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی رومانیت سے الگ ہیں۔ اور نیاز کے جمالستان سے اس کی کوئی مطابقت ہے، اس طرح جب ہم قرۃ العین حیدر کو رومان نگار کہتے ہیں۔ تو ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ داستانی عہد کے افسانہ نگار خاتون ہیں۔ دراصل رومانیت کے مختلف شیڈز ہوتے ہیں اور اس کو برتنے کا الگ الگ انداز ہوتا ہے۔ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں نے کثرت سے رومانی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان سبھوں کے یہاں رومان کو ہی افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً حجاب سے جمیلہ ہاشمی کے یہاں تک سبھوں کے یہاں رومانی فکر کی الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں رضیہ سجاد ظہیر وہ واحد خاتون ہیں جن کا فن رومانی زندگی کے کربناک پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اور یہ رومانیت مجبوری کی داستان ہے جسے ہم ترقی پسند نظریات اور رومانیت کی آمیزش کہہ سکتے ہیں۔ [۱]

اردو افسانے میں مارکسی فلسفے اور فرائڈ کے نفسیات کے اثرات قریب قریب ایک ہی دور میں افسانے میں راہ پا گئے۔ جس کے باعث افسانہ نگاروں نے طبقاتی کشمکش اور جنسی جبر کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ "انگارے" کے افسانوں میں استحصال اور جنسی جبر دونوں کے خلاف احتجاج کی شکل میں سامنے آئے۔ یہ احتجاجی رجحان کی مثال پہلی مثال ہے۔ جس پر گفتگو کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> "انگارے کی اشاعت میں ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی بوسیدہ عقیدوں، فرسودہ اداروں، سماجی دشمن طاقتوں، اور مجہول سماجی اور اخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔" [۲]

انگارے میں احتجاج کی ایسی آواز سنائی دیتی ہے جس کی موجودہ ترقی یافتہ شکل ادب کی تیسری آواز ہے۔ [۳] ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے اس میں مارکسی، نیم مارکسی، انسان دوستی اور زندگی سماج کے متعلق ترقی پسند نقطۂ نظر کی اشاعت ہوگا۔

---

[۱] رضیہ سجاد ظہیر کی افسانہ نگاری کے متعلق راقم کا مضمون پڑھیے، جس میں تفصیلی طور پر رضیہ کے افسانوں پر بحث کی گئی ہے۔ (ق ن)

[۲] گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر صفحہ ۵۳

[۳] ادب کی تیسری آواز کی تفصیل عصری ادب کے خصوصی شمارہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

پریم چند نے بنیادی طور پر سماجی زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا۔ ان کے فن کا کینوس بہت وسیع تھا اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کریں جو صاف ستھری، غیر رومانی، سبک اور دھیمی اور داخلیت کے جذبے سے بالکل آزاد ہو۔ اس کی پیروی کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی سی ہے۔ لیکن انکار ہے کے مصنفین نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک باغیانہ فکر و نظر، گہری رمزیت، اور جذباتی انداز بیان اختیار کیا۔ اردو کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اس کو آگے بڑھانے میں مدد پہونچائی۔ یہاں تک کہ یہ مضبوط تنا ور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کے تمام افسانہ نگار برابر کے شریک رہے۔

وزیر آغا نے "اردو افسانے کے تین دور" میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلا دور داستان گوئی کی روایت سے منسلک رہا۔ انہوں نے اردو افسانے کے دوسرے دور کو ۱۹۳۶ء سے شروع کیا ہے۔ جس کی ابتدا انکارے سے ہوئی۔ اس وقت ادب میں جو تحریکیں اور رجحانات پرورش پا رہے تھے وہ بنیادی طور پر آزادی کی تحریک، مغربی ادب اور معاشرے کے اثرات، ۱۹۲۹ء کے اقتصادی بحران کے نتائج، اور یورپ کے دوسری جنگ عظیم کی تیاریوں کے پس منظر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس دور میں تخلیقی رجحان معدوم ہو گئے۔ اور اب فنکار اپنے اردگرد کی دنیا میں سانس لینے لگے۔ اس رجحان کی نمائندگی ترقی پسند افسانہ نگاروں نے کیا۔ اس دور کا نمائندہ فنکار کرشن چندر کو سمجھ سکتے ہیں۔ کرشن چندر کی تخیل پرستی نے اردو افسانے کو سپاٹ پن سے بچا لیا۔

پریم چند نے حقیقت نگاری اور سماجی مسائل کو کرداروں کی مدد سے پیش کیا۔ ان میں اصلاح کا ایک جذبہ تھا لیکن اس کے بعد کے افسانہ نگاروں نے سمندر میں غوطہ لگانے شروع کئے اور موتی کی تلاش کا ہنر سیکھا۔ یہ دوسرے دور کا اہم رجحان تھا جس کی نمائندگی خواتین افسانہ نگاروں نے بھی کی ہے جس میں عصمت کے علاوہ رشیدہ سجاد ظہیر نے بھی کی ہے۔ اسی دور میں حقیقت نگاری کا ایک نفسیاتی دور بھی رجحان بھی پرورش پا رہا تھا اور حقیقت نگاری ایک نئی قسم منظر عام پر آئی۔ اس کی نمائندگی حسن عسکری نے کی۔ اور انہوں نے کردار کے سوچ کا سہارا لے کر آزاد تلازمۂ خیال[1] کو اختیار کیا۔ جس کے اثرات خواتین نے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں

اردو افسانے کے اسی دور میں خالص تخیل یا خالص ارضی رجحان کے علاوہ ایک تیسرا رجحان ابھر کر کے سامنے آیا۔ یہ رجحان دراصل دونوں کے امتزاج کی ایک صورت تھی۔ اس کے علم برداروں نے زمین پر اتر کر زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ اور ان کے فن میں زندگی کی ارضی کیفیات انوکھی لطافت بن کر ابھرا۔ ان افسانہ نگاروں نے مثالی کردار کے بدلے زندہ کرداروں کا سہارا لے کر لطافت و صلاحیت کی دلکشی کو اپنایا۔

---

[1] اردو افسانے میں آزاد تلازمۂ خیال کو دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی برتا ہے۔

گو کہ اس کی نمائندگی وزیر آغا کے خیال میں صرف مسعود شاہد، شمس آغا، اور غلام عباس نے کئے۔ لیکن اردو کی خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اس کو اپنایا۔

اردو افسانے کا تیسرا دور ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد شروع ہوا۔ تقسیم کے بعد آزادی کا نعرہ بالکل معدوم ہو گیا۔ اور افسانہ نگار کی نگاہیں سماج کے بجائے فرد کو اپنی گرفت میں لینے کی طرف مائل ہوئے۔ پھر تقسیم کے بعد انسان کو ہجرت کا المیہ پیش آیا۔ اور انہیں زبردست انسانی المیہ سے دوچار کر کے کرداروں کی شکل میں پیش کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ المیہ فرد کی شخصیت کو ابھار دیتا ہے۔ اور اپنے ماحول سے برسرِ پیکار ہو کر کردار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تقسیم ملک سے معاشرے میں لاتعداد کردار ابھر کر سامنے آئے۔ اور افسانہ کی نظریں ان پر مرکوز ہونے لگیں۔ جس سے کردار نگاری کی روش وجود میں آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی ارضی پہلوؤں کو دیکھنے کا رجحان بھی عام ہوا۔ اس ارضی رجحان کے علمبرداروں میں مرد افسانہ نگاروں کے علاوہ خواتین افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ قرۃ العین حیدر، اور رضیہ سجاد ظہیر کے نام عام طور پر اہم ہیں۔

بیسویں صدی کو فرائڈ نے لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر ذات کی اہمیت کو پہچاننے کا طریقہ بتلایا۔ اس سے متاثر افسانہ نگاروں نے فرد کی محرومیوں کو موجودہ تہذیب کی مایوسیوں کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔

جبکہ موجودہ دور میں کئی ادیب اور دانشور انسان کی آزادی کی جدوجہد میں مارکس اور فرائڈ دونوں کے نظریات کو ایک اکائی میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ مارکسیت کے زیر اثر اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا دور شروع ہوا اور ترقی پسند طرز فکر منظم صورت اختیار کر گئی۔

عصمت نے جنسی گھٹن کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنے کرداروں کا تجزیہ کتابی طور پر نہ کر کے بلکہ اسے اپنے ماحول میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے برعکس رضیہ سجاد ظہیر[۱] نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی۔ انہوں نے عورت اور مرد کے جذبات کی ترجمانی میں منفرد انداز اور اسلوب کو اپنے افسانے میں راہ دی۔

آزادی کے بعد افسانہ نگاروں نے زیادہ تر انہیں موضوعات پر کہانیاں لکھیں جو آزادی سے قبل تھا۔ اس لئے بہت کم ہی ایسے ہیں جو آزادی کے بعد بھی تخلیقی طور پر زندہ ہے۔ چونکہ ترقی پسند افسانے میں تبلیغ، جذباتیت نعرے بازی اور اصلاحی جذبہ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ افسانوی کردار الگ الگ خانوں میں تقسیم ہونے لگے۔

۱؎ اردو کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگاروں میں رضیہ سجاد ظہیر ایک اہم نام ہیں۔ انہوں نے کئی اہم کہانیاں لکھیں چند کہانیاں بین الاقوامی ہیں۔ لیکن ترقی پسند ناقدین میں معدودے چند کے کسی نے رضیہ سجاد ظہیر کی افسانہ نگاری پر کوئی خاطر خواہ کام کیا نہیں۔ راقم نے رضیہ کی افسانہ نگاری پر کئی مضامین لکھا ہے۔ عنقریب "رضیہ سجاد ظہیر فکر و فن" کے عنوان سے کتاب زیر طبع ہے۔

فنی تقاضوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اور نظریاتی وابستگی نے مکروہ صورت اختیار کر لی۔ اور جب صفائی کی مہم شروع ہوئی تو اس کی زد میں ترقی پسند اور نفسیاتی افسانوں کے بحران کا دور تھا۔ اور نفسیاتی افسانوں کے خالق بھی آ گئے لیکن اس بحرانی دور میں جنھوں نے تخلیقی عمل کو جاری رکھا۔ ان میں عصمت، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، اور جیلانی بانو قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے زندہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ ان کی تخلیقی قوت اور تہذیب معاشرے میں ان کی جڑیں پیوست تھیں۔

جدید دور میں علامتی اور تجریدی افسانوں کی تخلیق میں جدیدیت کو کافی تقویت ملی۔ اور ان میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، اور کمار پاشی وغیرہ نے تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ علامتی افسانے جدیدیت کے ہم معنی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ جدید دور کی ذہن ہیں۔ اس سے قبل احمد علی نے تاثر انگیزی اور علامتی، تجریدی انداز کے افسانے پیش کر چکے تھے۔ ممتاز شیریں کا افسانہ میگھ ملہار اہم علامتی افسانہ ہے۔ رضیہ کا افسانہ "واپس نہ آنا" بھی علامتی انداز کا بہترین افسانہ ہے۔

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ افسانوی سفر کا کوئی موڑ ایسا نظر نہیں آتا جس میں اردو کی خواتین افسانہ نگار نے اپنی گرانقدر تخلیق کے ساتھ نہ دکھائی دیتی ہوں۔ یہ امتیاز ہندوستان کی مختلف زبانوں کی ادب میں صرف اردو ادب کو حاصل ہے۔ یہ اور قابل فخر ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں نے ہی مختصر افسانے کی ابتدا کی۔ سیدۃ النساء، صغرا ہمایوں اور پھر جدید عہد میں خالدہ اصغر، رضیہ فصیح، زینت ساجدہ، آمنہ ابوالحسن اور شمیم صادقہ تک (یہ فہرست نامکمل ہے) خاتون افسانہ نگاروں کی تخلیقات اور ادبی کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گذشتہ سو سال کی افسانوی ادب میں کوئی ایسی منزل دکھائی نہیں دیتی جبکہ خواتین افسانہ نگاروں کے فن پر جمود طاری ہو گیا ہو۔ یہی نہیں ان کی تخلیقات کا سلسلہ جاری رہا بلکہ ہم عصر مغربی ادب کے تمام نظریات و تحریکات سے متاثر ہوئیں۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ خواتین افسانہ نگاروں کو اگر افسانہ نگاری کی تاریخ سے خارج کر دیا جائے تو اردو کا افسانوی ادب بے رنگ و بو ہو جائے گا۔ اس ضمن میں رضیہ سجاد ظہیر لکھتی ہیں:

> "۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ایک نئی پیڑھی اردو افسانے میں آتی نظر آتی ہے۔ اور ان پرانے (جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنتے ہی ساتھ آ گئے تھے) ادیبوں کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگی ہے۔ ان میں ممتاز شیریں، کرتار سنگھ دگل، مہندر ناتھ، انتظار حسین، سہیل عظیم آبادی، اقبال متین، رضیہ سجاد ظہیر، فکر تونسوی، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، سریندر پرکاش، دیویندر اسر، ان لوگوں کے کم و بیش عقائد ترقی پسند مصنفین

کے سے ہی تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر کے یہاں کرداروں کی انفرادی تخصیص اور تجزیہ حالات پر بالواسطہ طور پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔" [1]

یہ واضح ہے کہ آزادی کے بعد رضیہ کے افسانے بھی اہمیت کے حامل ہو چکے تھے۔ اس عہد میں مختلف نظریات وخیالات رکھنے والے کچھ افسانہ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے بھرپور طریقے سے مغربی افسانوں کے اثرات قبول کئے۔ اور انھیں فنکاروں نے اردو افسانوں کو فن اور تکنیک کے اعتبار سے معراج کو پہونچایا۔

آزادی کے بعد جو انتشار پیدا ہوا۔ اور ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اس سے اردو افسانے کے میں گرانقدر افسانے پیدا ہوئے۔ اسی باعث تخیلی رجحانات غالب ہو گئے۔ اور زندگی کی ارضی سطح نمایاں لگی۔ نئے دور کی نئی شکل وصورت انتظار حسین کے افسانوں میں ملتی ہے جنھوں نے ہجرت کے المیے کو اپنی رشتہ کا ذریعہ بنایا۔ خواتین افسانہ نگاروں نے بھی تقسیم کے المیے کو دوسرے اہم افسانہ نگاروں کی طرح محسوس انھوں نے انتظار حسین کی طرح ماضی کی نیم تاریک تخیلی فضا تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی پیروی کی۔

آزادی کے بعد آنے والی دہائیوں میں اردو افسانے جدید رجحانات سے آشنا ہوئے جن میں اور علامتی اظہار نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

نوٹ: اردو کی خواتین افسانہ نگار ایک پس منظر کے عنوان سے راقم الحروف کا مضمون سہیل کے نومبر ۸۵ء اپریل ۸۶ء اور جولائی ۸۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر مضمون بھی اسی کی آخری کڑی ہے۔ مضمون کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا جس کے لئے مدیر سہیل اور راقم خود قارئین سے معذرت کے خواستگار ہیں۔ عنقریب " جدیدیت اور خواتین افسانہ نگار " کے عنوان سے سیر حاصل مضمون سہیل کے لئے لکھ رہا ہوں۔ (ق۔ م)

بقیہ: ضیا فتح آبادی سے انٹرویو

کا فرق ان کے اپنے اپنے ادب میں واضح ہوتا ہے۔ فلم کی مقبولیت کا دارو مدار تو عام فہم زبان پر ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اردو زبان کی مقبولیت کو قائم ودائم بنانے کے لئے فلموں کی زبان اردو ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ فلم بنائی تو جائے اردو میں اور اس کی زبان بتائی جائے ہندی! ○○

مُعتمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو۔ اندور

ضیا فتح آبادی سے ایک انٹرویو

خالد: ضیا صاحب آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

ضیا: ۹ فروری ۱۹۱۳ء کو سابق ریاست، کپورتھلہ (جالندھر پنجاب) میں اپنے ماموں لالہ شنکر داس پوری کے مکان پر صبح کے وقت۔ میرا آبائی وطن فتح آباد ضلع امرتسر ہے۔

خالد: آپکی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا ؟

ضیا: میری پہلی غزل غالباً ۱۹۲۹ء ہفتہ وار "چمن" امرتسر میں شائع ہوئی۔ میری ادبی زندگی کا آغاز یہیں ہوا۔

خالد: آپ کا پہلا ادبی رہنما کون ہے ؟

ضیا: جناب اصغر علی ضیا جے پوری جو مجھے گھر پر اردو پڑھاتے تھے۔

خالد: آپ نے ضیا تخلص کس مناسبت سے اختیار کیا؟ یا اس تخلص پر کسی کا اصرار تھا۔

ضیا: جناب اصغر علی ضیا جے پوری نے میرا تخلص ضیا تجویز کیا [illegible] امرتسر [illegible] غزل اسی تخلص [illegible] [illegible] کا شاگرد بنا تو انھوں نے میرا تخلص ضیا رکھ دیا۔ اب اس تخلص کو میرے نام مہر لعل سے کافی مناسبت ہے۔

خالد: آپ اکتسابی شاعر ہیں یا وہبی ؟

ضیا: لوگ مجھے وہبی شاعر ہی کہتے ہیں۔ ویسے میرا عقیدہ ہے کہ بغیر اکتسابِ فن کوئی شاعر دراصل شاعر بن ہی نہیں سکتا۔ شاعر کے لئے فنی آگہی اور مشق کی سخت ضرورت ہے۔

خالد: کیا آپ کے بزرگوں میں بھی کوئی ادیب و شاعر گزرا ہے ؟

ضیا: جہاں تک مجھے علم ہے میرے بزرگوں میں کسی کو ادب اور شاعری سے ذوق نہیں رہا۔

خالد: آپ نے شاعری ہی کیوں پسند کی ؟ افسانہ، ڈرامہ یا تنقید بھی تو اختیار کی جا سکتی تھی۔

ضیا: میری ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا لیکن میں نے افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو مختلف رسائل میں [illegible]

ہوئے۔ لیکن میری زیادہ تر توجہ شاعری کی ہی طرف رہی۔ اس کا ایک سبب معاشی مصروفیات تھا جس سے اتنی فرصت نہیں ملی کہ میں نثر لکھنے کے لئے وقت نکال سکتا۔

خالد: آپ فکرِ سخن کس طرح کرتے ہیں؟

ضیاء: یہ نہایت غیر شاعرانہ سوال ہے۔ جانتا ہوں کہ چند شعراء نے ایسے ہی سوال کا جواب دیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میرے لئے "فکرِ سخن" کے لئے کوئی لوازمات نہیں۔ نہ ہی میں نے اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ کوئی حالت ہو جب شعر کو نازل ہونا ہوتا ہے وہ نازل ہو جاتا ہے۔ البتہ اسے نوٹ کرنے کے لئے کاغذ اور پنسل ضرور درکار ہیں۔

خالد: آپ کی زندگی کا ایسا کوئی المیہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟

ضیاء: میری زندگی ایک ہموار قسم کی زندگی رہی ہے۔ اچھا خاندان اور اچھی ملازمت، تو بھی ایسا نہیں کہ میری زندگی میں آتار چڑھاؤ نہیں آئے۔ ضرور آئے ہیں۔ ایم۔ اے بننے کے بعد چالیس روپے ماہانہ کی معمولی کلرکی ۱۹۳۹ء میں میری بڑی اور عزیز بہن کی وفات پھر دو ایک سال کے بعد میری پہلی بیوی کا انتقال، دفتر میں دشمنوں کی ایذا رسانی وغیرہ وغیرہ ان تمام واقعات کا اثر میرے دل و دماغ پر ہوا اور یقیناً میرے کلام میں بھی ظاہر ہوا۔ لیکن ایسا کوئی خاص المیہ جس نے میری شاعری کا رُخ نیا موڑ دیا ہو۔

خالد: کیا آپ فنِ عروض سے واقف ہیں؟ کیا عروض کا جاننا ہر شاعر کے لئے ضروری ہے؟ اور آپ نے فنِ عروض کس سے سیکھا؟

ضیاء: یہ میرے لئے کافی ٹیڑھا سوال ہے۔ میں نے بی اے میں فارسی آنرس کا امتحان دیا تو اس وقت فنِ عروض باقاعدہ سیکھا۔ مگر اس کے بعد مشق جاری نہیں رکھی، اور بھول گیا۔ میرے نزدیک عروض غیر ضروری نہیں لیکن شعر کہنے کے لئے عروض آگہی سے زیادہ موزونی طبع کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر کبھی کوئی بحث چھڑ جائے تو عروض کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

خالد: سیماب مرحوم سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟

ضیاء: علامہ مرحوم ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں لدھیانہ آئے تو میں امرتسر سے ان کا نیاز حاصل کرنے لدھیانہ پہونچا۔ ان سے میری ملاقات لدھیانہ ہی میں ہوئی۔ وہیں میں پہلے پہل ایک پبلک مشاعرے میں بطور شاعر شریک ہوا۔ گو میں نے اپنی طرحی غزل خود نہیں پڑھی یہ نیک کام محترمی ساغر نظامی نے انجام دیا۔ البتہ داد اگر کوئی ملی تو میں نے وصول کی۔

خالد: پھر آپ نے شرفِ تلمذ کس طرح حاصل کیا؟

ضیاء: میں فرخ امرتسری کی اصلاح سے غیر مطمئن تھا۔ "شاعر" کا ایک پرچہ دیکھ کر میں نے علامہ مرحوم کو خط لکھا کہ میں اُن کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ انھوں نے منظوری دیدی۔ اور میں انکے تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔

خالد: آپ نے اپنے ابتدائی کلام پر کس سے اصلاح لی تھی۔

ضیاء: جناب اصغر علی حیا جے پوری، جناب فرخ امرتسری، جناب فیروز طغرائی اور علامہ سیماب اکبرآبادی سے۔ سیماب مرحوم کا شاگرد بننے کے بعد پھر کسی دیگر اُستاد کو کلام نہیں دکھایا۔

خالد: آپ کی نظر میں "اصلاح" کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ضیاء: اصلاح کا اصل مقصد شاگرد کے ذوق کی تربیت اور اُس کی صلاحیتوں کو اُبھارنا ہے۔ زبان و بیان کی صحت کے ساتھ خیال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خالد: سیماب مرحوم کا طریقۂ اصلاح کیا تھا؟ کیا وہ طریقہ آپ کو پسند تھا؟ یعنی آپ اس سے مطمئن تھے۔

ضیاء: اس سوال کا مکمل جواب آپ کو سیماب مرحوم کی تصنیف "دستور الاصلاح" میں ملے گا۔ میں یہاں صرف اتنا کہوں گا کہ سیماب مرحوم کی اصلاح سے اگر میں غیر مطمئن ہوتا تو انکی شاگردی سے انکار کر دیتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

خالد: کیا شاعر CYNIC ہوتا ہے؟

ضیاء: اب میں اس بات کا کیا جواب دوں۔ دیکھنے میں تو یہ آتا ہے کہ جس شاعر کا دماغ کا کوئی پیچ جتنا زیادہ ڈھیلا ہوتا ہے وہ اُتنا ہی بڑا شاعر بن جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر کی فطرت کو سمجھنا محال ہے۔ یہاں اختر اور مجاز کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

خالد: کیا ادب کی تخلیق کے لئے بالخصوص شاعری کے لئے شراب، غمِ جاناں اور غمِ دوراں ضروری ہے؟

ضیاء: میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں خلوصِ دل کی دو صورتیں ہیں اور خلوص کے بغیر کوئی فن مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

خالد: آپ کے حلقۂ تلامذہ میں کن کن شعرا کی شمولیت ہے؟

ضیاء: مجھ میں وہ کوالیفیکیشن نہیں جو کسی کو اُستاد بناتی ہے۔ میں تو ابھی خود شاگرد ہوں۔ اس لئے میرا حلقۂ تلامذہ ممکن نہیں۔ البتہ چند دوست کبھی کبھار مجھ سے مشورہ کر لیتے ہیں، اب ایسے دوستوں کے نام کیا بتاؤں۔ آپ مجبور ہی کر رہے ہیں تو ایسے چند دوستوں کے نام سنئے: جناب اوم پرکاش بجاج ایم۔ اے، جناب خلیق الولوی، جناب آر کے سہگل، جناب

...نہیں کیا

شاد کمالوی، اور جناب رام ناتھ شرما۔

خالد: آپ نے اصلاح میں علامہ سیاب مرحوم کا اتباع کیا ہے یا دوسرے طریقے وضع کئے ہیں؟ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کا طریقۂ اصلاح منفرد ہے۔

ضیاء: کسی بات میں سیاب مرحوم کے اتباع سے مجھے ہرگز انکار نہیں مگر انفرادیت ہر شخص کی الگ ہوتی ہے۔ شاید میرے فن میں آپ کو میری اپنی جھلک بھی کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جائے۔

خالد: آج اردو شاعری میں جو نئے تجربات کئے جا رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ضیاء: ادب کوئی جامد شے نہیں۔ اس میں تجربے ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے یہی اس کی ترقی کا راز ہے۔ میں نئے تجربے کی قدر کرتا ہوں۔ اگر آپ سال بہ سال میرے کلام کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے ہر نئی ادبی تحریک سے اثر لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اپنی انفرادیت کو ختم نہیں ہونے دیا۔

خالد: ابھی تک آپ کے کتنے شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں؟

ضیاء: طلوع، نورِ مشرق، نئی صبح اور گردِ راہ۔

خالد: آپ اپنی شاعری کے ذریعے عوام، سماج اور ادب کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

ضیاء: یہ قطعی طور سے ضروری نہیں کہ ہر شاعر و ادیب کا کوئی پیغام ہو۔ ویسے پیغام کا ہونا سونے پہ سہاگے کا کام کرتا ہے۔ میری شاعری دراصل میرے جذبات اور میرے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں آپ کو تجربے اور مشاہدے کا تاثر ملے گا۔ اب اگر آپ اس میں کوئی پیغام بھی تلاش کرنا چاہیں تو آپ کو زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ خلوص، محبت اور انسانیت کا ہر شاعر و ادیب پرستار ہے۔ اور میں بھی ہوں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ میں قنوطی کم رجائی زیادہ ہوں۔

خالد: کیا علامہ سیاب مرحوم نے کہیں آپ کی صلاحیتوں، جذبات اور فن کا اعتراف کیا ہے؟

ضیاء: سیاب مرحوم مجھے بیحد عزیز رکھتے اور ہمیشہ میری ترقی کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ میری تعریف کر کے نہیں چاہتے تھے کہ میری ترقی کے راستے بند کر دیئے جائیں تو بھی وہ میری شاعری اور ترقی سے مسرور تھے۔ اور انھوں نے ۱۸ / ستمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا کہ "مجھے اعتراف ہے کہ وہ اپنے بعض برادرانِ بیشین اور بعض خواجہ تاشانِ آخر میں سے زیادہ علم دوست، متقی، ذاکر اور صاحبِ ذوق ہیں۔ ان میں تلاش و تفحص کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ مجھے ان کی...

اور انکی شاعری کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔

خالد: علامہ سیماب مرحوم کا آپ کے ساتھ کوئی دلچسپ لطیفہ؟

ضیاء: علامہ مرحوم سے میری چند ملاقاتیں ضرور ہوئیں مگر نہایت مختصر۔ اصلاح کا سلسلہ خط و کتابت تک محدود تھا۔ پھر انکی طبیعت میں سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔ میں فطرتاً بزرگوں کا ادب کرتا ہوں۔ لطیفہ بازی کا موقع ہی نہیں ملا۔

خالد: ہمیں اردو شاعری کو مزید مقبول عام اور با مقصد بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہیے؟

ضیاء: آپنے تو ایک ہی سوال میں اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کا احاطہ کر لیا۔ اس سوال کے جواب میں تو ایک دفتر درکار ہے۔ اردو شاعری مقبول عام بھی ہے، شیریں بھی ہے، دلچسپ بھی ہے اور با مقصد بھی ہے اور اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اس کے ان اوصاف میں کوئی کمی نہ آنے دیں۔ عام مقبولیت کے لئے اسے عام فہم بنائیں، شیریں، آسان اور عام فہم الفاظ کے استعمال ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔ اسے دلچسپ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے مسائل کا جائزہ لیتے رہیں اور مقصدیت یہی ہے کہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں امداد بہم پہونچائیں۔

خالد: آپ کو شاعری کی کس صنف سے زیادہ دلچسپی ہے اور کیوں؟

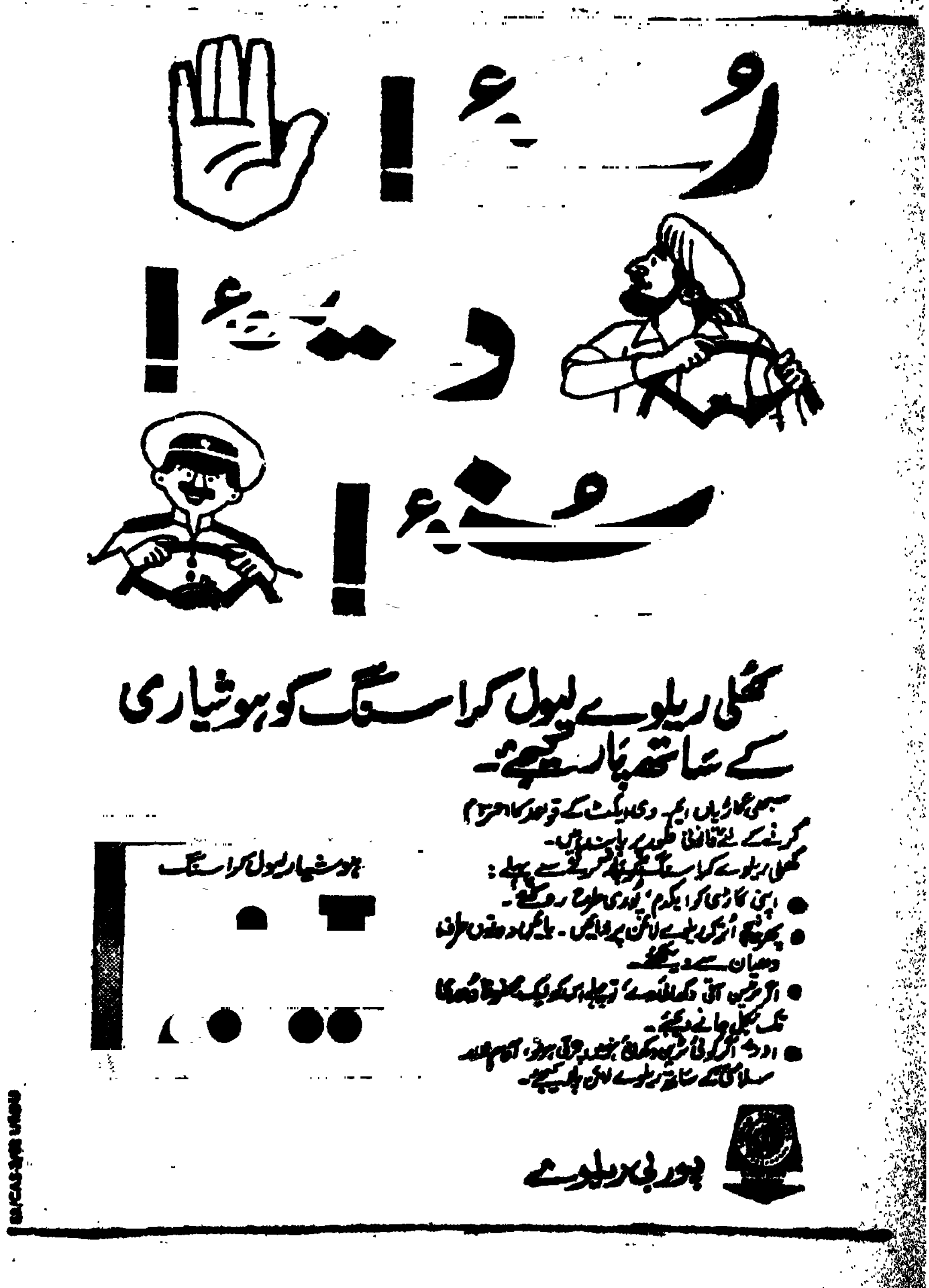
ضیاء: میری شاعری کا آغاز غزل سے ہوا مگر میرا پہلا مجموعۂ کلام "طلوع" قطعات کا مجموعہ ہے اور دوسرا مجموعہ "نورِ مشرق" میں صرف نظمیں شریک اشاعت ہیں البتہ "نئی صبح" اور "گرد راہ" میں نظموں کے علاوہ رباعیاں اور غزلیں بھی مل جائیں گی۔ نظموں سے مجھے خاص لگاؤ ہے مگر کم فرصتی کی وجہ سے غزلیں بھی بہت کم کہی ہیں۔ اگر سچ پوچھیں تو میری دلچسپی نظم اور غزل دونوں سے یکساں ہیں اور مجھے دونوں ہی کارآمد اور مفید نظر آتی ہیں۔

خالد: بالخصوص نئے شعراء کے لئے آپکا کیا پیغام ہے؟

ضیاء: شاید نئے شعراء سے آپکا مراد وہ شاعر ہیں جو تجریدی شاعری تخلیق کر رہے ہیں۔ انکو تو کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں کیا پیغام دوں۔ البتہ ان سے اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ ذات میں اس درجہ نہ کھو جائیں کہ کائنات انکی تخلیقات سے بدظن ہو جائے۔

خالد: اردو زبان کے بغیر فلم کی مقبولیت و کامیابی مشکوک ہے۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے؟

ضیاء: یہ سوال آپکو کسی پروڈیوسر سے کرنا چاہیئے۔ جو زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اسے اردو بھی کہہ سکتے ہیں اور ہندی بھی۔ زبانوں [illegible]



رُکیے!
دیکھیے!
سُنیے!
کھلی ریلوے لیول کراسنگ کو ہوشیاری کے ساتھ پار کیجیے۔
ہوشیار لیول کراسنگ
کھلی ریلوے کراسنگ کو پار کرنے سے پہلے:
اپنی گاڑی کو ایکدم پوری طرح روکیے۔
پوربی ریلوے

اپنے پن کا دھوکا

بے منزل راہ پہ
ہمراہ اپنے مجبور قدم، مایوس نظر
زیست کا ایک عجیب منظر ——
مدفن حسرتوں کی یہ قبریں
میرے فکر و نظر کے شبستاں میں
چیختی چلاتی یہ لاشیں
لیکن تھرتھراتی نظروں کے آئینے میں
ساتھ چلتے ہوئے سایہ کا سایہ تک نہیں
بس اپنا وجود تنہا اور خالی پن
یہی ہے شاید اپناپن
سایہ میرا کہیں بکھرا تو نہیں۔
نہیں نہیں ——
یہ تو کھوکھلا ہوا ہے.
صعوبتوں کے ہتھوڑوں سے
یہ تو چور ہوا ہے
غموں کے پہاڑوں سے
پس یہ نالاں مجھ سے دشمن کی مانند
ہر لمحہ مجھ سے گریزاں اڑتے دود کی مانند
اُف یہ جہالت کا بارِ گراں
قدم قدم پہ یہ تلخ مکاروں کے
ہوتا ہے راہبروں میں راہزن کا گماں ●
لیکن اُن کی راہزنی کا گلہ کیا؟
جب کہ اپنے پن کا احساس
بس ایک فریب و دھوکہ
جس کا شکوہ کس سے کیا جائے؟
بس میرے روز و شب کے وارثو!
آؤ! میرے ہمراہ چلو
کہیں میں سفرِ زیست کے اجنبی مقامات پہ
لڑکھڑاتی ہوئی گر نہ پڑوں
اک لاوارث لاش کی مانند
اپنے پن کا دھوکا کھا کر ▲▲

زخموں کی مانند

ڈاکٹر فریدہ کول

اسیرِ رنج و الم ہوں
پھر بھی سخت جاں ہوں
دھوپ کے شہر میں
اندھیروں کا سامنا ہے ہر پل
جہاں میرا آس بھرا چہرہ
ہوتا ہے زخمی ہر پل
مانا کہ میں زخم شناس ہوں
مگر نظروں کے آر پار
رہتا ہے جب زخموں کا خنجر
تو شدتِ کسک میں
رہتی ہوں بدحواس ہر پل
پھر بھی اس زخم دھار کو
اپنی زندگی کی اساس سمجھ کر
اپنے شریر کے ریشے ریشے کو
جب کبھی بیخودی میں سونگھ لیتی ہوں
تو ایک انجان سی مہک چھو لیتی
جو میرے عزم کی شمع کو
میرے آس کی دیپ کو
افسردہ لبوں پر شمعِ تبسم کو
رکھتی ہے فروزاں
بہتے پانی کی طرح رواں دواں
اجنبی پرچھائیوں کی محفل میں
یہ مہک فقط میری آشنا ▲▲

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر مسعود منظر
نے ملت آرٹ پریس۔ پٹنہ میں چھپوا کر
دفتر سہیل ریڈ سائیڈ روڈ گیا سے
شائع کیا۔ (ادارہ)

غزلیں

از ڈاکٹر حقیر آستانوی
(بمبئی)

○

چہرے سب اُتار کے، میری زندگی میں آ
جس میں ہے، اسی میں چل، جس میں ہے اسی میں آ
عرصۂ دراز سے کیوں بھٹک رہا ہے تو
یہ حریمِ ناز ہے، اس کا احترام کر
آج آنکھ سے اُتار اپنی کم نگاہیاں
صبح کی امین ہیں، یہ شفق کی سرخیاں!
اپنے جسم کو نہ دیکھ جسم تیرا لاش ہے
لفظ لفظ بات ہے، حرف حرف داستاں

اب اندھیرے سے نکل، اور روشنی میں آ
خواہ پھر خودی میں آ، خواہ بیخودی میں آ
اپنے ساتھ ساتھ چل، اپنی رہبری میں آ
سرکشی سے کر حذر، اور سادگی میں آ
اِس کشادگی کو دیکھ، اِس کشادگی میں آ
چھوڑ اپنی سروری، اس کی چاکری میں آ
اپنی لاش کو اُٹھا، اُٹھ کے آگہی میں آ
آدمی کا درد بن، ڈھل کے شاعری میں آ

کر نمازِ حق ادا، اُٹھ حقیرؔ کر وضو
دیر ہو چکی بہت، اُس کی بندگی میں آ

○

تابِ دید کو اگرچہ اذنِ انتظار دے
اس کے ساتھ ساتھ حسنِ دید کو نکھار دے
یا مری حیات کو جکڑ لے اختیار میں
یا مری حیات کا مجھی کو اختیار دے
بات وہ کہاں دِلوں کو جس سے تازگی ملے
بات جو کہ چین دے، سکون دے، قرار دے
جس کا وہ حبیب ہے، رفیق ہے، مشیر ہے
جو بھی اس کو عجز و انکسار سے پکار دے
رحمتِ تمام انہیں رحمتوں کا واسطہ
کچھ نہیں تو آدمی کو قلبِ غمگسار دے
فلک کی گردشیں، یہ شوخیاں زمین کی
میں نے کب کہا کہ مجھ کو سہل و استوار دے
[illegible] برکتوں سے ہیں یہ میری کج کلاہیاں
ایسی اور برکتیں حقیرؔ کو ہزار دے

○

میرے بعد میرا تذکرہ ہوا تو کس لئے
میرے بعد یہ کبھی حادثہ ہوا تو کس لئے
میری ذات کا، مرے شعور کا، جنون کا
میرے بعد کوئی آئینہ ہوا تو کس لئے
عشق تھا مجھے، کہ وہ فتور تھا دماغ کا
میرے بعد یہ معائنہ ہوا تو کس لئے
میں خیالِ خام تھا کہ مرکزِ حیات تھا
میرے بعد اِس کا فیصلہ ہوا تو کس لئے

زندگی گذار دی حقیرؔ خواب کی طرح
میرے بعد میرا تجزیہ ہوا تو کس لئے

○

غزلیں

عالم خورشید

ہم ہیں کہ در و بام سجانے میں لگے ہیں
کچھ فرد مگر گھر کو جلانے میں لگے ہیں

مدت ہوئی اجداد نے کچھ قرض لئے تھے
ہم آج بھی وہ قرض چکانے میں لگے ہیں

اب خشک ہوئے جاتے ہیں تالاب، سمندر
سب لوگ مگر پیاس بجھانے میں لگے ہیں

یہ آگ کہیں انکے مکان تک بھی نہ پہنچے*
کیوں لوگ مرے گھر کو جلانے میں لگے ہیں

زندہ ہوں مری سانس ابھی چل ہی رہی ہے
اور بیٹے مری لاش اٹھانے میں لگے ہیں

دنیا ہے کہ پردوں کی نمائش میں ہے عالم
سب لوگ یہاں چہرہ چھپانے میں لگے ہیں

عطا عابدی

کاٹ کر پھینکنے جنگل میں مرا سر نکلے
اپنے احباب بھی یوسف کے برادر نکلے

تھے جو معصوم بظاہر وہ ستمگر نکلے
جن کو انسان سمجھتے تھے وہ پتھر نکلے

سر پہ سورج جو کھڑا جب تو تمہیں بتلاؤ
کس طرح سایہ مرا قد کے برابر نکلے

بے خطر کود پڑا اس لئے میں دریا میں
تا کہ دل میں جو ہے بیٹھا ہوا وہ ڈر نکلے

اب تلک تو پس منظر بھی وہی منظر تھا
دیکھیں اب کون سا منظر پس منظر نکلے

خود نمائی کا جنوں تم کو مبارک لیکن
اپنی چادر سے عطا پاؤں نہ باہر نکلے

پروفیسر کلیم ضیا

گل سے نہ کسی خارِ مغیلاں سے ملے ہیں
یہ زخم مجھے آپکے احساں سے ملے ہیں

ناشاد کبھی شاد کبھی خوش کبھی برہم
وہ جب بھی ملے اک نئے عنواں سے ملے ہیں

جس وقت اسیرانِ چمن آئے چمن میں
رو رو کے گلے شاخِ گلستاں سے ملے ہیں

محدودِ رسالت ہے ہر اک جادۂ ہستی
ہم کو یہ سبق شامِ غریباں سے ملے ہیں

کچھ بھی وہ کریں زخم ضیا بھر نہیں سکتے
وہ زخم جو انسان کو انساں سے ملے ہیں

غزلیات

سیفی سرونجی

یوں تو علاج درد کا آسان تھا بہت
لیکن مرا طبیب پریشان تھا بہت
محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ نہ تھا مجھے
تہذیب سے میں ابھی انجان تھا بہت
لفظوں سے کر سکا نہ کبھی اسکا شکریہ
مجھ پر مرے عزیز کا احسان تھا بہت
اس نے کیا تھا وار مری پیٹھ پر مگر
خنجر زمیں پہ گر پڑا انجان تھا بہت
سیفی نہ تجھ سے ہو سکا اسمیں کوئی کمال
ورنہ یہ شاعری کا تو میدان تھا بہت

فردوس گیاوی

مرے شعور کی گہرائیوں کو تولے گا!
پھر اس کے بعد وہ ہر ایک راز کھولے گا
ابھی تو جھوٹ ہے محدود صرف انسان تک
وہ دور آئیگا جب آئینہ بھی بولے گا
پلا دو زہر اسے یا چڑھا دو سولی پہ
وہ شخص سچ کا پجاری ہے سچ ہی بولے گا
کھڑا تو پاپ کا کب کا ہی بھر چکا یارو
ملے گی کب یہ زمیں کب فلک یہ ڈولے گا
لبوں پہ جس سبب سے ہے فردوس مہر خاموشی
یقین ہے کہ وہ اک روز راز کھولے گا

عبدالقادر کلیم اندوری

گلوں کو چھوڑ کے کانٹے اٹھا سکو تو چلو
سکون قلب کو دشمن بنا سکو تو چلو
قدم قدم پہ محبت خراج مانگے گی
تم اپنے پیروں میں کانٹے سجا سکو تو چلو
تمام عمر ستمگر کا تر رہے دامن!!
تم اپنے آپ کو اتنا رلا سکو تو چلو
سنا ہے منزل مقصود پر اندھیرا ہے
تم اپنے خون کی شمعیں جلا سکو تو چلو
خود اپنی آگ میں جلنا کلیم آساں ہے
پرائی آگ میں خود کو جلا سکو تو چلو

صفدر امام قادری

سورج کو ناپ تول کے کاندھے پہ ڈال دے
اس طرح زندگی کو ہمارے سنبھال دے
رستہ بدل بدل کے جو منزل کو پا گئے
یہ دور ایسے شخص کو آگے اچھال دے
راتوں کی نیند دن کا سکون وقت کی بحث
میں سب کو بھول جاؤں مجھے وہ کمال دے
یہ روز و شب کے حادثے لمحات جاں گسل
مجھکو قرار دے یا غموں کو زوال دے
جو لوگ اپنے عہد کے آکاش ہوگئے
ان کی جڑوں کے بارے میں کوئی سوال دے

اعجاز ویشالوی

خلوص دل میں رواں بھی رکھنا
قدم کو اپنے جہاں بھی رکھنا
ملو اگر تم کسی سے دم بھر
لبوں پہ کچھ شوخیاں بھی رکھنا
حیات انساں کا کیا بھروسہ
بچا کے اپنا نشاں بھی رکھنا
ملے جو محفل میں آج تم سے
غموں کا اپنے بیاں بھی رکھنا
زمانہ اعجاز بدگماں ہے
کٹھن ہے خود کو جواں بھی رکھنا

لقمان شوق

چند لوگ تھے جو مہرباں ہوگئے
پھر تو ہم بھی دیوتا سمان ہوگئے
چیل کوؤں کے لئے کھلا رہا افق
خوشنما پرندے بے اڑان ہوگئے
کل ہوا کے پاؤں میں تھے دھول کی طرح
آج دیکھئے تو وہ چٹان ہوگئے
موجوں کا رویہ کچھ بھلا نہیں رہا
بس دعا کے ہاتھ بادبان ہوگئے
معجزہ نہیں ہے یہ تو اور کیا کہیں
حادثوں کے بیچ ہم جوان ہوگئے

غزلیں

سلیمان آرزو سروجی

زندگی چھین لے یا دے اُجالے مجھکو
اے خدا چھوڑ نہ دُنیا کے حوالے مجھکو
گر گئے تیغ میرے چاہنے والے مجھکو
کوئی تو یادوں کے پنجرے سے نکالے مجھکو
میں نے ہر وقت ہی گرنے سے بچایا تجھے
تجھ میں ہمت ہے تو گرنے سے بچالے مجھکو
تنگ دستی کا مرے لوگ اڑاتے ہیں مذاق
اتنا محتاج نہ کر آسماں والے مجھکو
ہاتھ آرزو کا کسی اور کے آگے پھیلے
اس سے پہلے مرے مالک تو اٹھالے مجھکو

رضا اشک

کبھی بھی نامۂ ماتم بچشم نم نہیں لکھا
کوئی بھی غم ہو لیکن میں نے اپنا غم نہیں لکھا
بہت لکھا ہے لکھنے والوں نے آدم کے [illegible]
کسی نے کھل کے ناگا سا کی تیرا غم نہیں لکھا
سدھارتھ کیطرح سب کچھ ہم اپنا چھوڑ آئے ہیں
مگر خود کو کبھی بھی آجتک گوتم نہیں لکھا
ملے لعل و جواہر بھی تو کیا موتی کے سوداگر
کسی پتھر کو میں نے آج تک نیلم نہیں لکھا
کبھی جو دیکھتا ہوں فن کے اس پھیلے سمندر کو
تو ایسا لگتا ہے یک قطرۂ شبنم نہیں لکھا

ظفر سروجی

ہر قدم منزل ہی منزل وہ ہنر چلنا بھی ہے
جلد کرلے فیصلہ اے ہم سفر چلنا بھی ہے
ہمسفر کی لغزش یہ منزل پہ لے آئی ہمیں
گھر نہیں اپنا کوئی اور گھر پہنچنا بھی ہے
دوستوں کے پاس سے اٹھ کر مرے نزدیک آؤ
بات بھی کرنا ہے تجھ سے مختصر چلنا بھی ہے
بیٹھ کر ان آبلوں سے مشورے کر لے ظفر
گرد راہ بن جاؤ گے تم اسقدر چلنا بھی ہے

امروز جہاں

کوئی آرزو ایک خیالِ خام ہے
زندگی ناکامیوں کا نام ہے
دیکھ لینا ہم فنا ہو جائیں گے
میرے غم کا بھی یہی انجام ہے
یہ تڑپ یہ کسک دل کی میرے
ایک نگاہِ یار کا انجام ہے
ڈھونڈتی ہوں اب کوئی راہِ فرار
ضبطِ غم میں دل مرا ناکام ہے
کھل کے اظہار تمنا کر دیا
اس لئے تو دل مرا بدنام ہے

مس سروری شفیع

اُجڑی ہوئی محفل کو سب مل کے سجائیں
سوئی ہوئی دُنیا کو سب مل کے جگائیں
تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے بزم ہماری
روتی ہوئی شمع کو سب مل کے ہنسائیں
بھٹکا ہوا مسافر جو راہ میں اکیلا ہو
اس تنہا مسافر کو سب مل کے بسائیں
جو نیند سے محروم ہوں شرتی آنکھیں
ان جاگی آنکھوں کو سب مل کے سلائیں
مدت سے مرے شعر تشنہ ہیں گرنجے
کھوئی ہوئی آواز کو سب مل کے ملائیں

عائشہ نکہت

آئینہ سامنے رکھو تو ذرا !
تم مرے عکس سے جھانکو تو ذرا
فرطِ جذبات میں بے خود ہو کر
تم مرے ہاتھ تھاما تو ذرا
اشک بن کر مرے مژگاں پہ ٹھہرو
میرا دامن بھی بھگو تو ذرا
تم مرے واسطے سایہ ہو مگر
دھوپ کے دشت کو آ کے تو ذرا
جن کی خاطر ہیں پریشاں آنکھیں
تم وہی خواب دکھاؤ تو ذرا
دور ہے منزل بہت نکہت
اپنی رفتار بڑھاؤ تو ذرا

معافی

شبیہ عباس جارچوی
8/A-28-A، الیر ایکسٹینشن کالونی۔ کراچی

علی بخش آج پورے ایک سال کے بعد گاؤں
ٹ رہا تھا۔ جب سے وہ پردیس میں کمانے گیا تھا وہ ہر
ہ اپنی نو بیاہتہ بیوی کو ایک معقول رقم گزارے کے
ے بھیجتا رہا تھا۔ اور خط تو وہ ہر ہفتے ہی بھیجتا تھا۔
یادہ سے زیادہ دیر ہوئی تو پندرہ دن میں تو اس
خط آیا ہی جاتا تھا۔ علی بخش کے ماں باپ اس کے
بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بڑی بہن تھی جس
شادی والدین نے اپنی زندگی ہی میں ایک ایسے
ہر میں کر دی تھی جو اُن کے گاؤں سے بہت دُور تھا۔
ماں باپ کے یکے بعد دیگرے اموات کے موقع پر بہن
ڑے تھوڑے عرصہ کے لئے اپنے آبائی گھر میں بھائی
پاس آکر رہی اور پھر واپس چلی گئی۔ علی بخش کا باپ
ان تھا۔ اور باپ کے مرنے کے بعد بیٹے نے بھی یہی
شروع کر دیا تھا۔ گاؤں میں تو [illegible] کام
ور زیادہ تر وہ [illegible] اور
چھوٹے بڑے پیڑھیاں، بچوں کے کھلونے اور
ول کی تختیاں اور ایسی ہی دوسری چیزیں [illegible]

قبل اپنی ترکھان کی دکان اپنے دوست انعام کو دے آیا
تھا۔ اور اس نے یہ دکان انعام کو فروخت نہیں کی تھی
بلکہ کرائے پر دی تھی۔ کیونکہ علی بخش کو معلوم تھا کہ وہ
ہمیشہ تو پردیس میں نہیں رہے گا۔ اور ایک نہ ایک دن
پردیس سے واپس آکر مستقل طور پر اسے اپنی اسی دھرتی
پر رہنا تھا اسی لئے اس نے دکان فروخت کرنے کے بجائے
کرائے پر دیدی تھی۔

علی بخش جیسے ہی اسٹیشن پر گاؤں جانے کے
لئے پلیٹ فارم سے باہر نکلا۔ اسے لیاقت کوچوان مل
گیا۔ لیاقت اس کے گاؤں ہی کا کوچوان تھا اور صرف
اسی صورت میں اپنا تانگہ جوڑ کر ریلوے اسٹیشن آتا تھا
جب [illegible] مسافر یا خواتین ریلوے
اسٹیشن [illegible] کرتے۔ گاؤں اتنا چھوٹا
تھا کہ وہاں سے مستقل طور پر سواریاں نہیں ملتی تھیں۔
لیاقت [illegible] گھر میں بیڑیاں بناتا تھا اور [illegible] دن میں

گاؤں سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر پکی سڑک تھی۔ جہاں سے لاریاں اور تانگے وغیرہ گذرتے تھے اور عام آنیوالوں کو وہاں سے گاؤں تک پیدل اور گاؤں سے وہاں تک پیدل جانا ہوتا تھا۔ علی بخش لیاقت کو دیکھتے ہی اس کے گلے لگ گیا اور معانقے کے بعد تانگے میں بیٹھ گیا۔ "کہو یار اسٹیشن کیسے چھوڑنے آئے تھے" علی بخش نے لیاقت سے پوچھا۔

"ارے علیا" سائیں غلام نبی اپنی بیوی بچوں کو لیکر ایک ہفتہ کے لئے اپنے سسرال گیا ہے اُسے چھوڑنے آیا تھا۔" لیاقت نے جواب دیا۔ "اور علی بخش تم کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہو"۔ لیاقت نے پوچھا۔

"یار ایک مہینے کی چھٹی لیکر آیا ہوں" علی بخش نے بتایا۔

علی بخش مدت سے ایک ایجنٹ کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ اُسے وہ ملازمت کے لئے باہر بھجوادے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایجنٹ کو کئی ہزار روپے بھی دیئے تھے۔ لیکن وہ ایجنٹ اسے ہمیشہ بہلاوا دیتا رہتا تھا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ علی بخش کی شادی کے پندرہ دن بعد ہی وہ ایجنٹ اُس سے ملا اور اسے کہا کہ وہ دس دن کے اندر باہر جانے کی تیاری کرلے بصورت دیگر جو ملازمت اسے ملی ہے وہ اس پر کسی اور کو بھیجدے گا۔ اور علی بخش کو دوبارہ ملازمت پر بھیجنا اس کی ذمہ داری نہ ہوگی۔ مجبوراً علی بخش کو اپنی نوبیاہتہ بیوی کو شادی کے پچیس دن کے بعد چھوڑکر ملازمت پر بیرون ملک جانا پڑا۔

سے چھپائی یہ بات کا اسے معلوم تھا کہ شادی کے بعد اتنی جلدی وہ بیوی کو چھوڑ کر دور دیس جا رہا تھا۔ بیوی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ اب وہ بھی بہت سے دوسرے باہر جانے والوں کی طرح بہت سی دولت کما کر لائیگا۔ اور پھر ان کے دن بھی پھر جائیں گے۔

علی بخش کے بہن بہنوئی جس شہر میں رہتے تھے، وہاں علی بخش کے بہنوئی کی بڑے بازار میں تین دکانیں تھیں۔ جن میں سے ایک پر اس کا بہنوئی خود بیٹھتا تھا۔ اور دو اس نے کرائے پر دے رکھی تھیں۔ بہنوئی نے علی بخش کو کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ گاؤں کی دکان اور مکان فروخت کر کے ان کے پاس آ جائے لیکن علی بخش اس بات کو اس لئے نہ مانتا تھا کہ ایک تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ان میں سے ایک دکان خرید لے۔ شہر میں رہائش بھی اختیار کرتا اور دوسرے وہ اپنی طبیعت سے بھی اپنے گاؤں کو چھوڑ کے جانا نہیں چاہتا تھا۔

اب ایک سال باہر کما کر آنے کے بعد بھی اگرچہ اس کے پاس خاصی رقم جمع ہو گئی تھی لیکن اب بھی وہ اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ بہن کے شہر میں ان دکانوں میں سے ایک دکان بآسانی خرید لیتا۔

۲ علی بخش اور لیاقت سارے راستے باتیں کرتے رہے۔ لیاقت اُسے گاؤں کے حالات بتاتا رہا۔ اور علی بخش اسے اُس ملک کی باتیں بتاتا رہا جہاں وہ ملازم تھا۔ علی بخش نے اپنے دوست انعام، جس کو وہ اپنی دکان کرائے پر دے گیا تھا، کے متعلق لیاقت سے



[illegible]
[illegible] سامنے یہ چکر آ کر دیا کہ اُسے
[illegible] یاد آ گیا ہے۔ اس لئے اسے
[illegible] گھر جانا ہے اور یہ کہ علی بخش یہاں سے اپنے گھر
[illegible] جائے۔ مجبوراً علی بخش اسے کرائے کے پیسے
[illegible] اٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔
[illegible] انعام کی دکان پڑتی تھی علی بخش نے سوچا کہ
[illegible] ہے کہ تھوڑی دیر دکان پر بیٹھ کر انعام
[illegible] جائے لیکن انعام کی دکان بند تھی۔
[illegible] ایک بزرگ کھڑے تھے۔ ان سے علیک
[illegible] باتوں باتوں میں علی بخش نے انعام کا
[illegible] پوچھا تو انہوں نے ادھر ادھر
[illegible] ختم کر دیا اور علی بخش ان سے
[illegible] روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک [illegible]
[illegible] رہی گفتگو [illegible]
[illegible] علی بخش نے دروازے کا کھٹکا کھٹکھٹایا
[illegible] انعام کو اس طرح گھر میں [illegible]
[illegible]

تھوڑی دیر کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انعام رخصت ہو گیا۔ انعام کے گھر سے جاتے ہی زرینہ علی بخش کے قدموں میں گر گئی اور بولی "میں اپنے اعتماد کو برقرار نہ رکھ سکی۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔" زرینہ کی گڑگڑاہٹ جاری تھی اور علی بخش خاموش بیٹھا تھا اور سوچ میں گم تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد علی بخش نے زرینہ سے کہا: "اچھا تم تھوڑی دیر گھر میں بیٹھو میں باہر سے ہو کر آتا ہوں۔"

زرینہ خوفزدہ ہو کر گھر میں بیٹھی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں علی بخش پھر لیاقت کے سامنے کھڑا تھا۔ علی بخش نے لیاقت سے تانگہ جوڑنے کے لئے کہا۔ پہلے تو لیاقت نے اس کی باتوں کو مذاق سمجھا لیکن جب علی بخش کو سنجیدہ دیکھا تو اس نے [illegible] اور تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں [illegible] کے تانگے میں اپنے جملہ سامان [illegible] اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے [illegible] ہندوستان کے شہر جا کر مستقل سکونت [illegible]


چمکتی سفیدی
کپڑے کی
مودی
دھلائی کا صابن
پنجاب سوپ فیکٹری
کینال ویسٹ روڈ کلکتہ


زبانِ خلق
ہر گھر میں ہمہ وقت
موجود رہنا ضروری ہے۔
ہندیل
جو ہر طرح کے
جسمانی درد۔ زخم
چوٹ۔ ورم۔ جلے۔ کٹے کا
مشہور علاج ہے۔
نیز کمزور بچوں کو طاقتور بناتا ہے۔
روغن سرخ اصلی
درد، زخم
چوٹ، ورم
جلنے کٹنے
کے لئے
Surkh
سرمہ مقوی نظر
آنکھوں کی خوبصورتی
بینائی کا محافظ
ہند سالٹ

قاسم خورشید

منی کہانیاں

(1) تجارت

پیارے دوست!

تم بہت ناراض ہو گئے

میں تمہاری شادی کے موقع پر حاضر نہ ہو سکا۔ تم نے اپنی دوستی کا حوالہ بھی دیا تھا۔ ہم بیس برسوں تک ایک ساتھ رہے۔ پھر بھی ایک خلش مجھے تم سے کسی سطح پر دور رکھے رہی۔ ہم دونوں نے اپنا تعلیمی سفر ایک ساتھ شروع کیا تھا تم بہت آگے نکل گئے اور میں ایک خاص مقام پر جا کر رک گیا بلکہ مجھے رکنا پڑا۔ تم جہاں ٹیوٹر تھے وہ ایک کروڑپتی آدمی کا گھر تھا۔ اس کی بدصورت لڑکی عنبر تمہیں چاہنے لگی تھی تم بی اے پاس کرنے کے بعد ہی شادی کے بندھن میں بندھ گئے تم اس سرمایہ دار کے داماد تو ہو گئے لیکن ہمیشہ سہمے رہتے، اس لئے بھی کہ تم دونوں نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ بعد میں عنبر کے باپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی کامیاب زندگی کے لئے تمہارے کیریئر کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تم ان کے لئے سب کچھ ہو گئے۔ اور پھر شہرت کی بلندیوں کو بھی چھونے لگے۔ ان کا سب کچھ بیٹی کے لئے ہی تھا۔ شاید اس لئے بھی تم بہت سعادت مند ثابت ہوئے تھے۔ اور دھیرے دھیرے میری زندگی سے دور چلے گئے تھے ....

تمہارے بہت اصرار پر عنبر نے اپنی ساری دولت تمہارے نام لکھ دی .... یہ سب کچھ ہوتا رہا....... تم مجھے خط لکھتے میں جواب دیا کرتا ...... اور اسی دوران تم نے خبر دی کہ عنبر اپنے پاپا کے ساتھ جنگلی علاقے میں بذریعہ کار سفر کر رہی تھی کہ اچانک ان کی کار گہری کھائی میں جا گری وہ سب ہمیشہ کے لئے ...... حالانکہ اس سفر میں تم ان کے ساتھ تھے لیکن موونگ کیمرے سے ان کو چلتی ہوئی کار کی تصویر لینے کے بہانے ایک چھوٹی سی پہاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ تب ان کی کار اپنی رفتار سے اسی کھائی کی طرف جا رہی تھی جہاں جگہ جگہ پر خطرہ تھا اور پھر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت وہی ہوا جو تم ...... دیکھو برا مت مانو، تم کہا کرتے تھے نا! ہمارے دو جسم ہو سکتے ہیں لیکن جان ایک......

خیر جو حادثہ ہونا تھا ہوا۔ موت تو کسی وقت بھی آ سکتی تھی کیا نہیں، تمہیں ساری دولت مل گئی اور صرف ایک ماہ بعد ہی تم نے اپنے کالج کی خوبصورت کلاس فیلو زبیدہ

سے شادی رچالی ۔

آج میں بہت خوش ہوں کہ تم مجھے جہاں پر چھوڑ کر گئے تھے میں وہیں پر کھڑا ہوں ۔ تمہارا

رضوان

—— ۰۰ ——

(۲) بلیک آوٹ

سارا شہر سہما ہوا تھا ۔

رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی سائرن کی آواز بعد سے ماحول پر حاوی ہو گئی ۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر کے اندرونی حصے کو بھی تاریک کرنے لگے ۔ ہر تھوڑی دیر بعد کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے زبردستی انہیں رونے سے روک دیا ہو ۔ کچھ کچھ وقفے کے بعد کوئی اعلان کر رہا تھا کہ ــــ " جنگ پھر شروع ہو گئی ہے ، دشمن کسی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے اس لئے کسی بھی گھر سے روشنی نہیں پھوٹنی چاہئے ، بالکل بلیک آوٹ ، کسی کو زوردار آواز سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے "

پھر ہوائی جہاز آسمان میں تیرتا ہوا زوردار آواز کے ساتھ گذرتا ، کبھی کبھی دور سے دھماکے کی آواز بھی سنائی دیتی ۔ اور پھر دیر تک خاموشی چھائی رہتی ۔ ہم سب ہر پل موت کے منتظر تھے ۔ زندگی کی وہ سب سے بھیانک رات کسی طرح گذری ۔ صبح ہوتے ہی کہرام ہوا ہر شخص ماتم کرتا ہوا اپنے اپنے گھر سے باہر نکل رہا تھا ــــ

کہا جاتا ہے کہ ہمارے شہر میں اس رات ایک ساتھ دس ہزار گھروں کو لوٹا گیا تھا ــــ جبکہ ہم سب دشمنوں کی بمباری سے بچ گئے تھے ۔

—— ۰۰ ——

تب میں خاموشی کی تصویر بن گیا۔ اور وہ مجھے سلام کرکے تیزی سے بھیڑ کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن ثبوت کے میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

—— o ——

۱۲ غنڈہ

"تمھیں شرم نہیں آتی؟ کل ہی تین سال بعد سزا کاٹ کر لوٹے ہو اور پھر فساد میں حصہ لینے لگے۔"

"صاحب شرم کیسی؟ آپ جو یہ پولس کی خطرے والی نوکری کرتے ہیں اپنے پریوار کے لئے ہی نا؟"

"تو محنت کیا کر محنت ....."

"دیکھئے میں جو کام کرتا ہوں اسے آپ نہیں کرسکتے اور آپ جو کام کرتے ہیں اس سے مجھے کیا کام؟ ویسے آپ کی نوکری کے لئے بھی میرا ہونا ضروری ہے۔"

"شٹ اپ! میں تمھیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی گذارنے کے لئے کوئی صحیح راستہ اپناؤ، ورنہ ایک دن پولس کی گولیوں کی زد میں آکر مارے جاؤ گے، پھر تمہارے پریوار کا کیا ہوگا؟"

"ہماری برادری میں بنا اصول کے کام نہیں ہوتا۔ میں جن کے لئے کام کرتا ہوں انہوں نے میری بیوی بچوں کے نام کافی روپے بینک میں جمع کردیئے ہیں۔ اگر ان کا قرض نہیں چکایا تو پھر ان کی گولی کا شکار ہو جاؤں گا ویسے بھی نمک حرامی ہماری فطرت نہیں۔"

بہار میں
بیس نکاتی پروگرام کے تحت
غیر معمولی اور امتیازی کامیابیاں
اپریل ۱۹۸۶ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء

- ۵۲۲،۳۱۵ خاندانوں کو اقتصادی امداد کی گئی۔ قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین روزگار گارنٹی پروگرام کے تحت علی الترتیب ۱۹۵۰۲۲ لاکھ اور ۸۸ لاکھ یوم مزدور کو ریکارڈ کیا گیا۔
- ۴۴۳۷ ایکڑ فاضل زمین کی تقسیم کی گئی۔
- ۱۹۱،۹۲۷ شیڈول کاسٹ اور ۱۴۳۷۱ شیڈول ٹرائب کے خاندانوں کو اقتصادی مدد کی گئی۔
- ۴۰۶۸، ۱۴ گاؤں میں پینے کے پانی کی سہولت مہیا کرائی گئی۔
- ۴۰۸ ،۱۴ پلاٹ بے گھر لوگوں کے بیچ تقسیم کیے گئے۔
- ۱۲۸ ۲۵ خاندانوں کو فوائد بہم پہنچائے گئے۔ کمزور کلاس کے لوگوں کے لیے ۳۱۵۴ رہائش گاہ کی تعمیر کی گئی۔
- ۶۱۷۴ پمپ سیٹوں کو بجلی سپلائی اور ۳۴۱۶ گاؤں میں بجلی پہنچائی گئی۔
- ۱۱،۷ ۲ کروڑ روپے لگائے گئے۔ ۲۶۱۷ بائیو گیس پلانٹ قائم کیے گئے۔
- ۱۱ پرائمری ہیلتھ مراکز اور ۱۶۵ ہیلتھ سب سنٹر کا قیام
- پہاڑی اور آدی باسی علاقوں میں اکتالیس گشتی دکانیں کھولی گئیں۔
- ۶۱۵ ۴ نئی ہنر اور مصوری کے کرافٹس کی اکائیوں کا قیام عمل میں آیا۔
- فیملی ویلفیر پروگرام کے تحت ۱۱ ۳، ۴۶، ۱ لوگوں نے نس بندی کرائی۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار
IPRD N. 511-D (INF-295)
86-87

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

"سہیل" کا "ادریس سنبہاروی نمبر" ملا۔ یہ نمبر نکال کر آپ نے اُردو کے ایک قابلِ تعظیم مجاہد کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنت مکانی ادریس سنبہاروی کی وفات کا صدمہ آپ کے لئے تو اس وجہ سے جانگسل ہے کہ وہ آپ کے والد تھے لیکن پوری اُردو دُنیا ان کے غم میں اس لئے سوگوار ہے کہ اُردو زبان و ادب پر ان کے ناقابلِ فراموش احسانات ہیں۔ بہار اُردو اکاڈمی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو بعد از مرگ تین ہزار روپے کا خصوصی ایوارڈ دیکر اس زبان کے محسن کو پہچاننے کا ثبوت دیا ہے جس کے فروغ کے لئے اس اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اور آپ نے "سہیل" کا خاص نمبر شائع کر کے نہ صرف یہ کہ ایک فرض بھی پورا کیا ہے جو اُردو کے صحافی ہونے کی وجہ سے آپ پر عائد ہوتا تھا۔ یہ نمبر کئی ایسے مضامین سے مزین ہے جن سے مرحوم کی گراں قدر خدمات اور لائقِ تکریم شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ آئندہ نسلوں کو ادریس سنبہاروی مرحوم کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے سلسلے میں اس نمبر سے بڑی مدد ملے گی۔ اختر بستوی۔ گورکھپور

عزیزانِ گرامی! "سہیل" کا ستمبر اور اکتوبر کا مشترکہ شمارہ "ادریس سنبہاروی نمبر" موصول ہوا۔ آپ نے محدود وسائل، گرانی اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اچھی کتابت و طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ ایک سو چودہ صفحات پر مشتمل "سہیل" کا یہ مشترکہ خاص شمارہ جس کی قیمت صرف چار رکھی گئی ہے، آپ دونوں بھائیوں کے عزم و حوصلہ کی ایک روشن دلیل ہے۔ ادریس بھائی مرحوم کی ادبی، سیاسی اور صحافتی زندگی پر ترتیب دیا ہوا یہ رسالہ مختصر سہی لیکن جو مواد اس میں شامل ہے اس سے مرحوم کی سوانح، ادبی نظریات اور صحافتی خدمات پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔

جناب بہزاد فاطمی نے اپنے مضمون "حق مغفرت کرے" میں مرحوم کی انسان دوستی اور مہمان نوازی کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ ان کے افرادِ خانہ کے ذہنوں میں ادریس مرحوم کی یاد آج بھی تازہ ہے اور تازہ رہے گی۔

ڈاکٹر تارہ چرن رستوگی نے مرحوم کو مندرجہ ذیل الفاظ میں یاد کیا ہے: "ادریس سنبہاروی اُردو زبان و ثقافت کے بے لوث و خاموش خدمت گزار تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور اسے فروغ دینے کی مساعی جمیلہ کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی۔"

جناب شفیع مشہدی نے لکھا ہے "ادریس مرحوم صرف اپنے لئے زندہ نہیں رہے [illegible] مضمون کا [illegible] زندگی [illegible] ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا کہنا ہے کہ

مرحوم نے ہمیشہ دوسروں کو آگے بڑھایا، انہیں عزت اور شہرت دلائی اور خود کچھ نہیں لیا۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے مرحوم کے اداریوں کے آئینے میں، ان کے فن اور شخصیت پر ایک وقیع اور معلوماتی مضمون مرتب کیا ہے۔ اور اس پر بڑی محنت کی ہے۔ ان کو ایک ایسا کامیاب صحافی بتایا ہے جس نے کبھی بھی اشتعال انگیز شذرات کے ذریعے قاری کے جذبات سے کھیلنے کا راستہ نہیں اپنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرحوم کے ذہن میں سیاست و معاشرت اور تمدن و تہذیب کی کچھ متعین قدریں تھیں۔ ڈاکٹر حالی نے مزید فرمایا ہے کہ سامراجی طاقتوں کا استحصال، استعماریت، مذہبی عصبیت لسانی مناقشے، ذات پات کے جھگڑے اور وہ مسائل بھی اور وہ مسائل جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے مرحوم کے پیش نظر تھے۔ اور وہ ان کے حل کے لیے عملی اقدام کی نشاندہی بھی اپنے اداریوں میں کیا کرتے تھے۔

آج کے سیاست دانوں اور دانشوروں کی اکثریت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ موجودہ ہندوستان میں تیزی سے پھیلنے والے فرقہ وارانہ فسادات، لسانی جھگڑوں، طبقاتی کشمکش اور اس طرح کے دوسرے مسائل کے پیچھے بیکاری، بیروزگاری اور غربت کا ہاتھ ہے۔ ادریس مرحوم اس نتیجے پر بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور اس سلسلے میں وہ برابر لکھتے رہے۔ احمد آباد میں پانچ سال سے جاری فرقہ وارانہ فسادات اور یوپی کے کئی صنعتی شہروں اور علاقوں میں جہاں اقلیتی افراد معقول تعداد میں برسر روزگار ہیں فرقہ وارانہ جھگڑوں کے پیچھے روزی روٹی کا مسئلہ ہے اگر اسے حل کر دیا جائے تو یہ جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو جائیں گے۔ ادریس بھائی نے اپنے اداریوں میں اس کا بار بار ذکر کیا ہے اور حکومت کو اکثر اس کا احساس دلاتے رہے۔

بدقسمتی سے اپنے وطنِ عزیز میں مسائل پیدا ہوتے نہیں ہیں بلکہ پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں عام آدمی کی مشکلات بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

گاندھی جی کا نظریہ اپنی جگہ پر لیکن ان کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان کسانوں کا ملک ہے اور یہاں کی تاریخ ہل کی نوک سے لکھی جا رہی ہے۔ ادریس مرحوم نے اپنے ایک اداریئے میں یہی بات کہی ہے۔ اداریئے کا اقتباس ہے:

"سچا ہندوستان، یہاں کے نادار طبقہ میں ہے۔ اس لئے ناداروں اور گاؤں والوں کے لئے مثبت قدم نہیں اٹھایا جاتا تو یہ ساری چمک دمک بیکار رہے، شہری ترقیوں کو ثانوی حیثیت دینی چاہیے"

لیکن اب نہیں ہو رہا ہے۔ سامراجی قوتیں آزاد تجارت [illegible] نت معنبوط سے مضبوط تر کرتی جا رہی ہیں۔ ایک طرف چند سرمایہ دار اور نو دولتئے استحصال کے سائے میں جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کی آدھی آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ آج کا ہندوستان مخالف سمت میں جا رہا ہے جسے صحیح قرار دینے کے لئے طرح طرح کے سوانگ بھرے جا رہے ہیں۔ یہ عمل آدمی آدمیوں کی پریشانیوں میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔

بھائی ادریس مرحوم کے ادبی نظریوں پر بھی' ان کے اداریوں کی روشنی میں' ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرحوم کے ادب کے منفی رویوں کے بھی شدو مد کے ساتھ مخالفت کرتے رہے اور ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا ہے جو عوامی زندگی سے ہم آہنگ ہو۔ داخلی کرب کی آہنی زنجیریں' ادب کے پیروں میں ڈال کر اسے حقیقت کی راہ سے دور تصنع کے گھروندے میں قید کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ادب کو ایک معمہ بنایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر حالی نے ادریس مرحوم کے اداریوں کے آئینہ میں ان کے فنی نظریات کے اور بھی گوشے اجاگر کئے ہیں۔ جناب نشاط الایمان' ڈاکٹر رونق ناظمی' جناب کمال جعفری' جناب فیاض حالی' جناب مولانا ہیبا صدیقی اور جناب نظام الدین احمد نے مدیر مرحوم کے اعلیٰ ذوق' بلند اخلاق' وضع داری' عمدہ سلوک' خاطر داری اور احباب کے لئے ان کی فراخدلی اور ایثار پر صاف ستھرے مضامین لکھکر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ نظام الدین احمد نے لکھا ہے کہ جو لوگ اردو کی ترویج و ترقی کے پردے میں اپنا الّو سیدھا کرنے کی سازش میں لگے رہتے تھے' ادریس مرحوم نے انکی مخالفت کی اور حتی المقدور ایسے اردو دشمنوں کا پردہ فاش کیا۔ کرب میں ڈوبی شاکر گیاوی اور قیوم خضر کی تعزیتی نظمیں ادریس مرحوم سے ان کے قلبی لگاؤ اور محبت کی ترجمان ہیں۔

اور آخر میں نمود کے تحت لکھے گئے ان کے اداریے کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس میں مرحوم نے اس خطرے سے آگاہ کیا ہے جو آج ہمارے سامنے ہے۔ یہی نہیں انہوں نے بڑھتی ہوئی مذہبی اور لسانی تنگ نظری اور جدید تکنیک اور ہتھیاروں سے لیس فرقہ پرستی کے خلاف متحد ہونے کی تلقین کرتے ہوئے ادب کی جو راہ متعین کی ہے' مجھے امید ہے کہ آج کا ذہین فن کار اور زیرک قاری اس سے پورا پورا اتفاق کریگا۔ :

"حالات کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا وقت ہے' سماجی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کا وقت ہے۔"

"ہر اس مثبت قوت سے رشتہ جوڑنے کا

وقت ہے جو فن، تہذیب اور آزادی
کی علامت ہیں"
ورنہ۔ "ادب، فن اور تہذیب پر حملے ہوتے
رہیں گے۔ امن، آزادی اور انسانیت
موت کا شکار ہوتی رہے گی اور ــــ
زکی انور کے قتل کا سلسلہ جاری رہیگا۔"
(ادریس سنسہاروی مئی ۱۹۷۶ء)

اُمید ہے کہ مرحوم ادریس سنسہاروی سے محبت کرنیوالوں کے قلم معجز رقم سے مرحوم کے ادبی کارناموں پر آئندہ بھی عمدہ اور معلوماتی مضامین سُہیل کے صفحات پر پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ حسن نجمی سکندرپوری

"ادریس سنسہاروی نمبر" نظر نواز ہوا۔ فوٹو دیکھ کر اور مضامین پڑھ کر ایک عجیب سی تڑپ ہوئی اور از حد صدمہ ہوا۔ اور پھر زخم ہرے ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا موج زن ہو گیا۔ اور دل نے کہا آہ کاش نہ ہوتے! مضامین اپنے اپنے انداز اور قرینے سے بہتر ہے۔ مگر کسی نے بھی پوری زندگی کی عکاسی نہیں کی ہے۔ تمہاری کاوش قابلِ صد ستائش ہے۔ اس دور میں ادبی رسالہ جو زیادہ تر خشک ہی ہوا کرتا ہے نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔
ایس جلیل احمد یکجہتی

سُہیل کا "ادریس سنسہاروی نمبر" ملا۔ مضامین پڑھ کر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مرحوم سے میں تعلق میں بالکل انجان تھا۔ مضامین پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ادریس صاحب نیک ہمدرد اور صاحب کردار شخص تھے۔ اللہ انھیں نیکیوں کا اجر دے۔ آمین۔

محترم حسن نعیم صاحب نے اپنے تعزیتی خط میں سہیل کو "شاعر" کی طرح modernised کرنے کا جو مشورہ دیا ہے بہت اچھا ہے ممکن ہو سکے تو بہت جلد اس پر عمل کیجئے تاکہ سُہیل ہر عہد تابندہ و درخشاں رہے۔ سہیل کو اچھے قلمکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ سہیل کی کتابت و طباعت کو معیاری بنایئے۔ اور ترقی پسندی اور جدیدیت کا امتزاج سُہیل سے جھلکے۔ منصور اعجاز، ایوت محل

ادریس نمبر کے تمام مضامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ ادریس بھائی مرحوم سراپا مخلص، دردمند، اور مرنجان مرنج ملنسار دماغ کے مالک تھے۔ ان کے اس چشمۂ شرف اور خوبی سے جس کو جو حصّہ ملا اس پر ہر قلمکار نے برملا اپنے تاثرات اور جذبات کا اظہار کیا ہے اور اسی سے ہم واقف ہو جاتے ہیں کہ ادریس بھائی مرحوم کس بلند درجہ کے انسان تھے۔ اللہ کرے ہم لوگ انکے نقوشِ بہاراں، انسان دوستی اور ایثار کو کبھی نہ بھولیں اور سہیل کو انکی محبت اور وفا کا

ترجمان بنا کر رکھیں۔ نشاط ایمان۔ کلکتہ

سہیل کا تازہ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۸۶ء مشترکہ طور پر ملا۔ یہ خصوصی شمارہ ادریس سنہاردی کے نام ہے۔ آپ کا یہ اقدام قابلِ ستائش ہے۔ ضروری تھا کہ ادریس مرحوم کے نام سہیل کا ایک شمارہ مختص ہو جیسے اردو زبان کی یہ روایت رہی ہے کہ زندگی میں فن کاروں سے بے اعتنائی اور بے توجہی ہوتی ہے اور موت کے بعد آٹھ آٹھ آنسو بہائے جائیں۔ مردہ پرستی کی یہ روایت اگر زندہ ادیبوں اور فن کاروں کی زندگی میں عام کردی جائے تو یقین ہے کوئی بڑا کام ہو۔ اور وہ شخصیتیں جو جیتے جی معدوم ہو گئی ہیں ان کا پُرسشِ احوال بھی ہو

اپنے دیوانے پر اتمامِ کرم کر یا رب

مشمولات میں جن لوگوں کے مضامین، قطعات رباعیات اور نذرانۂ عقیدت پیش کئے گئے ہیں ان سے ادریس مرحوم کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ویسے موصوف کے لئے جو بھی لکھا جائے کم ہے لیکن ہدیۂ خلوص کا کوئی پیمانہ نہیں۔ بہرحال یہ ناکافی ہو کر بھی کافی وشافی ہے۔ اور خلوص تو ایک ہی جملے سے پہچانے جاتے ہیں۔ مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، بہزاد فاطمی، ڈاکٹر مشتاق رضوی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، متین شاہد، تیغ مشہدی، ڈاکٹر روحی قاضی وغیرہم کے مضامین بہترین نذرانہائے عقیدت ہیں۔ گرچہ تمام مضامین تاثراتی اور مرحوم کی شخصیت کے حامل ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مشتاق رضوی اور علیم اللہ حالی کے مضامین منفرد نوعیت کے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے ادریس صاحب کی شخصیت، فکر و نظریات سے متعلق لکھتے ہوئے اپنے آزادانہ اظہار خیال بھی پیش کئے ہیں۔ ضروری تھا کہ دوسرے اہلِ نظر بھی انکی شخصیت پر لکھتے وقت تنقید و تفکر سے کام لیتے۔ تمام مضامین یکسانیت کے شکار اور تکرار کے بیمار ہیں۔ ان مضامین کے تحت ادریس سنہاردی کی شخصیت کی جو تصویر بن کر ابھرتی ہے وہ ترقی پسند نظریات کے مبلغ، نرم گو اور پُرخلوص انسان کی اور بس! لیکن ان کے علاوہ بھی ادریس سنہاردی اور بہت کچھ تھے۔ جس انسان نے اپنی ۶۲ سالہ زندگی علم و ادب، صحافت اور خالص ترقی پسند نظریات کے لئے وقف کردی تھی ان پر صرف شخصی نوعیت کے مضامین لکھنا کافی نہیں۔ اب لازمی ہے کہ ان کی تحریکی، علمی، ادبی، صحافتی اور انسان دوستی پر بھرپور تنقیدی و تجزیاتی مضامین لکھے جائیں۔ ہماری اکاڈمی ان کے اداریئے، مضامین کے علاوہ اہلِ قلم حضرات سے مضامین لکھوائے اور کتابی صورت میں شائع کرے۔ کم از کم زبان و ادب کا ایک شمارہ بھی ان کے نام مخصوص ہو۔ بہار اردو اکاڈمی نے انہیں پس مرگ تین ہزار روپیے کا ایوارڈ دیا جو حقیر سی رقم ہے۔ کیا اردو کے ایک مخلص کا یہی صلہ ہے؟

خیر! خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ اگر موقع ملا۔

ماہنامہ سہیل، گیا

تو ان مضامین کی روشنی میں ادریس مرحوم پر ایک مضمون لکھوں گا۔ میں ایسا قسمت والا کہاں تھا کہ جیتے جی مرحوم سے ملاقات کر سکتا۔ ملاقات کی شدید خواہش تو تھی مگر وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور داغ مفارقت میرے حصّے میں آئی۔ واحسرتا!

قیصر زماں قیس۔ گریڈیہہ

سُہیل کی ۲ دو کاپیاں مجھے مل گئیں۔ اس میں خاص کام بھی شامل ہے جو کہ آپ کے والد محترم کے نام سے موسوم ہے، حالاں کہ یہ سانحہ اب نیا نہیں ہے لیکن بہت سے غم، بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔ یہی یادیں ہمیں جینے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ دلوں میں پیدا کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے اس یادگار موقع پر اتنا شاندار نمبر نکالا ہے اور جناب ادریس صاحب کے شایان شان خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ عظیم کارنامہ ہے جو لائق ستائش ہے۔ میری طرف سے اظہارِ افسوس کے ساتھ ساتھ نیک خواہشات بھی قبول فرمائیں۔

عائشہ علوی جھنجھانوی۔ مظفر نگر

ادریس سنبھاروی نمبر نظر نواز ہوا۔ لوگ کہتے ہیں خدا اپنے اچھے بندوں کو جلد بلا لیتا ہے۔ محترم ادریس مرحوم کے اس دنیا میں نہ رہنے

سے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ خدا کو ا[س] انسانوں کی ضرورت ہے لیکن یہ دنیا وا[لے] کریں گے؟

جن اہل قلم حضرات نے مرحوم کے بارے [میں] خیال فرمایا ہے اس سے ان کی شخصیت [کے] پہلو روشن ہوتے ہیں۔ جو اپنی ذات میں ا[یک] تھے۔

اُن کے اداریوں کے مطالعے سے معلوم [ہوتا ہے کہ وہ] ایک صاحب نظر، تجربہ کار اور علم و ادب [کے] شیدائی اس دنیا سے اٹھ کر کسی اور جگہ [چلے گئے] جہاں سے اب وہ نہ لوٹ سکیں گے۔ سہیل ا[ب] ان کی یادوں کا تاج محل ہے۔ اس کے اوراق یادوں کے نقوش ہیں۔ اس کے ہر شمارے [میں] یادوں کے چراغ ہیں۔

وہ عظیم نہیں تھے، جس معنی میں دنیا [کسی] کو عظیم سمجھتی ہے لیکن جن حالات میں انہوں [نے] اپنا خونِ جگر دے کر سہیل کو زندہ ر[کھا] دنیا کے لئے وہ کچھ نہ رہے ہوں، اردو کے [لئے] وہ بہت کچھ تھے۔

نمبر ہر طرح سے کامیاب ہے۔ یہ [کہ] آپ نے حق ادا کر دیا ہے۔

مخلص: نسیم بن آسی


مٹھائیاں
اور
مافیاں



سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
چاند تارا مارکہ

■ P. O. : Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3[illegible]/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya-82[illegible]
years of Publication Phone : 21573

ماہنامہ
سہیل
گیا

اس شمارہ میں

● ملک کے نامور تنقید نگار اور محقق ڈاکٹر برج پریمی کا مقالہ "شہر لالہ و گل" ● جناب شعیب عثمان صاحب کا مقالہ "غالب راجستھان میں" ● نامور افسانہ نگار خورشید ملک کی کہانی "ایک سوال" ● جناب نسیم بن آسی کی کہانی "عورتوں کا معدہ" ● بھارت کے مشہور و معروف انشائیہ نگار جناب عابد معز کا انشائیہ "خوشحالی کا تکون" ● قاضی انصار، ڈاکٹر فریدہ کول اور نقیب اکبر کی منظومات ● "سہیل" نومبر ۸۵ء کے شمارہ میں شائع شدہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مضمون "قاضی عبد الودود اور میں" کے سلسلے میں جناب رونق شہری، جناب ابو محمد شبلی اور جناب مناظر عاشق ہرگانوی کے خطوط "شہر خیال" میں۔

چ ۱۹۸۶ء قیمت ۲/۵۰ روپے



JRI
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اور مضبُوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
[illegible] MASJID [illegible]

بانی نگراں: حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنہاروی ـــــ بیادگار: زین العابدین قمر دادلی سنہاروی

ماہنامہ

سُہَیل گیا

مارچ ۱۹۸۷ء

فون نمبر ۲۱۵۷۳

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر	مجلسِ مشاورت	شمارہ ۳ جلد ۴۹
ایڈیٹر: جمیل منظر	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	بدل اشتراک: فی شمارہ ۲/۵۰ روپے
معاونین: شکیل احمد جمالی	ڈاکٹر قمر رئیس	زر سالانہ: ۳۰ روپے
عبدالقیوم ابدالی	اصغر علی انجینیر - ڈاکٹر برج پریمی	لائف ممبری: ۵۵۱ روپے

○ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل - ریور سائیڈ روڈ - گیا ○

(نمود)

تعطّل یا تجدیدِ حیات

اُردو اَدب میں اِدھر پانچ سات برسوں سے تعطل کی ایک فضا پائی جاتی ہے متعدد اہلِ فکر و نظر نے اِس کیفیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اہلِ قلم حضرات کی ایک جماعت اس جمود کو توڑنے کے لئے جد و جہد کر رہی ہے۔ مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آرہا ہے، یہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے!— اس کی حد کیا ہوگی؟

ہم اس کا تجزیہ کچھ یوں کرتے ہیں کہ جدیدیت بردوش شعر و اَدب نے بے سمتی کی غیر فطری اور مصنوعی فضا پیدا کر دی تھی اور شعر و ادب کے مقاصد کو مسلسل مسخ کرنے کی مہم چلا دی تھی۔ اس سحرِ سامری میں متعدد باصلاحیت مگر سادہ دل فن کار بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دس پندرہ برسوں میں ساری کا پورا سامان ہو چکا تھا۔ لیکن زندہ زبان اور زندہ ادب کی ایک یہ بھی پہچان ہوتی ہے کہ یہ گمراہیوں میں بھی اپنا راستہ بنا لیتے ہیں جو چنانچہ سازشانہ تخریب کاریوں کو بے نقاب کرنے میں جو وقت لگا سو لگا لیکن یہ بات ثابت ہو کر رہی کہ شعر و ادب کو قاری سے اور قاری کو شعر و ادب سے بیگانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک لمبے عرصہ کے ٹھہراؤ نے تخلیق کی توانائی پر بھی اثر ڈال دیا تھا۔ اب سمت کا تعین ہو چکا ہے تو ادب میں بھی حرکت پیدا ہوگی۔ اس اَدبی تجدیدِ حیات کے وقت ترقی پسند تحریک کے اجتماعات یقیناً ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور ہماری تخلیقی توانائی کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مختصر مدّت میں ترقی پسند تحریک کی کانفرنسوں نے جو خوشگوار اثرات پیدا کرنے شروع کئے ہیں وہ رفتہ رفتہ تخلیق کے آئینہ میں منعکس ہو رہے ہیں۔

جمیل مَنظر سُنسھاروی

—— ڈاکٹر برج پریمی ——

شہرِ لالہ و گل

کشمیر کی جنت کا جب بھی خیال کیجئے تو سری نگر کی من موہنی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ سری نگر کا صدیوں پرانا شہر آج بھی اپنی رنگا رنگ تہذیبی روایات کے کھنڈر گود میں سہلائے اسی آب و تاب اور شانِ دلنوازی کے ساتھ جلوے بکھیرتا نظر آتا ہے جیسے بیتی ہوئی صدیوں کے ان مختلف ادوار میں تھا جب مختلف عقائد کے لوگوں نے اسے اپنے اپنے طور سنگار کیا تھا۔ اس شہر کے سینے میں کتنے خواب دفن ہیں اور اس کی آنکھوں میں یادوں کے کتنے گھاؤ رس رہے ہیں۔ کون جانے!

ہندو مہاراجوں کے وقت میں گونجتی ہوئی شنکھ کی سُریلی آوازیں، بودھ مت کا "بدھم شرنم گچھامی"، اسلام کی توحیدی صدائیں، افغانوں اور مغلوں کا حُسن اور جمالیاتی نظر، سکھوں اور ڈوگروں کی دلاوری — — یہ سب اب بھی یہاں کے پتھروں، چٹانوں، اور دیواروں، باغوں اور پیڑوں کی جھومتی ہوئی ڈالوں اور یہاں کی کومل دھرتی کے پھولوں پر مسکراتا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اگرچہ ان نقوش کو پھیکا کر دیا ہے لیکن یہ نقوش لازوال ہیں اور اب بھی وقت کے بیکراں وجود کو چیرتی ہوئی صدیوں پرانی یادیں زندہ کرتے ہیں۔

سری نگر جو اب سرینگر کہلاتا ہے۔ ان چند شہروں میں سے ایک ہے جن کو صدیوں سے راجدھانی بننے کا فخر حاصل ہے اور جو وقت کے شدائد کا مقابلہ کرنے کے باوجود زندہ ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ لگ بھگ دو ہزار برس قبل مہاراجہ اشوک نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی اور اس شہر کا نام دیوی مہالکشمی (دھن اور دولت کی دیوی) کے مقدس نام پر شری نگر رکھا تھا۔ شری یعنی لکشمی جو خوش بختی کی دیوی ہے۔ اور نگر یعنی شہر۔ اس رعایت سے یہ شہر خوش بختی کا شہر کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ شہر موجودہ شہر کے آس پاس شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف پھیلا ہوا تھا جسے کلہن "پُران ادھشٹان" کہتا ہے اور آج کل پاندریٹھن کے

نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ سری نگر کا یہ نام بعد میں پرواسین دوئم کی راجدھانی پرواپورہ کے لئے مخصوص ہو گیا۔ پرواسین کا بنایا ہوا شہر تو اب تک آباد ہے لیکن وقت کی ستم ظریفی نے اس شہر سے اس کا اصلی نام (یعنی پرواپورہ) چھین لیا ہے۔ اور اس کے بجائے اشوک اعظم کے شہرت یافتہ شہر کا نام چسپاں کر دیا۔ چنانچہ پرواپورہ کے بعد یہ شہر سری نگر ہی کہلایا۔ البتہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومت کے دوران سری نگر کے نام کو بدل کر اسے پورے ملک کا نام دیا اور عرصہ دراز تک سری نگر کو "کشمیر" کہا جاتا رہا۔ "کشمیر اور لداخ کے گزیٹیر" میں جو ہندوستان کے کوارٹر جنرل اسٹر (انٹلی جنس برانچ) کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں برنیر اور فورسٹر، جو اس ملک کا دورہ ۱۶۸۳ء میں کرتے رہے "سری نگر" کے بجائے "کشمیر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سکھوں نے اپنی فتح کے بعد پرانا ہندو نام پھر سے استعمال کیا۔" عله[۱]

کشمیر کے بارے میں چینی سیاح ہیون سانگ کی تفصیل غالباً اولین تواریخی دستاویز ہے۔ وہ ۶۳۱ء کے دوران کشمیر آیا تھا اور یہاں دو سال قیام کیا۔ اس کے بیان کے مطابق اس زمانے میں کشمیر کی راجدھانی ایک دریا کے کنارے آباد تھی۔ اس نے اپنے سفر کا مفصل حال اپنی کتاب "SI-YU-KI" میں درج کیا ہے۔ کشمیر کی راجدھانی کا ذکر کرتے ہوئے ہیون سانگ رقمطراز ہے:

"ملک کی راجدھانی مغربی اطراف میں ہے۔ اس کی حدود پر ایک بڑا دریا بہتا ہے۔ یہ راجدھانی شمال سے جنوب کی طرف ۱۲ یا ۱۳ لی اور مشرق سے مغرب کی طرف ۴ یا ۵ لی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کی سرزمین بادام اور دوسرے پھل پھول اگانے کے لئے زرخیز ہے۔" عله[۲]

لی ایک چینی ناپ ہے اور ہیون سانگ نے ڈھائی میل کا فاصلہ چینی ناپ کے ۱۲ یا ۱۳ لی سے ظاہر کیا ہے اور اسی طرح چوڑائی ۴ یا ۵ لی ایک میل کے لگ بھگ ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے کا یہ شہر، جو اس زمانے میں سری نگر کہلاتا تھا وتستا کے کنارے آباد تھا اور اس کی لمبائی لگ بھگ ڈھائی میل اور

عله[۱] گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ" مرتبہ کوارٹر ماسٹر جنرل ان انڈیا (۱۸۹۰ء) صفحہ ۷۷۔

عله[۲] ہیون سانگ "سی۔یو۔کی" مترجم سیموئیل بیل صفحہ ۱۴۸

چوڑائی ایک میل کے برابر تھی۔ کلہن کے مترجم اور فاضل ترجمہ کار ارول سٹین نے ہیون سانگ کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہیون سانگ کے وقت کی راجدھانی دراصل موجودہ سری نگر ہے۔ لکھتے ہیں:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہیون سانگ کے وقت کی راجدھانی، جو آج کے سری نگر سے مطابقت رکھتی ہے نقابتاً نئی بنیاد تھی۔

.....اس طرح پرانے شہر کا جو حوالہ ملتا ہے اس سے ہم اس کی پہلی راجدھانی کی حدود مقرر کر سکتے ہیں جو اشوک کی سری نگر آج کا پاندریٹھن کا کلہن پران ادھشٹان ہو سکتا ہے۔" ؎۳

بامزئی نے اپنی تاریخ کشمیر میں ہیون سانگ کی یادداشتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے ہاں راجدھانی کے جس شہر کا ذکر کیا گیا ہے وہ پروا پور ہی ہے۔ لکھتے ہیں:

اس کے علاوہ راجدھانی شہر کے بارے میں بھی واضح بیان ملتا ہے اس کو پو۔ لو۔ ان۔ لو۔ پو۔ رلو (P.O.L.O.N.L.O.P.O. L.O.P.O) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ پروا پور کا صحیح مترادف ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے اس زمانے میں موجودہ سری نگر کو موسوم

؎۳ سرارول سٹائن (مترجم) راج ترنگنی حصہ دوم ص۴۴۶

کیا جاتا ہے۔" ؎۴

کلہن اور تواریخ کشمیر کے دوسرے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ سری نگر کا اصلی نام پروا پور یا پرواپور یا پرواسن نگر تھا اور اس کی بنیاد کشمیر کے مشہور بادشاہ پرواسین دوم؎۱ نے چھٹی صدی کے نصف آخر میں ڈالی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہ شہر ہیون سانگ کے کشمیر آنے سے قبل آباد ہو چکا تھا۔ ہیون سانگ بھی اشوک اعظم کے "پران ادھشٹان" ؎۵ کے مقابلے میں اس شہر کو "نیا شہر" کہتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شہر ہیون سانگ کے زمانے میں آباد ہو چکا تھا۔ کلہن کی راج ترنگنی میں اس نئے شہر کے آباد ہونے کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔ کلہن کی یہ کہانی راج ترنگنی کے ۳۳۶ - ۳۳۹ (تیسرا حصہ) کے اشلوکوں میں ملتی ہے۔ اس بات کے باوصف کہ ساری کہانی روایت کے طلسم میں

؎۴ پی۔ این بامزئی "اے ہسٹری آف کشمیر" ص۴۳

؎۱ پرواسین دوم وکرمادتیہ کے انتقال کے بعد اور ماترگپت کی تخت سے دستبرداری کے بعد کا حکمران ہوا۔ وہ ایک بہادر فاتح اور پاک نفس بادشاہ تھا۔ اس نے ساٹھ سال حکومت کی اپنے بزرگوں کی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے نام پر ایک نیا شہر آباد کرنا چاہا۔ اس خواہش کی تکمیل میں اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر اس کی تمنا بر آئی۔

؎۵ بامزئی "اے ہسٹری آف کشمیر" ص۴۴

میں پیش ہوئی ہے۔ اس میں شہر سے متعلق جو بیان ملتا ہے وہ بڑا دلچسپ اور واضح ہے۔ کلہن نے راج ترنگنی میں جو کہانی درج کی ہے، وہ کچھ یوں ہے: جب راجا پرواسین دوم اپنی فتوحات کے بعد واپس وطن لوٹا تو اس کی بڑی خواہش ہوئی کہ وہ یادگار کے طور پر ایک شہر آباد کرے۔ کافی عرصہ تک وہ شہر کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب نہ کرسکا۔ تب اس نے کسی فوق الفطرت طریقے سے جگہ تلاش کرنے کی ٹھانی۔ گھپ اندھیری رات تھی۔ راجہ اپنے محل سے اکیلا ہی چل پڑا۔ کافی مسافت کے بعد اسے ایک جگہ آگ نظر آئی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے شمشان گھاٹ ہے جہاں چتائیں جل رہی ہیں۔ رات کے بھیانک اندھیر میں دور دور تک شمشان گھاٹ کی آگ سے بھیانک سائے بن رہے ہیں۔ راجا نے جب چاروں طرف دیکھا تو دریا کے دوسرے کنارے کے قریب ایک بھید ڈراؤنی صورت نظر آئی۔ قد و قامت کے اعتبار سے یہ انسانی صورت بالکل نہیں تھی۔ اس دیو ہیکل صورت نے راجا کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اگر وہ اس کے پاس چلا آئے تو نہ صرف یہ کہ اس کو اپنے تمام سوالوں کا جواب ملے گا بلکہ اس کی ساری مشکلات دور ہوں گی۔ نڈر راجا نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا کہ وہ دریا کو کس طرح پار کرسکتا ہے؟ اس دیو ہیکل نے اپنی ٹانگ پھیلا کر دریا پر پل بنا دیا۔ متحیر راجا نے اپنی کھڑکی دیو کی ٹانگ میں پیوست

کرتے ہوئے دریا کو پار کر لیا ۔ اور اس کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرتے ہوئے راجا سے کہا کہ وہ بھگوان شیو کا غلام ویتال بھیرو ہے ۔ اور وکرمادتیہ اور شدھرکے بعد وہ یعنی پرداسین تیسرا شجاع بادشاہ ہے جس کی بہادری سے وہ بیحد متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ ویتال بھیرو نے نہ صرف راجا کے شہر کی نشان دہی کی بلکہ آرشیہ واد دیکر مہورت کا وقت بھی بتا دیا۔ دوسرے دن راجا بھیرو کی بتائی ہوئی جگہ پر آیا۔ یہ جگہ ہاری پربت سے ملحق ہے ۔ راجا نے شبھ مہورت پر ملک بھر کے پاک نفس بزرگوں اور سادھو سنتوں کی موجودگی میں اپنے شہر کی بنیاد ڈالی ۔ نئے شہر کی تعمیر اور آرائش کا کام وقت کے سب سے بڑے انجینیر جیدہ کے سپرد ہوا۔ شہر کے وسط میں بھگوان شیو کا مندر تعمیر کروایا گیا جو کافی دنوں تک SIKAPRAVARESVERA[1] کے نام سے مشہور تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہاری پربت کے ارد گرد عالیشان عمارتوں اور باغوں کا شہر آباد ہوا ۔ اپنے اس شہر کو آفتوں سے بچانے کے لئے راجا نے نہ صرف اپنے وقت کے روحانی باکمالوں کی دعائیں حاصل کیں بلکہ مختلف مراکز پر پانچ عظیم الشان مندر تعمیر کروائے اور اس طرح سے سری نگر کا یہ قدیم شہر جو آج وقت کے بے رحم تھپیڑوں کے باوجود

---

[1] سر آرل سٹین (مترجم) ، راج ترنگنی حصہ دوم ص ۴۴۳

زندہ اور تابندہ ہے۔ آج سے کوئی تیرہ سو سال پہلے دھرتی کے سینے پر نمودار ہوا۔ لیکن وقت نے اپنے سنگین ہاتھوں سے پروارسین کا دیا ہوا نام پروار پورمٹا دیا اور اسے اشوک اعظم کے شہر کے نام سے ہی زندۂ جاوید رکھا۔

اس بات سے قطع نظر کہ ہیون سانگ کے زمانۂ قیام میں سری نگر کس شکل و صورت میں موجود تھا۔ یہ بات کہنا ضروری ہے کہ شہر دریا کے کنارے پر جنوب سے شمال کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ وتستا اس کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہر ندی کے دوسرے کنارے پر بھی آباد ہو گیا اور آج صدیاں گزرنے کے بعد شہر کی حدود میں وسعتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ وتستا ایک خوبصورت ناگن کی طرح اپنے نیلے پانیوں کے چمکتے ہوئے جسم کو سمیٹتی، تھکے قدموں کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا سفر صدیوں پہلے شروع ہو چکا ہے لیکن اس کے چہرے پر تکان یا ملال کے سائے نظر نہیں آتے۔ سری نگر کے ایک طرف ڈل جھیل ہے جس کے کنارے پر پہاڑوں کی باہوں میں کھلے ہوئے مغلوں کے باغات ہیں جو اپنے رنگوں کی بہار اور چناروں کے ٹھنڈے سائے سے اس میں حسن اور رنگ کی جھالر تان دیتے ہیں۔ شنکر آچاریہ کی پہاڑی، ہاری پربت کا قلعہ، ہندوؤں کے مندر، مسلمانوں کی مسجدیں، سکھوں کے گوردوارے، زیارت گاہیں اور استھاپن اور خانقاہیں، بادام کے شگوفے اور کنول کے پھول، تیرتے ہوئے باغات، ہوس بوٹ اور شکارے، رسیلے پھل، اور رنگ برنگے خوشبو میں بسے ہوئے پھول اس شہر نگاراں میں قوس و قزح کے رنگ بھر دیتے ہیں۔

وتستا

وتستا، ویتھ یا جہلم ——— تمام اسی خوبصورت دریا پر لوٹتی ہے۔ جس سے میرے شہر کی آن بان قائم ہے۔ سری نگر شہر کے بیچ میں سے بہتا ہوا یہ صدیوں پرانا دریا، ہندو دیومالا میں ایک تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ ندی ہے جس کے پانیوں میں ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق ڈبکی لگانے سے پاپ دھل جاتے ہیں۔ جہلم کا اصلی نام "ویتھ" ہے جو سنسکرت کے "وتستا" سے ماخوذ ہے۔ اور رفتار زمانہ کے ساتھ لفظی تبدیلیوں کے بعد "ویتھ" بن گیا ہے۔ "وتستا" کا لفظ رگ وید کے دریائی ناموں میں بھی نظر آتا ہے۔ یونانیوں نے اسے ہیڈاسپیس[عه] (HYDASPES) کے نام سے موسوم کیا تھا۔ بعض سنسکرت بولنے والے اسے "ودتستا" بھی لکھتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ آٹھویں صدی کے چینی تواریخوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ نیل مت پران میں کاشمیر (کشمیر) کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے وتستا

عه گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ ص۵۰۸

نو ہمالیہ کی بیٹی اور مہان دیوی کہا جاتا ہے۔ عله قدیم کشمیر سے متعلق اس قدیم کتاب میں بتایا گیا ہے کہ وِتستا شیو کی محبوبہ پاروتی کی مظہر ہے۔ قدیم روایات کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ پشاچوں کے ساتھ میل جول کے نتیجہ میں ناگ قوم کے لوگ اپنی ذات کھو بیٹھے تھے۔ اور بہت پریشان تھے۔ ان کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں پرائشچت کی ضرورت تھی اس لئے کشپ رِشی نے بھگوان شیو کی اپاسنا کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ دیوی کو پانی کے روپ میں دھرتی پر بھیج دیں۔ پاروتی اپنے مالک کی خواہش کے مطابق پانی کی شکل میں ڈھل کر دھرتی کے اس حصے میں آگئیں اور زمین کے اندر پناہ لی۔ اور بھگوان شیو سے درخواست کی کہ وہ ان کو زمین سے باہر نکال دیں۔ بھگوان نے اپنے ترشول کو نیل ناگ کے نزدیک زمین میں گاڑ دیا، جس سے ایک وِتاسی (VITASI) یا بالشت کے برابر پانی باہر پھوٹ آیا اور اسی رعایت سے یہ ندی وِتستا کہلائی۔

نیل پران میں لکھا ہے:

"کشمیر کو اس طرح آباد دیکھ کر کشپ نے
شنکر کی پوجا کی اور دیوی اوما کو آمادہ
کیا کہ اس ملک کو پانی کے تحفے سے پُر کر دے۔
اور وہ ــــ جو پاپوں کو ناش کرنے والی ہے۔

ــــ دریائے وِتستا کے نام سے
مشہور ہے۔" عله

شنکر کی خواہش کے مطابق دیوی نے پانی کا روپ اختیار کر لیا۔ اور اپنے مالک سے یوں کہنے لگی:

"اے سنسار کے مالک!
میں پاتال میں ایک ندی کی صورت اختیار
کر لوں گی، تب آپ نیل کے قریب اپنا
ترشول زمین میں گاڑ دیجئے۔ ....
ترشول کے گڑھے سے میں پاتال سے باہر
نکل آؤں گی۔ اور اس راستے پر بہہ جاؤں گی
جو اس پل سے اس جگہ تک بنا ہے جہاں
بڑا دریا سندھو بہتا ہے۔
شنکر نے خود اس کا نام وِتستا رکھا
کیوں کہ ہر نے ترشول سے ایک گڑھا
بنا لیا تھا جو ایک وِتاسی کے برابر تھا۔
اس طرح سے یہ اچھی ندی جو پاتال میں جا
چکی تھی۔ باہر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ شنکر نے
اس کا نام خود وِتستا رکھا"۔ عله

چشمے کی وہ جگہ جہاں سے پاروتی کا جلوہ ندی کی صورت میں نمودار ہوا نیل کنڈ سنگاٹے یا ص

عله ڈاکٹر وید کماری گھئی: نیل مت پران" حصہ دوم ص

عله ڈاکٹر وید کماری گھئی: نیل مت پران" حصہ دوم ص۱
عله " " " " ص

وتستا کہلایا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چشمہ منیل ناگ، ویری ناگ کے قریب واقع ہے لیکن ویری ناگ نہیں ہے جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ویری ناگ ہی وتستا (جہلم) کا منبع ہے حقیقت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور روایت ملاحظہ ہو :

"ایک روایت کے مطابق وتستا اس
جگہ (ویری ناگ) سے ظاہر ہونا چاہتی
تھی لیکن جب وہ یہاں پر آئی تو یہاں
شو بیٹھا تھا۔ لہٰذا اسے واپس جانا
پڑا اور اسے "دیتھ وتر" میں سے پھوٹنا
پڑا۔ جو اس جگہ سے شمال مغرب میں
کوئی ایک میل دوری پر ایک چشمہ ہے۔
سنسکرت میں "ورہ" کے معنی میں واپس
جانا اور ناگ کے معنی میں چشمہ اور چونکہ
وتستا کو اس جگہ سے واپس جانا پڑا۔
لہٰذا اسے ورہ ناگ یا ویری ناگ
کہا گیا۔" عـ۲

اس روایت کا ذکر راج ترنگنی میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وتستا بار بار پاپیوں کے چھوٹ جانے سے غصے میں آکر غائب ہو جاتی رہی لیکن بار بار ہی کشب رشی کی درخواست پر نمودار ہوتی اور مختلف جگہوں پر نمودار ہوئی۔ اس روایت کے مطابق چشمہ منبع کے تعین میں دقت ہوتی ہے۔ راج ترنگنی میں دیتھ وتر کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی وضاحت سر آرل سٹین یوں کرتے ہیں :

"کلہن اس جگہ کو وتستر (VITAS-
TATRA) کہتا ہے۔ کلہن یہ بھی کہتا ہے
کہ مہاراجہ اشوک نے یہاں پر ستوپا
بھی کھڑے کر دیئے تھے۔ لیکن اس نے
نیل کنڈ کو وتستا کا منبع قرار دیا ہے۔
لیکن اس کا بھی کہیں پر پتہ نہیں چلتا۔"
عـ۱

بہر حال کچھ بھی ہو ——— وتستا اپنے منبع سے نکل کر کھنڈبل پہنچ جاتی ہے جہاں اس کے ساتھ شمال مشرق سے "آرت" اور جنوب مشرق سے "برنج" اور "سندرن" آملتے ہیں۔ اسلام آباد کے دو تین میل شمال میں ششش ناگ سے نکلنے والے نالہ لدر کا دودھیلا پانی اس کے ساتھ آملتا ہے جس سے پانی کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ آگے چل کر بجبہاڑہ میں وشو اور "رمبی آرہ" آملتے ہیں۔ سری نگر میں دودھ گنگا شادی پور میں سندھ اور مظفر پور میں دریائے کشن گنگا اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جھیل ڈل، انچار، مانسبل، ولر اور دوسے

عـ۲ پی این کے بازاز، "اے ہسٹری آف کشمیر" ص ۵۹۰

عـ۱ سر آرل سٹین "راج ترنگنی" (حصہ دوم) ص ۴۱۴

بہت سے ندی نالوں کا پانی سمیٹے ہوئے پاکستان میں جہلم کے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کا نام جہلم پڑتا ہے۔ وتستا آج اسی نام سے مشہور ہے۔ جہلم سے میدانی علاقوں میں سے گزرتی ہوئی چناب کے ساتھ مل کر آخر بحرۂ عرب کی باہوں میں سما جاتی ہے۔

وتستا کا اصلی نام اب بہت کم لوگوں کی زبان پر ہے۔ اسے اب عام طور پر جہلم ہی کہا جاتا ہے صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کے بہاؤ یا گزرگاہ میں معمولی فرق پیدا ہوا ہے۔ اپنے روایتی تقدس سے قطع نظر اس کی افادیت اور اس کی فیض رسانی سے انکار ممکن نہیں۔

یہ دریا صدیوں سے اندرونی تجارت کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آمدورفت کا اہم ذریعہ بھی رہا ہے۔ جہلم پر کسی زمانے میں تیس پل تھے۔ یہ پل کشتیوں کے بنے ہوئے تھے۔ اور زنجیروں سے جوڑے جاتے تھے۔ تواریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو عہد میں وتستا پر کبھی مستقل پل نہیں تھے۔ ان پلوں کو ضرورت کے وقت کھول دیا جاتا تھا۔ جب دشمن کی یلغار کا خطرہ ہوتا یا دریا کے کسی ایک طرف آتش زدگی کی شکایت ہوتی تو شہر کے دوسرے حصے کو بچانے کے لئے کشتیوں کے پل کھول دیئے جاتے اور شہر کے دونوں حصوں کو علاحدہ کیا جاتا۔

وتستا کے روایتی تقدس کا احترام صدیوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ حتی کہ کسی زمانے میں اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے ہر سال بھادوں کے روشن پندرھواڑے کی تیرھویں تاریخ (ستمبر۔اکتوبر) کو منائی جاتی تھی۔ اس تہوار کو "جیٹھ ترداہ" یا "وتستا تریودشی" کہا جاتا تھا۔ وتستا میا کو دودھ اور مٹھائیوں کا بھوگ چڑھایا جاتا ہے۔ جہانگیر نے اپنے تزک میں اس تیوہار کا ذکر کیا ہے۔ بڈشاہ کے زمانے میں بھی یہ تیوہار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بادشاہ خود بھی اس تیوہار میں شریک ہوتا تھا۔ آر۔ کے۔ پارمو لکھتے ہیں:

> زین العابدین حسب راعوں کی نمائش میں شریک ہوتا تھا۔ یہ تیوہار وتستا کے جنم لینے کی خوشی میں منایا جاتا تھا۔ جو بھادوں کے روشن پندرھواڑے کی تیرہ تاریخ کو پڑتا تھا۔ اس تیوہار کو "ویتھ ترواہ" کہتے ہیں۔" عہ[1]

اس دن والدین اپنی بیٹیوں کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ اس تیوہار میں رنگ و نور کی برسات ہوتی اور مذہب ذات اور طبقوں کے بھید بھاؤ کے بغیر لوگ اس تیوہار میں شریک ہوتے تھے۔ اور خوشیوں اور شادمانیوں سے اپنا دامن بھرتے تھے۔ کشمیر کے رنگا رنگ تیوہاروں کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی اس تیوہار کو خاص طور پر بیان کرتے ہیں۔ مورخ سرمحمد دو

عہ[1] ڈاکٹر آر۔ کے۔ پارمو ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر صفحہ نمبر ۱۴۱۔

نیشنل ایجوکیشن پالیسی کے تحت

بہار میں

نودے وِدیالیہ

— بچے اور بچیوں کی تعلیم میں شروع سے ہی قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے کلچر، اخلاقی قدروں، روزگار سے جڑی ہوئی تعلیم، محنت کے کام کاجوں اور ورزش کے ساتھ اچھی تعلیم بغیر مالی سماجی بھید بھاؤ کے بطور خاص گاؤں کے علاقوں کے ذہین لڑکے اور لڑکیوں کو مہیا کرانے کے لئے۔

— اسکول کے سبھی طالب علموں کے لئے تین فارمولائی زبانوں میں ضروری تعلیم دینے کے لئے اسکولی تعلیمی فروغ کے لئے انوبھو اور آسانیوں کے آدان پردان کے لئے صوبہ کے ہر ایک ضلع میں ایک ایک رہائشی نودوے ودیالیہ کھولنے کا پروگرام ہے۔

پہلے مرحلے میں (سال ۸۷-۱۹۸۶ء) میں صوبہ کے سات ضلعوں میں ایک ایک نودے ودیالیہ اسکول قائم کیا گیا ہے: (۱) مدھوبنی (رانگی) (۲) سمستی پور (بیرولی) (۳) پچھمی چمپارن (کمار باغ) (۴) مونگیر (شیخپورہ) (۵) دمکا (رہنس ڈیہہ) (۶) بھوجپور (آرہ) (۷) گملا (بیل گاڑا) نودوے اسکولوں کے قیام کی تعداد میں ملک میں بہار کا دوسرا مقام ہے۔

اگلے سالوں کے دوران باقی ۳۲ ضلعوں میں بھی ایک ایک نودے اسکولوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامۂ بہار کے ذریعہ جاری

सू० ज० स० नि 588-स (सू-334)/86-87

غالب راجستھانی میں

راجستھانی زبان میں منظوم ترجمہ

حاجی محمد شعیب عثمانی

"غالب راجستھانی زبان میں" بعنایت درخورِ اعتنا تخلیق ہے صرف منظوم ترجمہ نہیں ہے۔ شروع میں احوال و کوائفِ غالب ہیں۔ اس کے بعد منظوم حصّہ ہے۔ جس کو Transcreation یعنی ترجمہ تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ ذیل میں مشاہیر کی آرا ملاحظہ ہوں۔ یگانۂ روزگار، مفکر، آفریں شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اُردو کلام کا راجستھانی زبان میں ترجمہ کیا ہے یوسف جھنجھنونوی نے۔ یوسف صاحب ایک مشہور و معروف شاعر مورخ، محقق اور حکیم ہیں۔ جن کی شخصیت کے بارے میں آنجہانی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اپنے ایک توصیفی خط میں ارشاد فرمایا تھا کہ: "میں نے کلکتے کے مشاعرے میں جناب حکیم یوسف صاحب کا کلام نہایت دلچسپی سے سنا۔ اُن کے لہجے میں نرمی ہے۔ ان کی آواز میں گھلاوٹ ہے اور ان کے احساس میں پُرخلوص شعریت ہے۔ جتنے اچھے وہ شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے وہ انسان ہیں اور جتنے اچھے وہ انسان ہیں اتنے ہی اچھے وہ شاعر ہیں۔ میں جناب ریوتی لال شاہ کا ہمیشہ کے لئے ممنون رہوں گا کہ جن کی وساطت سے یوسف صاحب کا کلام سننے کا خوشگوار موقع ہاتھ آیا۔"

فراق گورکھپوری۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ء الہ آباد۔

یوسف صاحب کا کیا ہوا یہ ترجمہ اہلِ زبان و ادب کے حوصلہ مند حضرات کے لئے ایک پیامِ غور و فکر، ایک دعوتِ عمل ہے۔ یہ ترجمہ ایک تجربہ، ایک نئی راہ، ایک نئی سمت اور فراموش نہ کیا جانے والا ایسا کارِ عظیم ہے جس کا تذکرہ پرستارانِ ادب کی انجمن سے لیکر دیہی عوام کی چوپالوں تک میں کیا جائے گا۔

اُردو زبان کی تشبیہات و استعارات، جذبات و احساسات، خیالات و تاثرات اور اسلوبِ بیان و طرزِ نگارشات کا اپنا ایک الگ انداز، نیا ڈھنگ ہے۔ جس کو صدیوں سے ایک زمانہ تسلیم کرتا چلا آرہا ہے مگر اس ترجمہ کو توجہ سے پڑھا یا سنا جائے تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی راجستھانی زبان میں بھی دُنیا کی بڑی زبانوں کی طرح اس قدر صلاحیت و جاذبیت ہے کہ وہ اپنے اندر اُردو زبان

کی فکری اور ذہنی اقدار کو بھی اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ اور یہ بات اس ترجمے نے ثابت کر کے بتا دی۔ جس کے بارے میں راجستھانی کے اَسّی سالہ بزرگ کوی شری کنہیا لال سیٹھیا، ودّیا واچسپتی" نے لکھا تھا کہ:

"جناب یوسف حسین یوسف اردو بھاشا
را مالوان شاعر ہیں۔ راجستھانی بھاشا
میں آں رو کر یوڑو غالب ری گجلاں رو انوَلو
ایک موٹو اپکرم ہے۔ انوواد میں مول
رو سو آرنڈ آوے۔ انوواد میں شاعر کی
گمتار۔ راجستھانی بھاشا کی سامرتھ
رو ساکھو ہانگ رہے نے۔" کلکتہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ء

یہ بات مسلّم ہے کہ کسی بھی زبان کے ادب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ جب کہ مرزا غالب جیسے منکر اور پیچیدہ گو شاعر کے کلام کا ترجمہ تو واقعی ہی بہت کٹھن اور مشکل ترین معاملہ ہے۔ جن کے یہاں ابہام لفظی کی کوئی اہمیت نہیں جو صرف ابہام معنوی کے ہی سہارا قائل رہے ہیں۔ مرزا صاحب کے کلام کا بہت سارے حضرات نے ترجمہ کیا اور تشریحات کیں۔ اب بھی یہ کام کیا جا رہا ہے۔ مگر اس زبان کو پڑھ کر اکثر مقامات پہ یوں لگنے لگتا ہے کہ مترجم نے مرزا صاحب کے ہر شعر کی روح کو مجسّم کر کے اپنے احوال میں حلول کر لیا ہے۔ اور انہی احوال و کوائف کو کیفیات میں جیتے ہوئے اپنے الفاظ کے قالب میں وہی تاثرات وہی غنائیت و ایمائیت سمو کر رکھ دی جو اصل کلام میں ہے۔ اس بات کو ہندی کے نامور ادیب تارادت نرور وود صاحب نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

"انوواد کو پڑھتے سمے لگتا ہے کہ انھوں
نے غالب کے ایک ایک شعر کو آتمسات
کر کے انہیں من سیتھتیوں کو جیتے ہوئے
جن راجستھانی شبدوں کا پریوگ کیا ہے
جیسے وے اسی نئے بنے ہیں..... اس
انوواد سے راجستھانی ساہتیہ کو بھی دِشا
ملے گی اور اردو بیچھڑت جنتا غالب کے
کارنڑ راجستھانی تھا راجستھانی غالب
کو سمجھ سکیں گے۔ ناگری لپی میں ہونے سے
گرنتھ سبھی کے دوارہ پڑھا جائے گا۔"
"نو بھارت ٹائمز" ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء

حالانکہ میں راجستھانی ادب سے اتنا واقف نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے، پھر بھی ایک زمانے تک راجستھان میں رہنے اور وہاں کے ادیبوں سے گہرے تعلقات ہونا، علاوہ ازیں کئی زبانوں کو لکھنے اور پڑھنے کی استطاعت ہونے کی وجہ سے راجستھانی زبان بھی مجھے اپنے قریب کی ہی زبان لگنے لگی ہے۔ میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ یہ ترجمہ واقعی اصل کلام کی صحیح عکاسی ہے۔ صرف لباس بدلا ہوا ہے، باقی تو پیکر میں وہی ناہید ادا کا جلوہ آرا رہا ہے۔

غالب صدی پر ہونے والے اکثر پروگراموں میں
ترجمہ کو پیش کرنے کے بعد جے پور میں ہونے والا ایک
پروگرام جس کے نگران نواب لوہارو امین الدین خان
مرحوم، گورنر ہماچل پردیش تھے۔ اس پروگرام میں
راجستھان اور دیگر صوبہ جات کی معزز ترین ہستیوں
کے علاوہ صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی
احمد (مرحوم) بھی رونق افروز تھے۔ اس وقت اس
کو سبھی حضرات نے بڑی توجہ سے سنا اور بہت
سراہا۔ سابقہ خاتون اوّل بیگم عابدہ سلطانہ
نے بھی بہت پسند فرمایا۔ ان کے توصیفی کلمات
تمام ہی اخبارات میں جلی حروف میں شائع ہوئے
۔ راجستھان سے ہندی میں شائع ہونے والا
جیوتی" جے پور، سرخی: غالب کا راجستھانی میں
ادہویگم"..... انہوں نے رویندر منچ پر "شام غالب"
میں یوسف صاحب جھنجھنوی وادارہ پرستشِ غالب
مشہور غزلوں کے راجستھانی انداز کو بہت پسند
۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء ——— اس کے بعد سردار جوگندر
سنگھ صاحب گورنر راجستھان نے اعزازی سرٹیفیکیٹ
عنایت فرمایا..... ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء۔ اسی سلسلے
میں آندھرا پردیش کے گورنر موہن لال جی سکھاڈیہ
نے ایک خط لکھا: بحریہ یوسف حسن! مجھے مرزا غالب
جلسے کے موقع پر آپکے راجستھانی ترجمے کو سننے کا موقع
نصیب ہوا۔ اور مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی جس ڈھنگ
سے آپ نے ان سب کو تیار کیا تھا، میں ہی نہیں راشٹرپتی
جی اور بیگم صاحبہ بھی اس کو سن کر بہت خوش ہوئے
تھے۔ آپ کو اس کے لئے بہت بہت دھنیاد۔ آپکا
موہن لال سکھاڈیہ۔ ۲۲، جولائی ۱۹۷۲ء

راجستھان کے شمال میں بسا ہوا شیخاواٹی علاقہ
جس کا ایک ضلعی مرکز جھنجھنوں بھی ہے۔ یہاں کی
زبان شیخاواٹی زبان کہلاتی ہے۔ یوں تو راجستھان
میں اور بھی کئی زبانوں کا بول بالا ہے۔ ہاڈوتی، میواتی
میواڑی، ڈھونڈھاڑی اور مارواڑی وغیرہ مگر شیخاواٹی
زبان ان سب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ شیخاواٹی
علاقہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں سے زمانۂ قدیم
سے آنے والے وسط ایشیائی لوگوں کا گزر رہا ہے۔
اس کے علاوہ یہاں پر صدیوں تک مسلم نوابوں کی حکمرانی
بھی رہی۔ دوسرے دلّی، نارنول سے بہت قریب ہے۔
اس لئے یہاں کی علاقائی زبان میں عربی، فارسی اور ترکی
زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہو کر رہ گئے۔ ویسے بھی
یہ زبان بہت صاف ستھری ہے۔ صرف ایک باتوں پر
دھیان دیا جائے تو بہت جلد سمجھ میں آنے لگتی ہے۔
مثلاً آیا، گیا، بلایا کو آیو، گیو، سنایو، بلایو اور
لے کی جگہ رہیں۔ جیسے آپنے "کو "آپڑیں" "سمجھنے"
کو "کہڑیں"۔ تو بس اس زبان میں "ڈا" اور "ڑیں" زیادہ
مستعمل ہے۔

راجستھانی زبان میں ایک حرف ہے ل.لڑ۔
جو ملک کی اور بھی کئی زبانوں میں پایا جاتا ہے مگر اردو
زبان میں نہ ہونے کی وجہ سے یوسف صاحب کو اپنا

ترجمہ اُردو رسم الخط میں لکھتے وقت بڑی کٹھنائی ہوئی۔ جس کا انھوں نے ایک طریقہ اپنی طرف سے اختراع کیا۔ اور انھوں نے لام پر طوے کا نشان لگا دیا۔ جب کہ ہندی والوں نے بھی اُردو حروف کی شناخت کے لئے کھ، کہ، جہ اور گ کے نیچے نقطہ لگانا شروع کر دیا یا پھر اُردو داں حضرات ہندی کو استعمال کرنے کے لئے دو چشمی سے کام لینے لگے۔ فی الحال یوسف صاحب کی یہ ایجاد بھی واقعی سراہنے کی ہے۔

راجستھانی زبان کا گنجینۂ ادب بھی اس قدر گہرائی اور گیرائی لئے ہوئے ہے کہ جس میں فنونِ لطیفہ کی بے شمار گراں قدر درخشندہ و تابندہ لعل و گوہر جڑے ہوئے ہیں۔ اس زبان میں صدیوں پرانی علاقائی عزرا ہر کی ان گنت کتھائیں، ستیوں اور بلیدانوں کی ہزاروں گاتھائیں، رلوک کی ریتھائیں، من کی کٹھنائیں، روپ کی پرشنسائیں، پیار کی کتھائیں۔ ان کے علاوہ راجا مہاراجاؤں کی پرشستیاں اور ایشور بھگتی کے امر گیت بھجن وغیرہ دفتر کے دفتر لکھے ہوئے ہیں۔ اس زبان کے ادبی قافلے بھی گردشِ ادوار کے انجانے نشیب و فراز والے میدانوں میں خیمہ زن ہوتے چلے آرہے ہیں۔

بہر حال اس قدر خصوصیات کے بعد بھی ایک بات ذہن میں ابھر کر آتی ہے۔ چونکہ یوسف صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ منظوم کیا ہے۔ غزلوں کا غزلوں میں، قطعات و رباعیات کا بھی ان ہی اوزان میں اور قصیدے کا بھی وہی وزن رکھا ہے۔ اس لئے اصل الفاظ کے ہم وزن اور ہم معنی الفاظ تلاش کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر دیکھا یہ گیا کہ مترجم کی دونوں زبانوں کے ادبی الفاظ پر بہت گہری گرفت ہے اور انھوں نے راجستھانی زبان کے جن لفظوں کو اپنے ترجمہ میں پرویا ہے گویا ہے وہ سارے کے سارے الفاظ شاید غالب راجستھانی میں" کے لئے ہی بنائے گئے تھے۔

"غالب راجستھانی میں" غزل، قصیدہ، رباعی اور قطعہ کے ساتھ ساتھ مرزا کے کچھ خطوط، لطیفے، اقوالِ زریں اور انکی مختصر سوانحِ حیات بھی دی گئی ہے۔ کتاب کے شروع کے اوراق میں مترجم کے بارے میں آراء ہیں۔

کتاب کی خوبی یہ ہے کہ ایک طرف اصل کلام ناگری لیپی میں، فٹ نوٹ میں اُردو الفاظ کا ہندی ترجمہ۔ سامنے کے ورق پر راجستھانی میں ترجمہ۔ کئی فوٹو کے بلاکس۔ قریب چالیس صفحات آرٹ پیپر، رنگین جلد۔ اور بھی بہت سی خصوصیات۔ اس کتاب کو ساہتیہ مجلس پرکاشن جھنجھنوں نے شائع فرمائی۔ جس کی قیمت پچاس روپئے رکھی گئی ہے۔ حالاں کہ کتاب کی تزئین و ترتیب دیکھتے ہوئے یہ قیمت بہت کم ہے۔

اب ذرا اس ترجمے کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے مرزا کی مشہور غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت"...... ہے اوپر اصل متن اور نیچے ترجمہ ہے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہر سہاگ کہ تو میرو کہ ملنو لکھی ۔ اس سے ہو تو
جب میں لاکھ برس رہتو یوں لوکھاں کی باٹ جو تو

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ترو وعدو جھوٹو جان کیو میں جو اتی سچو تو ہوں
مجے جا دُو مار دیتو، جب بھروسو میں یہ ہو تو

تری نازکی سے جانا کہ بندھا ہے عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

تری کایا سے بھی نازک تقور کرار تیرو بسیری
تو کدہے نہ توڑ پاتو، جب بچرا کبھی ترنت ہوتو

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

میرو من ہی جانڑے جلی تر و منیر بار کے ہے
یا کوملک کیسے دھری ہی، جب لوہ آر پار ہو تو

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

یا نیک ہے پریت نیاری، مجے سیکھ میت دیوے
کوئی میرو دکھ مٹاتو، کوئی میری پیڑ بھو تو

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، وہ اگر شرار ہوتا

انی پیت کی تپن سے ہووے پانڑیں پانڑیں پربت
جب لو تمہاری ہو دُکر تو، تو جنم لے آپ میں رو تو

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچے کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

ہے یو دکھ تو جی کو لیو، مرو من نہ بچے بھی کیتاں
جب یو پیت دکھ سے بچھو، تو یو جگ کو دکھ ہی ہو تو

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

یا برہ کی دین جلنا، جیکی گھونٹ گھونٹ مارے
کے کٹھن کیو جان کھورڈوں جب میں ایک برسیاں ہو تو

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی مر کے بار فضیتی، کیسے جا کے کیوں نہ ڈوبیا
نہ کیسے نشان ہو تو، نہ برائی کیوں ہو تو

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہیں جیسی سیرکیو دُو جو، وہ نجر بھی کیں نہ آوے
لو کیسے تو دیکھ پڑ تو، جب کیسے بھی کیوں تو ہو تو

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تری باتاں سے تو گالب تو رسی منی سرلا سے
جب نہ مدھ کو رسیو ہو تو، تو توں دیوتا ہی ہو تو

کس قدر پُر اثر اور وجد آگیں ترجمہ ہے۔ بار بار پڑھیے اور کیف میں ڈوبتے جایئے۔

اسی طرح ایک غزل اور بھی معہ ترجمہ پیش کر رہا ہوں اسے بھی پڑھ [illegible] مترجم کی کاوش کو داد دیجیے

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

وہ برہ بولنڑ کی بات کٹھے
سال مہینہ بے دن بے رات کٹھے
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
کیوں نہ پُھرست ہے پیت کرلیں کی
روپ کے چاؤ کی وہ بات کٹھے
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
من کی کے ٹھاکر ہوس بھی کوئی
پیت بالا ہے دماؤ گھات کٹھے
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
یاد سے بال کے ہے کیوں سندر کھنو
اب بسی کلپنا میں بات کٹھے
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
پیت کی ریت اب سبھے کوئی
موجِ مستی کی من میں بات کٹھے
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
پریم کو جُو دوکھا لو چھوٹ نہ گیو
جاوداں کتیاں کہ سر کے بات کٹھے
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
بھاگ بیا دُکھو جد بھنیو جگ بیں
یں کٹھے یا بڑھا دُ جات کٹھے
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں
انڑ سگلا بہا تھک گیا غالب
بیکیاں ہائی ہامھاں میں بات کٹھے

یوسف صاحب نے مرزا صاحب کی زندگی کے کچھ ایسے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ بہر حال اس کتاب کی اشاعت کے بعد راجستھانی سنستھان جھونجھنوں "سندر سنستھان لکشمن گڑھ" ضلع پرشاسن جھونجھنوں کے علاوہ بھی کئی اور سنستھاؤں نے ان کا سمان کیا ہے۔

در اصل ان کا یہ کام ایسا ہے جس پر راجستھان کی بدہان راجستھانی اور اردو اکادمیوں کو خاص طور پر توجہ فرمانی چاہیے۔ مگر مقام تعجب ہی نہیں افسوس بھی ہے کہ ایسے ادارے آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ ——— "غالب راجستھانی میں" کے بعد "اقبال راجستھانی میں" کتاب کو ترتیب دینے میں یوسف صاحب مصروف ہیں۔ راجستھانی زبان میں لکھنے کے علاوہ انھوں نے اردو زبان میں ہزاروں کی تعداد میں اشعار کہے ہیں۔ انکی تخلیقات "گلدستۂ کمال" "ضیائے طیبہ" "جلوہ زار" "قندیلِ حرم" "جمالِ یوسف" "داستانِ یوسف" "زلیخا" "ماہ پارے" "سوز و سرود" "حاجب تشکر بار" "جھونجھنوں درشن"

(تین حصے) "رانی ستی" "شیخاواٹی کے شاعر"، مثنوی "لالۂ صحرا"۔ (راجستھانی لوک کتھا راموجی ڈان) کے علاوہ بھی اقوامِ عالم کی برگزیدہ ہستیوں پہ کہا گیا متفرق کلام۔

شیخاواٹی کے نامی گرامی طبیب حکیم نور محمد صاحب قریشی (مرحوم) کے صاحبزادے ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۴ مئی ۱۹۲۹ء بروز سنیچر پیدا ہونے والے حکیم یوسف تقریباً چار دہائیوں سے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ذاتی مطب قریشی دواخانہ میں بھی خدمتِ خلق میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ ان کی اس خدماتِ جلیلہ پہ راجستھانی، ہندی اور اردو کے سینکڑوں ادیبوں نے بہت کچھ لکھا ہے جو ملک کے اکثر اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس قدر خصوصیات کا پیکر یوسف صاحب میں نہ تو احساسِ برتری ہے اور نہ احساس کمتری۔ وہ اپنے احباب سے فرماتے رہتے ہیں کہ بھئی میرا جام نہ تو سونے کا کٹورہ ہے اور نہ مٹی کا سکورہ، یہ تو جامِ بلوریں ہے۔ سب سے الگ تھلگ، سب سے علاحدہ۔ البتہ "غالب راجستھانی میں" کتاب دیکھ کر میرے دل میں ضرور ایک کسک سی پیدا ہوئی کہ کاش اتنا بڑا کام اگر کسی بڑے شہر میں یا کسی بڑے ادارے کی سرپرستی میں ہوتا تو یوسف صاحب ملک کے نامور شعراء کی فہرست میں ایک جانا پہچانا نام ہوتے لیکن راقم کے دل کو مسرت بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنی مادرِ وطن جھونجھنوں کی آغوش میں بیٹھ کر یہ کارہائے نمایاں انجام دیکر جھونجھنوں کے نام نامی کو شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جس طرح یوسف صاحب نے اپنی علاقائی زبان میں اردو کے ادباء کے کلام کا ترجمہ کرکے راجستھانی اور اردو کو ایک متحد اسٹیج دینے کی کوشش کی ہے اگر اسی طرح دیگر صوبوں کے شعراء حضرات بھی اپنے علاقے کی زبانوں میں دوسری زبانوں کے فن کاروں کی تخلیقات کا ترجمہ کرنا شروع کردیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی علاقائی بولی یا زبان کی خصوصیات کو دیگر زبانوں کے توسط سے منظرِ عام پہ لانے لگیں تو یہ نہ کہ ملک و قوم کی بہت بڑی خدمت ہی ہوگی بلکہ اس قسم کی تحریک سے ہم اپنے ملک کے قدیم و جدید اثاثے کو اور زیادہ محفوظ رکھ سکیں گے۔ جس کی آج کے تیز رفتار و ترقی پذیر زمانہ میں اشد ضرورت ہے۔

وسیع المشرب، مخلص، انسان دوست، کشادہ چشم و دل وغیرہ اوصافِ حمیدہ کے حامل ہیں جناب یوسف صاحب۔ اردو سے عشق، ہندی سے والہانہ لگاؤ اور اپنی مادری زبان راجستھانی کے شیدا یوسف صاحب ایک درخشاں مستقبل کی جانب محوِ گام و خرام ہیں ؎

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

غزلیں

قاضی انصار

یا لگتا ہے کہ انصار نہ رہنے دینگے
ہر کھنڈروں میں مرے یار نہ رہنے دینگے

ج بھی ہے وہی فرسودہ زمانے کی روش
راستوں کو کبھی ہموار نہ رہنے دینگے

عظمتِ فن کی یہ قدریں ہیں ہمارے دل میں
سی فنکار کو سرشار نہ رہنے دینگے

ب اندھیروں پہ ہر اک سمت سے یلغار ہوئی
ظلمتِ شب کے طلبگار نہ رہنے دینگے

تم بھی انصار ذرا عزمِ مصمم کر لو
مرحلہ کوئی بھی دشوار نہ رہنے دینگے

فریدہ کنول

گھٹ گھٹ کے زندگی جو کٹے بے مثال ہے
رشتہ جو غم سے جوڑے وہ دل باکمال ہے

تسکین ذہن پائے، بدن مضطرب رہے
سمتوں کے اختلاف میں بھی ایک جال ہے

یہ کم نہیں کہ میرا تصوّر ہے بے حجاب
یہ غم نہیں کہ انکی زیارت محال ہے

یادوں کی سمت محوِ سفر میری صبحِ شوق
خوابوں کی خستگی لئے شامِ خیال ہے

میں نے ازل سے پائی ہیں نازک مزاجیاں
جذبوں کی رو میں بہتی ہوئی میری چال ہے

نقیب اکبر

سفر کی پہلی ہی منزل میں کانپ جائیگا
قدم جو تیز کریگا وہ ہانپ جائے گا

بتا رہا ہے یہ سب کو ابال دریا کا
نشان خطرے کا پل بھر میں ڈھانپ جائیگا

اُسے بھی ذائقۂ زہرِ زندگی تو ملے
بچے گا کیا جو مجھے ڈس کے سانپ جائیگا

مرے رویے سے ہوگا نہ کچھ گلہ اُس کو
جو میرے جینے کا انداز بھانپ جائیگا

ہے جس کے آنے کا اک شور اے نقیب اکبر
وہ شخص دیکھ کے مجھکو تو کانپ جائیگا

سے چائے کا سارا مزا کرکرا ہوا۔ اور گھر میں تمہاری وجہ سے جی میں آیا تمہاری گرہستی کا تختہ الٹ دوں۔ اور دودھ والی کا دودھ بھی بند کر دوں۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت کہاں تختہ الٹنے کی جب بھی بات آتی ہے۔ پہلے خود اپنا تختہ الٹنے کا خیال آتا ہے۔ تم عورتیں اور دنیا کی ساری ناکارہ حکومتیں۔ مردوں کی اسی بزدلی کا فائدہ اٹھاتی ہو۔ بولو! اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر بولو، غلط کہہ رہا ہوں۔

گھر میں چائے نہیں ملے تو آدمی بازار میں بھی چائے نہیں پی سکتا ہے۔ بازار میں تو ہر چیز بکتی ہے، چائے بھی، کھانا بھی، عورت بھی۔ لیکن تم اسے کب سمجھ سکی ہو۔ تم یہ سوچتی ہو، سمجھ کی کتاب صرف مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کو اسے پڑھنے کی کیا ضرورت؟ لیکن رانو! یہ تمہاری بھول ہے اس دن میں چائے پینے بازار بھی نہ جا سکا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میرے کپڑے تمہاری ہی لونڈری میں دھلتے ہیں۔ اور ان دن میرے کپڑے گندے ہی الماری میں پڑے تھے۔ اور مجھے صاف کپڑے پہننے کا کتنا شوق ہے جب میں کسی کو گندے کپڑے پہنے دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے یا تو یہ یتیم ہے یا اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ میرے تو ماں باپ بھی ہیں، لائق یا نالائق تم میری ایک عدد بیوی بھی ہو۔ کپڑے گندے پہن کر یتیم یا رنڈوا بنوں؟ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے رانی میرے کپڑوں کی پرواہ کیا کرو۔ کہیں میں کسی دوسرے لونڈری میں نہ چلا جاؤں۔ لیکن تمہارے معدہ نے کب میری باتوں کا خیال کیا ہے۔؟

—— ۔۰۔ ——

ایک سوال

خورشید ملک
تارین ٹکل۔ شاہجہانپور

میں ملٹری جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنی زندگی کی آخری رات گزار رہا ہوں۔ میرا جُرم بہت سنگین نہ ہونے کے باوجود میرا کورٹ مارشل کیا جا رہا ہے۔ صبح مجھ کو فائرنگ اسکواڈ کے سُپرد کر دیا جائے گا جو گولیوں سے مجھے بھون ڈالے گا۔

میں لبنان کی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ میں بیروت کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد ایک اسٹور میں ملازم ہیں۔ میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔ بیروت میں غیر ملکی سیاحوں کی ہر وقت بھرمار رہتی تھی لہٰذا میری معقول آمدنی ہو جایا کرتی۔ میری ایک چھوٹی بہن تھی جو بیروت ریڈیو اسٹیشن میں اناؤنسر تھی۔

میں نے اپنے لئے ایک لڑکی بھی پسند کر لی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ بہن کی شادی کر لینے کے بعد اپنی محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گا۔ بہن کی شادی طے ہو چکی تھی۔ میں ایک خوشگوار مستقبل کے انتظار میں بے چینی سے دن گزار رہا تھا مگر اچانک ایک اندوہناک حادثہ ہو گیا۔ انجام کار میں اس وقت ملٹری جیل میں اپنی زندگی کی باقی ماندہ چند گھڑیاں گزار رہا ہوں۔

فرانس نے ہمیں آزادی ضرور بخشی مگر ایک مستقل عذاب میں ڈال گئے۔ آزادی کے بعد ہمیں سکون کا ایک دن بھی نصیب نہ ہو سکا۔ ہمارے گلے سے غلامی کا آہنی طوق تو اُتار دیا مگر جاتے جاتے قانون نافذ کر گئے کہ لبنان کا ہمیشہ صدر عیسائی وزیرِ اعظم سُنّی مسلمان اور اسپیکر شیعہ مسلمان ہوا کریگا۔ دُنیا کے سامنے بظاہر اُنھوں نے قومی اتحاد قائم کرنے کا بہترین نمونہ پیش کیا مگر پسِ پردہ ان کی سازش تھی کہ یہاں کبھی اتحاد کی فضا قائم نہ رہ سکے۔ قومی اتحاد کا نعرہ سبھی لگاتے ہیں مگر عمل کوئی نہیں کرتا۔ قومی اتحاد کی اگر صحیح معنوں میں کہیں مثال مل سکتی ہے تو صرف چوروں، غنڈوں، ڈاکوؤں، جیب کتروں و دیگر سماج دشمن عناصر میں ہی مل سکتی ہے۔ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد عیسائیوں، سُنّیوں اور شیعوں کا آپسی اختلاف بڑھتا گیا۔ پورا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ بیروت کی آبادی تین حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ سُنّی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان میں عیسائی آباد ہو گئے۔ اسرائیل کا غیر قانونی طریقے سے عمل میں آ جانے کی وجہ سے فلسطینی پناہ گزیں

کثیر تعداد میں لبنان آ گئے تھے۔ اسرائیل ان کی عارضی
پناہ گاہ کے حق میں نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے لبنان کی
سیاسی فضا کو مزید مکدر کرنے کی کوشش شروع کر
دی۔ اسکو امریکہ کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس طرح
ہمارا ملک خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سازش
کا بھی شکار ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ
خانہ جنگی کو سرد کرنے کی کوشش کرے یا اسرائیل
سے دفاع کرنے کے انتظامات کرے۔ آخر وہی ہوا جس
کا خدشہ تھا۔ اسرائیل نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ اسکا
اصل نشانہ بیروت تھا۔

ہماری فوجوں نے نہایت دلیری سے بیروت کا
دفاع کیا مگر اسرائیل کو امریکہ کی حمایت حاصل ہونے کے
علاوہ عیسائیوں کی ہمدردی بھی حاصل تھی۔ عیسائیوں
نے درمیان میں آباد ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں
نے مسلمانوں کی بجلی اور پانی کی سپلائی بند کر دی۔
فلسطینی پناہ گزینوں کو پہنچنے والی امدادی رسد میں روڑے
اٹکائے اور ہماری فوجوں کو پہنچنے والی کمک میں اڑچنیں
ڈالیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری فوجوں کو شکست ہونے
لگی۔ بیروت کا کافی حصہ اسرائیل کی بربریت کا شکار
ہو کر ملبہ کا ڈھیر بن گیا۔ اس کے خوبصورت چہرہ پر بدنما
داغوں کی بہتات ہو گئی۔ اقوام متحدہ کی طرف سے جنگ بندی
کی اپیل ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر جنگ رک گئی مگر
مخاصمتی تناؤ بدستور قائم رہا۔ جنگ بند ہو جانے کے فوراً
بعد اسرائیلی فوجیوں نے نہتے فلسطینی پناہ گزینوں
پر اندھا دھند گولیاں برسا کر ان کا قتل عام کیا۔
پوری دنیا نے ان کے اس ذلیل عمل کی سخت مذمت
کی۔ مگر اسرائیل کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بعد میں
بیشتر فلسطینی پناہ گزینوں کا انخلاء عمل میں آیا۔ پہلے
ان کو تریپولی لے جایا گیا اور بعد میں مختلف مقامات پر
منتشر کر کے ان کی اجتماعیت کو ختم کر دیا گیا۔ اب غالباً
وہ دوبارہ منظم ہو کر اپنے ملک فلسطین کی مانگ کرنے
کے قابل نہیں رہ گئے ہیں۔

لبنان کو عارضی طور پر اسرائیلی جنگ بندی کر لینے سے
نجات مل گئی تھی مگر خانہ جنگی بدستور جاری تھی۔
انہیں دنوں صدر کا قتل ہو گیا۔ ان کے بھائی نئے
صدر بنے۔ انہوں نے وزیر اعظم اور اسپیکر اور کابینہ
کی مدد سے خانہ جنگی کی آگ کو سرد کرنے کی بھرپور کوشش
کی مگر لبنان دشمن طاقتیں قطعی اس کے حق میں نہیں تھیں۔
کہ یہاں امن و امان کی فضا قائم ہو سکے۔ چنانچہ خانہ
جنگی جاری رہی۔ وقتاً فوقتاً اسرائیل بھی اپنی جارحانہ
کارروائیوں سے باز نہیں آتا تھا۔ انہی دنوں وہ
وہ حادثہ ہو گیا جس نے میری زندگی کے پرسکون جھیل
میں زبردست ارتعاش پیدا کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک
رات میری بہن اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپس آرہی
تھی کہ راستہ میں چند اسرائیلی فوجیوں نے اسکی عزت
لوٹ لی۔ وہ بیچاری اپنے نایاب گوہر کے ریزہ ریزہ
ہو جانے کے صدمہ کو برداشت نہ کر سکی اور ایک پہاڑی
سے کود کر جان دے دی۔ میرے والدین صدمہ سے

گیا

گئے مگر میرا خون کھول گیا۔ صدمہ اور غصہ کی
یرے اوپر دیوانگی طاری ہوگئی۔ یکایک میں نے
ر میں ٹیکسی چلانا چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔
ے والدین کی التجا پر غور نہ محبوبہ کے آنسوؤں
اور فوج میں آگیا۔

نان اس وقت سخت خانہ جنگی کا شکار
سرائیل اس صورت حال کا خوب فائدہ
ا تھا۔ اس نے پی۔ ایل۔ او کے سربراہ کے
ر پر بمباری کی مگر خوش بختی سے وہ اسوقت
ود نہ تھے۔ عیسائیوں میں بھی دو گروپ ہو گئے
ب افراتفری کا عالم تھا۔ نہ معلوم کتنی معصوم
گناہ زندگیاں اس خانہ جنگی کی لعنت کا شکار

ہو گئی تھیں۔ یہ خانہ جنگی اسرائیل سے لڑی گئی جنگ سے
کم خطرناک ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ کم از کم میرے
لئے یہ ایک نہایت زبردست المیہ ثابت ہوئی۔ میں
اتفاق سے اس وقت بیروت فرنٹ پر تھا۔ میں نے
دور بین سے دیکھا کہ جہاں میری محبوبہ اور میرے والدین
رہتے تھے وہاں ملبہ کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نظر نہیں
آرہا تھا۔ انسانیت کا وحشیانہ رقص ختم ہو چکا تھا۔
چاروں طرف نعشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مکانوں
سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دور دور تک زندگی
کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔
میں اپنی بدقسمتی پر افسوس کرنے لگا کہ میں والدین کے
جنازوں کو کندھا دے سکا نہ محبوبہ کے آخری دیدار۔

میرا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میری زندگی اب خود میرے لئے ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔

اسی دوران جب کہ خانہ جنگی عروج پر تھی اقوام متحدہ کی مداخلت پر خانہ جنگی بند ہو گئی۔ اس بین الاقوامی ادارہ کے اغراض و مقاصد میری سمجھ میں آج تک نہیں آسکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کسی جنگ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے مگر یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ اس نے کئی جنگوں کو ٹالا ہے، لیکن اس کی کارکردگی اسی صورت میں موثر ثابت ہو سکتی ہے جب اس کے ممبران خاص طور سے بڑی طاقتیں اپنے اندر وہی جذبہ پیدا کریں جس کے حصول کے لئے اسکا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ ان کو مد ہولز آپس کی سرد جنگ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا چاہیئے۔ دلوں میں کدورت رکھ کر یہ اس ادارہ کے ایوان میں بیٹھ کر کرۂ ارض میں امن کی ضمانت کیوں کر دے سکتے ہیں؟ مزید یہ کہ ویٹو پاور کا اختیار لیکر یہ طاقتیں ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہیں۔

خانہ جنگی وقتی طور پر رک گئی مگر اکا دکا جھڑپیں برابر ہوتی رہیں، کبھی کبھی ہم کو اسرائیل کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا تھا۔ اسی دوران صدر پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔

ایک دن معمولی سی جھڑپ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ ویسے بھی میری زندگی

سچی مٹھائیاں اور ٹافیاں

SOHAIL/81

آر۔ ایس۔ نیلم ...

میں بالکل تنہا ہی تھا۔ مگر اس وقت دور دور تک مجھے کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں تیز قدموں سے اپنے کیمپ کی جانب چل دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں رک گیا اور چھاگل کھول کر پانی پینے جا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے چند قدم دور ایک یہودی فوجی افسر زخموں سے نڈھال پڑا تھا۔

اس کو دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کمبخت یہاں کیسے آگیا؟ ضرور اس نے آج کی جھڑپ میں حصّہ لیا ہوگا۔ اسی کے ملک نے لبنان پر کئی حملے کئے ہیں، اسی کے ساتھیوں نے میری بہن کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا، بیروت کے حسین خدوخال انہیں لوگوں کی وجہ سے مسخ ہوئے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے فلسطینی در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کی بربریت کی داستانیں قیامت تک نفرت کے ساتھ دہرائی جاتی رہیں گی۔ لہٰذا کم از کم اس موذی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے۔ وہ زخموں سے نڈھال تھا۔ اس کے اوپر گولی ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تو رائفل کے کندے کی ضرب سے یا بوٹ کی ٹھوکر سے ہی جہنم رسید ہو سکتا ہے۔ میں اس کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس کو کس طرح ختم کروں؟ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ بوٹ سے اس کا سر کچل دوں۔ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے میں نے اپنا دایاں پیر اٹھایا ہی تھا کہ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور نہایت ہی نحیف آواز میں پانی مانگا۔ لیکن جب اس نے مجھ کو اپنے اوپر مسلط پایا اور میرے تیور کو محسوس کیا تو خوف سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ غالباً وہ مایوس ہو کر موت کا انتظار کرنے لگا۔

یکایک میرے دماغ میں خیال آیا کہ زخموں سے نڈھال یہ فوجی افسر تنہا ہی لبنان کا امن درہم برہم کرنے کا ذمّہ دار تو نہیں ہے۔ میری بہن کی موت کا، بیروت کی بربادی کا اور فلسطینیوں کی جلاوطنی کا یہی اکیلا تو ذمہ دار نہیں ہے۔ کیا اس کو ختم کر کے لبنان میں امن قائم ہو جائے گا؟ میری بہن مجھے واپس مل جائے گی؟ بیروت کی خوبصورتی واپس آجائے گی؟ فلسطینیوں کا ملک واپس مل جائے گا؟ ظاہر ہے کہ میرے ہر سوال کا جواب نفی میں ہی تھا تو پھر اس کو ختم کرنے سے کیا فائدہ؟ اس زخمی اور پیاس کے مارے کو مار ڈالنا کہاں کی مردانگی ہوگی؟ انسانیت کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کا احترام کرنا بہرحال انسانی فریضہ ہے۔

میرے ذہن میں نفرت اور ہمدردی کے مابین جنگ ہونے لگی۔ کبھی نفرت کا پلڑا بھاری ہو جاتا اور کبھی ہمدردی کا۔ اسی انتشار میں اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ مجھ کو بدستور مسلط دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک آگئی۔ پھر اس نے یاس بھرے لہجے میں پانی مانگا۔ اسی لمحہ ہمدردی نے نفرت کو فیصلہ کن شکست دیدی۔ میں نے فوراً جھک کر چھاگل اس کے منھ سے لگا دی۔ اس نے جلدی جلدی

ہنس گیا
کچھ گھونٹ پانی حلق سے اتارے اور تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہی میں اسے پانی پلا کر کھڑا ہوا میں نے اپنے آپ کو چند اسرائیلی نوجوانوں کے نرغے میں گھرا ہوا پایا۔ وہ غالباً اپنے افسر کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپتے ہی اس افسر نے سختی سے ان کو منع کیا۔ وہ اسے اٹھا کر لے جانے لگے مگر اس کی نگاہیں اس وقت تک مجھے دیکھتی رہیں جب تک وہ لوگ ایک پہاڑی کی آڑ میں نہ ہو گئے۔

میں پھر تنہا رہ گیا۔ تنہائی تو میرا مقدر بن چکی ہے۔ اچانک مجھے اپنی پیاس یاد آئی۔ میں نے چھاگل منہ سے لگا کر پانی پیا۔ مجھے چھاگل پر اس اسرائیلی فوجی افسر کے خشک ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں تیز قدموں سے اپنے کیمپ کی طرف چل پڑا۔ مگر کیمپ پہنچتے ہی مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ دوربین سے پانی پلانے کا منظر دیکھا جا چکا تھا۔ لہٰذا دشمن کی مدد کرنے کا جرم عائد کر کے مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں شمال سے صبح کی سفیدی نمودار ہونا شروع ہو جائیگی۔ رات کی مسافت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری زندگی کی مسافت بھی تمام ہو چکی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے تمام صعوبتوں سے نجات مل جائے گی۔ قید حیات کی آہنی زنجیروں سے آزادی نصیب ہو جائیگی۔ مگر میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہے کیونکہ میں اپنے عمل پر قطعی ندامت نہیں محسوس کر رہا ہوں۔ اسی لئے میں ہنسی خوشی موت کو گلے لگانے کو تیار ہوں۔

کیا آپ بھی مجھے مجرم سمجھتے ہیں؟

یہی ایک سوال میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں! ▲

بقیہ: شہرِ لالہ و گل

کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"چاند کی تیرہویں رات کو بادشاہ
چراغوں کی اس نمائش کو دیکھتا تھا۔
جو وتستا کے جنم دن کی پوجا کے موقع پر
ہوتی تھی۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر راجدھانی
کی طرف چل دیتا۔ سطح آب پر تیرتے
ہوئے گیت سنتا اور کشتی پر سوار ہونے
سے پہلے یا بعد میں شہریوں کی دعائیں لیتا۔
..... دریا کے کنارے پر جلتے ہوئے
چراغوں کی قطاریں حسین لگتی تھیں
ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وتستا کی
پوجا کے لئے دیوتاؤں نے سنہری پھول
بکھیر دیئے ہیں۔" ع۲۵

سرینگر اور وتستا ——— ان دونوں کا تصور ایک دوسرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کے حسن کا سب سے تیکھا رنگ اسی شہر اور اسی ندی کے باعث ہے ▲▲

ع۲۵ پی۔ این کے بازاز "اے ہسٹری آف کشمیر" ص۱۴۵

نسیم بن آسی

عورتوں کا معدہ

تم برا مت مانو۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ہمارے شاعر عورتوں پہ دیوان کے دیوان لکھ ڈالے ہیں۔ افسانوں میں ہر جگہ وہی عورت، لیکن ان کا معدہ ۔ ۔ ۔ ؟ تمہیں میری بات پسند نہیں آ رہی ہے نا؟ اس میں تمہارا اپنا معدہ بھی تو شامل ہے تم ضد کر رہی ہو میں مردوں کے معدے کے بارے میں کیوں نہیں لکھ رہا ہوں۔ عورتوں کے معدہ میں جو بات ہے وہ مردوں میں کہاں؟ تمہیں تو عورتوں سے متعلق میری ہر بات ناپسند ہے۔ اس دن میں نے اس نوجوان لڑکی کو بہن جی کہہ دیا تھا اور تم برا مان گئی تھی۔ تم عورتیں یہ جانتی ہو ہر لڑکی پہلے بہن ہوتی ہے۔ بعد میں معاشقہ۔ لیکن میں نے کب اس کی پرواہ کی ہے۔ پرواہ کرتے تو تم میری بیوی ہو کر میرے ساتھ غیر بیوی کا سلوک کرتی۔ ابھی کل ہی کی بات ہے میں تمہیں اپنا افسانہ سنا رہا تھا۔ اور سوچا تم اس پہ اپنی بھلی یا بری رائے ظاہر کرو گی لیکن تم اسے سنتے وقت سو گئیں۔ میں ناراض ہوا تو تم نے کہا نیند بھی تو ایک رائے ہے بولو۔ میری قسم کھا کر بولو۔ تم نے کہا تھا یا نہیں۔

وہ جو صبح یہاں دودھ لے کر آتی ہے اس کا نام؟ معلوم نہیں۔ اچھا اس جھاڑو لگانے والی کا نام تمہیں معلوم ہے؟ نہیں! آخر اس کا بھی تو کوئی نام ہوگا میں ایک دن اس کا نام ضرور پوچھوں گا۔ اور دیکھنا وہ اپنا نام نہیں بتائے گی۔ عورتیں مردوں سے اپنا سب کچھ چھپاتی ہیں۔ یہاں تک کہ نام بھی۔ وہ جتنا اپنے آپ کو چھپاتی ہیں وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس عورت کی طرح جو آنچل میں چھپا کر اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور سوچتی ہے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے۔ وہ دودھ والی ناک میں اب بھی بلاک پہنتی ہے اس نے ضرور آئینہ دیکھا ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں اس کا آئینہ اس کو دھوکا دیتا ہے جیسے بہت سے لوگوں کا آئینہ ——— تم عورتیں یہ سمجھتی ہو —! خوب صورتی زیور سے آتی ہے لیکن یہ وہم ہے یہ بات عورتیں جان لیں تو سونے کا بھاؤ یکایک گر جائے۔ اور گھر کا بجٹ بنانے میں شوہروں کو زیادہ دماغ پہ زور نہ دینا پڑے عورت خود ایک خوب صورتی ہے جو کسی سونا یا چاندی کی محتاج نہیں۔ سونا تو مٹی ہے جسے عورت اپنے بدن پہ ڈالے رہتی ہے۔

جاڑے کی صبح کتنی سہانی ہوتی ہے۔ اس میں گرم گرم چائے ملتی ہے لیکن اس میں کسی عورت کا معدہ

شامل ہو جائے تو وہ بھی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ میری بات نہیں سمجھی؟ دیکھو دالو! ہم شاعر اور ادیب بات ذرا دوسرے انداز سے کہتے ہیں۔ غالب کو تو پڑھی ہوگی؟ اس کا کون شعر تمہیں جلدی سمجھ میں آتا ہے؟ بہت سر مارنے کے بعد کچھ سمجھتی بھی ہو تو اس کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو ماہر غالبیات سمجھتے ہیں۔ شاعر بھی اپنے شعروں کو صحیح نہیں سمجھتے۔ وہ تو صرف شعر کہتے ہیں سمجھتے نقاد حضرات ہیں۔

میری طرح ناصر بھائی بھی چائے کے عادی ہیں۔ میں چائے کو دھیرے دھیرے پیتا ہوں۔ وہ دو گھونٹ میں ہی اسے ختم کر دیتے ہیں۔ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں ناصر بھائی! تم چائے کے ساتھ بہت ظلم کرتے ہو۔ چائے کو عورت سمجھو اور اسے دھیرے دھیرے ختم کرو۔ جب اس سمجھ والے گا۔ لیکن ان کی طرح ان کی عقل بھی موٹی ہے وہ اس باریکی کو کیا سمجھیں۔

میں اس دن بہت بور ہوا۔ جیسے کبھی کبھی تم بور کرتی ہو سا یک لکڑی کا وہ تخت جس پر ہم بیٹھے تھے۔ چائے کی لطافت کا گلا گھونٹ دے رہا تھا۔ دوسرے وہ دودھ والی۔ جو میرے یہاں دودھ لے کر آتی ہے۔ وہی تو ناصر بھائی کو بھی دودھ دیتی ہے۔ وہ دودھ لے کر آئی ٹھیک وقت پر۔ لیکن اس کا بھی معدہ کمزور ہے۔ باتیں ہضم نہیں ہوتیں عورت جو تھا؟ وہ ادھر ہی کہیں ناصر بھائی کی ماں سے بات کرنے لگی۔

چائے کی بھی طلب کتنی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی یہ طلب اتنی تیز ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کچھ کھو گیا ہے۔ تم جانتی ہو میں سگریٹ پیتا نہیں۔ شراب کو پیشاب سمجھتا ہوں — چائے سوچو میں کب پیتا تھا؟ چائے کا شوق مجھے مولانا آزاد کی کتاب "غبار خاطر" پڑھ کر ہوا۔ تم جانتی ہو بڑے آدمی جو کرتے ہیں اس کی نقل عوام بہت جلد کرنے لگتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں چوری، ڈکیتی اور رشوت خوری عام ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی بڑے لوگ ہیں۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے چائے چین سے آئی ہے۔ اور یہیں سے ساری دنیا میں پھیلی ہے لیکن چائے میں دودھ ملا کر پینے کا رواج انگریزوں نے قائم کیا ہے۔ جس سے اس کی تلخی کم ہو جائے۔ لیکن دالو! مجھے تلخ ہی چائے زیادہ پسند ہے تم جانتی ہے ملاوٹ سے مجھے سخت نفرت ہے۔ چائے ہو یا اپنے ملک کی سرکار! میں سچ کے ساتھ جھوٹ کبھی نہیں ملا سکتا۔ ایسا کرنا اپنے ضمیر کے ساتھ ملاوٹ کرنا ہے۔ اسی لئے لوگ مجھے برا سمجھتے ہیں گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن میں اس کی پروا کئے بغیر اپنی ہی صلیب پر لٹک رہا ہوں۔

تم مجھے کوئی دیوانہ سمجھنے لگی تھا۔ خیر کوئی بات نہیں! ہر دور میں دنیا ایسے لوگوں کو دیوانہ سمجھتی ہے۔ لیکن آج دنیا کو ایسے ہی دیوانوں کی ضرورت ہے۔ جگر مرادآبادی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

کیا جانئے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

لو پھر سچ کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ ناصر بھائی نے کئی بار اٹھ کر آنگن میں جھانکا بھی۔ جیسے انہیں میری طرح چائے کی طلب پریشان کر رہی تھی لیکن انہیں کبھی چائے کی اتنی طلب ہوئی نہ کسی تلخی کی۔ تلخی کی طلب تو کسی کسی کو ہوتی ہے وہ صرف میرے لئے جھانک رہے تھے۔ کئی آواز دینے پر اندر سے چائے آئی۔ جو تلخ تھی نہ گرم۔ چائے پہلے ہی کپ میں نکل چکی تھی۔ لیکن اس دودھ والی کے

معدہ کو کیا کہا جائے۔ پھر ناصر بھائی کی بیوی کا بھی تو معدہ
تھا۔ اب تمہیں بتاؤ۔ جہاں دو عورتوں کا معدہ شامل ہو
جائے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔

اس دن میں بہت بور ہوا۔ کبھی کبھی تم عورتوں
سے کتنا بور ہونا پڑتا ہے۔ تم کہو گی کبھی کبھی مردوں سے بھی
بور ہونا پڑتا ہے ہاں کچھ ایسے بھی مرد ہوتے ہیں جو عورتوں
کو بور کرتے ہیں لیکن کبھی میں نے تمہیں بور کیا ہے؟

یہ جو تمہارے سامنے نیا کرایہ دار ہے اس کو
آئے کتنے دن ہوئے؟ دو سال تو ہو ہی رہے ہوں گے۔
اس کا نام شمشیر ہے اور میں اسے شمشیر بہادر سنگھ کہتا ہوں
داڑھی بڑھنے کی وجہ سے کچھ لوگ اسے مولوی صاحب بھی کہتے
ہیں لیکن تم جانتی ہو۔ اس کی داڑھی میں بھی خرگوش ہے
جیسے بہت سے لوگوں کی داڑھی میں ہوتے ہیں۔ ہاں تمہیں
نے تو بتایا تھا اس کی بیوی ہندو ہے۔ جو اس کے ہی
گاؤں کی رہنے والی ہے لیکن مجھے بتاؤ رانو! محبت
کی بھی کوئی برادری ہوتی ہے؟ کوئی مذہب ہوتا ہے؟
کوئی ذات ہوتی ہے؟ اجالوں نے ساتھ چھوڑا، اور
اندھیروں نے ساتھ دیا۔ اور تم جانتی ہو محبت صرف
اندھیروں میں ہوتی ہے۔ لیکن رانو! اس کرایہ دار
نے ان ساری باتوں پر کیا پردا ڈال رکھا تھا۔ اس کی
بیوی نے اس راز کو فاش کر دیا۔ عورت ہے نا! وہ
بہت کچھ ہضم کر سکتی ہے بات نہیں۔

اس نے یہ ساری باتیں تم سے کہیں اور مطمئن
ہو گئی۔ تم کسی سے نہیں کہو گی۔ حالانکہ ہر عورت اپنے دل کی
بات دوسری عورت سے کہہ کر ہی ہلکی ہوتی ہے۔ لیکن تم
نے مجھ سے کہہ دیا۔ تو تمہارا معدہ [illegible]

اب میں ان دونوں عورتوں کو کیا کہوں —
سوئٹر کی سلائی کے ساتھ ان کی زبانیں بھی چل رہی تھیں۔
سوئٹر کی سلائی اور زبان میں جانے کیا تعلق ہے سلائی
سوئٹر بنتی ہے زبان — باتیں — یہ عورتیں سوئٹر
گھر پر بھی بن سکتی تھیں۔ لیکن خوب صورت [illegible] تہذیب
بھی اندر سے باہر آ گئی ہے اور وہ دیکھنے والوں کی
آنکھیں چاہتی ہیں۔ وہ سائیکل والا بار بار گھنٹی بجا رہا
تھا۔ بات یہ ہے رانو! ہم عورتوں کی اس لیے عزت کرتے
ہیں کہ وہ ہماری عزت کریں۔ عورتیں جب کسی مرد کی عزت
کرتی ہیں۔ تو تم جانتی ہو۔ پھر بھی نہ جانے مرد ان کی عزت
کا بھوکا رہتا ہے؟ جہاں خاصی بھیڑ دیکھی ان پر گرتا۔
عورتیں جب گرتی ہیں تو انہیں عزت ملتی ہے۔ مرد کسی
عورت پر گرتا ہے تو گرتا ہی جاتا ہے۔ سڑک پر کافی بھیڑ
تھی اور ان دونوں عورتوں کا معدہ کافی کمزور تھا وہ
گھنٹی کی آواز نہیں سن سکیں۔ حادثہ تو ہوا ان دونوں
عورتوں کی کمزور معدہ کی وجہ سے لیکن سائیکل والے
کی بھرے بازار میں ناحق پٹائی ہو گئی۔

اس دن میں ناصر بھائی کے گھر سے سیدھے
اپنے گھر آیا چائے کی طلب اسی طرح تھی۔ جیسے کسی کو
سگریٹ کی طلب ہوتی ہے۔ چینی نہ ہو تو گڑ کی بھی
چائے چل جاتی ہے جیسے کبھی کبھی کالی لڑکی یا کالا لڑکا چل
جاتا ہے لیکن تمہارے گھر میں گڑ بھی کہاں تھا؟ [illegible]
گڑ کا بھی بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس دور میں کون
سی چیز سستی ہے تمہارا حسن، تمہاری مسکراہٹ
یا تمہاری محبت؟

ناصر بھائی کے ہاں اس دودھ والی کا [illegible]


چمکتی سفیدی کیلئے
مودی
دھلائی کا صابن
پنجاب سوپ فیکٹری

عابد معز

خوشحالی کا تکون

عنوان پڑھ کر آپ نے اگر ہمارے مضمون کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی سے قائم کیا ہے تو آپ کا اندازہ صحیح نہیں ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لال تکون سے بھی زندگی میں وہ خوشحالی نہیں آ سکتی جو ہمارے تکون میں مضمر ہے ہمارا تکون خوشحالی تین "ش" پر مشتمل ہے خوشامد، سفارش اور رشوت، محنت کا پھل، مسئلہ کا حل، امتحان کا نتیجہ، ہر شئی کی قبولیت، آمدنی کی برکت غرض ہر پہلو سے زندگی میں خوشحالی کا راز و ملاء ہمارے تکون پر منحصر ہے۔

خوشحالی کے تکون پر عمل خوشامد سے شروع کرنا چاہئے۔ خوشامد سے زندگی میں خوشی آتی ہے۔ خوشامد کے معنی لوگوں کو خوش کرنا ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ دوسروں سے مسکرا کر ملیں، علیک سلیک میں پہل کریں اور خیر خیریت دریافت کرتے رہیں۔ ایسا کرنے سے لوگ آپ سے خوش رہیں گے۔ آپ کی تعریف کریں گے اور آپ کو با اخلاق اور باکردار سمجھا جائے گا آپ کا حلقہ احباب وسیع ہوگا۔ ہر جگہ آپ کو جاننے اور پہچاننے والے پیدا ہوں گے۔ جو آپ کی مدد کرنے کے لئے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے لوگوں کو خوش رکھنے کا یہ ایک عام طریقہ ہے اس کے علاوہ مختلف اشخاص کو خوش رکھنے کے لئے مختلف طریقے اپنانے پڑتے ہیں اس لئے کہ ان کے خوش ہونے کے معیار جدا ہوتے ہیں۔

کاروباری دنیا میں مسکراہٹ، میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں اس مسکراہٹ کا نام PROFESSIONAL SMILE ہے مسکراہٹ اور اچھی اور پیاری باتوں سے سامنے والے کو مسحور کرنے کے بعد اپنا الو سیدھا کیا جاتا ہے آپ نے اخبار میں یہ خبر ضرور پڑھی ہوگی کہ امریکہ میں ایک دوکان پر سیلزمین کی باتوں سے متاثر ہو کر صحرائی شیخ نے پانی میں چلنے والی کشتی خریدی تھی۔ دور کیوں جائیے ہم خود اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔ آج تک ہم نے کپڑے اور جوتے یہ کہہ کر نہیں خریدے ہمیشہ بیچنے والوں کی باتوں سے دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ مسکرانے، میٹھی اور پیاری باتیں کرنے کے لئے آج کل سیلزمین کی بجائے سیلز گرل کو فوقیت دی جا رہی ہے۔ سیلز گرل کی باتوں سے بھی کام نہ بننے پر ترغیبات کے طور پر تحفتاً کوئی نہ کوئی چیز دی جاتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ صابن کے ساتھ صابن دانی، ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ برش، پوڈر کے ساتھ فلمی حسینہ کی تصویر یا مٹی

ماہنامہ سہیل گیا

کی جاتی ہے۔

سماجی زندگی میں آپسی تعلقات استوار رکھ کر اپنا کام نکالنے کے کئی طریقے ہیں۔ آپسی تعلقات کو تعلقات عامہ یعنی PUBLIC RELATIONS کا نام دیا گیا ہے۔ سال نو، عید اور تہوار، شادی، بیاہ اور دوسری تقاریب پر مبارکباد اور سانحہ یا حادثہ پر تعزیت پیش کرنا معمول کی باتیں ہیں۔ الفاظ اور جذبات کے اظہار سے تعلقات میں اتنی پختگی نہیں آتی جتنی کہ لنچ یا ڈنر پارٹی دینے سے آتی ہے۔ اسی لئے وقتاً فوقتاً کام کرنے والے دوست احباب اور ذی اثر لوگوں کی دعوت کرتے رہتے ہیں۔ سردی میں گرم چائے، گرما میں ٹھنڈا مشروب، آئس کریم، اور بلا قید موسم کھانے کی دعوت دلوں کو رام کر لیتی ہے۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی عنوان سے پارٹی دیتے ہیں سال میں دو مرتبہ خود اپنی سالگرہ، ایک مرتبہ بیوی اور بچوں کی سالگرہ، عید ملاپ، تہنیتی اور دعائی پارٹیاں دینا ان کا معمول ہے۔ دعوتوں سے اور دعوتوں میں آپسی تعلقات بڑھتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔

سیاسی زندگی میں خوشامد اہم مقام رکھتی ہے۔ لیڈر کا شایان شان استقبال کرنا پڑتا ہے۔ خیر مقدمی کتابیں رنگین جھنڈیاں، پوسٹرس، گل پوشی سے کر جلوس نکالنا پڑتا ہے۔ جلسے منعقد کرنے پڑتے ہیں۔ جلسے میں کئی اشخاص جھوٹی اور غیر ضروری باتوں سے قائد کو خوش کرتے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے اپنا اپنی وفاداری کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ قائد کے ایک سالہ دو سالہ، پنج سالہ خدمات کے اعتراف میں جلسے کروانا پڑتا ہے۔ قائد کی ششٹی پورتی تقاریب منانی پڑتی ہے۔ قائد کو سکوں میں تولا جاتا ہے۔ نوٹوں کا ہار پہنایا جاتا ہے۔ اور جب صاحب اقتدار قائد مہربان ہو جائے تو پھر کیا کچھ نہیں ہوتا۔

خوشامد سے چند کام بنتے ہیں لیکن صرف خوشامد سے اکثر لوگ مطمئن نہیں ہوتے۔ خوشامد کے ناکام ہونے پر اپنی کوششوں میں سفارش کا اضافہ کرنا چاہئے۔ سفارش دوسروں سے اپنے لئے کروائی جاتی ہے۔ سفارش کرنے والے کا انتخاب سمجھ سوچ کر کرنا پڑتا ہے۔ جس شخص کے پاس سفارش کروانی ہے۔ اس کے عادات و اطوار بلکہ چال چلن کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے دوست احباب کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ نیز اس کی کمزوریوں کے بارے میں معلومات کرنی پڑتی ہیں۔ ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد جو سفارش ہوگی وہ رد نہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ہم ایک نکتہ بتلاتے ہیں اکثر لوگوں کی کمزوری ان کی نصف بہتر ہوتی ہے۔ ہم ایک آفیسر کو جانتے ہیں جو اپنی شرافت، ایمانداری اور محنت مگری کی وجہ مشہور رہے۔ ان کی طبیعت کے خلاف ان سے کوئی کام کروانا ناممکن تھا۔ ایک صاحب نے ان کی بیوی سے اپنی سفارش کروائی۔ آفیسر نے لاکھ اپنی بیوی کو سمجھایا لیکن وہ اڑ گئیں" میں کچھ نہیں جانتی آپ کو میری بات ماننی ہی پڑے گی" اور پھر آفیسر صاحب بقول اکبر الٰہ آبادی سہ

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

سفارش کے تعلق سے ایک اور بات ہم آپ کو گوش گذار کرتے ہیں آج کل سفارش بہت عام اور سستی

ہو گئی ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی سے سفارش کرواتا ہے لیکن وہی سفارش کامیاب ہوتی ہے جس میں سفارش کرنے والے شخص کا صحیح انتخاب ہوا ہو۔ جب سفارش کے لئے صحیح انتخاب نہ ہو یا سفارش کے ناکام ہونے کی صورت میں ہمارے تکون کا آخری پہلو "رشوت" کو آزمائیے۔

خوشامد اور سفارش کے ناکام ہونے پر اپنا کام نکالنے کے لئے رشوت موثر اور کامیاب ترین حربہ ہے۔ ہمارے تکون کے آخری عنصر سے ہر دور رشوت لینے اور دینے کے حصہ میں خوشحالی آتی ہے رشوت کے تعلق سے ہماری فلموں میں ایک ڈائیلاگ اکثر دہرایا جاتا ہے "یہاں ہر چیز بکتی ہے، قیمت لگانے والا چاہئے"۔ رشوت پیش کرتے وقت رشوت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے۔ رشوت احتیاط اور ہوشیاری سے دینی پڑتی ہے۔ رشوت قبول کرنے والے کو محسوس نہ ہونے دیں کہ آپ بحالت مجبوری رشوت دے رہے ہیں۔ رشوت دیتے وقت اپنا رویہ ایسا رکھیں کہ قبول کرنے والا سمجھے کہ آپ خوش ہو کر اسے انعام دے رہے ہیں یا تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ رشوت ایک متنازعہ فیہ لفظ ہے۔ اکثر لوگ رشوت کے نام پر بدک جاتے ہیں لیکن جب یہی رشوت، انعام، تحفہ، محنتانہ، نذرانہ وغیرہ کے نام سے دی جائے تو اسے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ اس قسم کے حضرات کے علاوہ ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لئے ؎

رشوت بھی اختیار کی منزل میں آ گئی

کچھ عرصہ پہلے خوشامد، سفارش، اور رشوت کو یکے بعد دیگرے آزمایا جاتا تھا لیکن جب سے گرانی اور افراط زر میں اضافہ ہوا ہے تینوں حربوں سے ایک ساتھ استفادہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے نوکری کے لئے ان تینوں حربوں کا بہت خوبصورت استعمال کیا۔ ایک صبح صاحب کے گھر میووں کی ٹوکری پہونچا کر کہنے لگے ہمارے ماموں کی دکان ہے جب انہیں پتہ چلا کہ میں آپ کے یہاں جا رہا ہوں تو انہوں نے یہ پھل پھلاری آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دی ہے۔ مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ گئے تو کہنے لگے میرے چچا کا شیرینی کا کاروبار ہے تازہ مٹھائی دیکھ کر میرا دل للچایا، شکم سیر ہو کر کھایا اور تھوڑی سی مٹھائی آپ کے لئے بھی لے کر چلا آیا۔ میرے چچا آپ کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ انہوں نے سلام کہا ہے۔ باہر سے بھائیوں کی آمد کا بہانہ بنا کر کپڑے، سینٹ اور سگریٹ پیش کرتے ہوئے صاحب کی تعریف کرنے۔ صاحب یہ سوٹ کا کپڑا لگتا ہے صرف آپ کے لئے بنایا گیا ہے، کیا پسند ہے صاحب اس برانڈ کا سگریٹ صرف بڑے لوگ پیتے ہیں۔ خالو کی کار میں صاحب کے بیوی بچوں کو تفریح کے لئے لے گئے تو صاحب کی بیوی سے اپنے لئے سفارش کرنے کو کہا۔ نوکری ملنے کے بعد نوازشیں بند ہو گئیں تو صاحب نے وجہ دریافت کی ہمارے دوست نے رقت انگیز لہجہ میں فرمایا، شیرینی کی دکان والے چچا کا دیوالیہ نکل گیا۔ ماموں صاحب انتقال کر گئے۔ خالو اور بھائی صاحبین وطن واپس کر دئیے گئے۔ اب ان تمام خاندانوں کا بار میرے ضعیف و ناتواں کاندھوں پر ہے۔ صاحب خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم فرمائیے میری تنخواہ میں اضافہ اور میری ترقی کی صورت نکالئے آپ کو اس کا اجر ملے گا۔

احتیاط کا تقاضہ ہے کہ خوشحالی کے تکون پر عمل دو رخی ہونا چاہئے۔ لوگوں کی خوشامد کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اوروں کو بے جا تعریف کے لئے مستعد رہنا چاہئے اپنی سفارش کروانے کے ساتھ خود بھی دوسروں کی سفارش کرنا چاہئے۔ رشوت قبول کرنے کے ساتھ خود بھی اوروں کو رشوت پیش کرنا چاہئے یک طرفہ عمل سے خوشحالی کے امکانات کم اور بدحالی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

آخر میں ہم اپنے تکون کی اہمیت کو چند مثالوں سے واضح کرتے ہیں شادی انسان کی زندگی میں انقلاب بپا کرتی ہے شادی کے لئے لڑکے کو رشوت بشکل جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم دی جاتی ہے رشتہ دار لڑکی کی خوب صورتی اور دوسری خوبیوں (جو اکثر موجود نہیں ہوتیں) کو بنیاد بنا کر سفارش کرتے ہیں۔ سسرال والے خوشامد کرتے ہیں اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ کے لئے بھی تکون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ رشوت بشکل چندہ یا عطیہ دینی پڑتی ہے ٹیچروں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ پڑھائی کی تکمیل کے بعد نوکری کے لئے بھی خوشامد کرنی۔ سفارش کروانی اور رشوت دینی پڑتی ہے پرمٹ کا حصول یا مکان کا الاٹمنٹ، راشن یا دودھ کا کارڈ بنوانا ہو، یا اور ایسے ہی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے کام کے لئے جس سے زندگی میں خوشحالی آتی ہے ہمارے تکون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ غرض قابل رشک آرام و آسائش کی زندگی آج محض خوشامد، سفارش اور رشوت کی مرہون منت ہو گئی ہے۔

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

مکرمی جمیل منظر صاحب! سلام و محبتیں

سہیل ملا۔ اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ مضمون "قاضی عبد الودود اور میں" پڑھنے کی اور عبرت حاصل کرنے کی چیز ہے۔ کسی بھی صنف اور فن میں منتہی ہو کر سوچنا کتنا نقصان دہ ہے۔ اس مضمون سے منکشف ہوا۔ اہلِ علم کے یہاں بھی لفظ "دشمن" PREJUDICE کی شکل میں دیکھ کر ملال ہوا۔ تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر گیان چند جین جونیئر سہی لیکن ان کی تحریروں میں شائستگی کا فقدان نظر نہیں آتا ہے۔

گوہر شیخ پوروی کے بعد تسنیم فاروقی کو آپ نے شائع کیا ہے اس کا مطلب آپ ہی سمجھتے ہوں گے۔ ورنہ سچائی تو یہ ہے کہ فاروقی کی ہی غزل حاصلِ حصۂ غزل ہے۔

رونق شہری جھریا

خیراتی تھے اور درزی کا کام کرتے تھے جیسی باتیں نہ تھیں۔ ایسی باتوں کے لکھنے والے کو یاد نہ رہا یا شاید معلوم ہی نہ ہو کہ حکیم الیسپ کون تھا؟ کیا تھا اور اس کا خاندانی پس منظر کیا تھا؟ اور اس کی کہانیوں نے سارے یورپ کو دانشمند کیوں کر بنا دیا؟

یہ بھی اتفاق ہے کہ میں نے بھی قاضی صاحب کی صرف ایک خامی کی بنیاد پر دسمبر ۸۶ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہلدی کی ایک گانٹھ لے پنساری بننے کی کوشش کی تھی۔ اسے پرسوں مکمل کیا اور صاف کر کے امروز و فردا میں خدا بخش لائبریری کو بھیجنے والا تھا۔ آپ کا پرچہ ملا تو خیال آیا کہ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔ پسند آئے تو چھاپ دیجئے گا۔

ابو محمد شبلی۔ لکھنؤ

کل سہیل یا ہمیں ۸۶ ۱۹ء کا موصول ہوا اور گزشتہ شب طبیعت اچھی تھی اسے چاٹ گیا۔ دلچسپی یوں پیدا ہوا کہ ابھی قاضی عبد الودود صاحب کی یاد میں پٹنہ میں Ph.D کے تھیسس پر کوئی مجلس برپا ہونے والی ہے اس مناسبت سے جناب گیان چند جین کا مضمون بہت خوب ہے۔ خوشی ہوئی کہ اس میں ادب اور تنقید ادب کے دائرے ہی میں کی گئی تھی۔ اقبال کے باپ نقویا

ماہنامہ سہیل کے نومبر ۸۶ء کے شمارہ میں ڈاکٹر گیان چند کے مضمون "قاضی عبد الودود اور میں" سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ عابد رضا بیدار کے ذکر والا حصہ خاص طور پر گمراہ کن ہے۔ یہی باتیں گیان چند نے ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے گوشہ گیان چند والے شمارہ میں اپنے مضمون "اخلاقیاتِ تحقیق" میں بیان کی ہیں۔ انھوں نے قیاس کو بنیاد بنا کر ایسی ایسی

باتیں کبھی ہیں کہ ان جیسے محقق کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ گیان چند کا مضمون پڑھ کر میں نے قاضی عبد الودود صاحب کو درج ذیل مراسلہ روانہ کیا تھا۔

۱۳/ اکتوبر ۱۹۸۱ء

محترم المقام! اسلام مسنون

ماہنامہ "شاعر" بمبئی میں ابھی گوشۂ "گیان چند" شائع کیا ہے۔ اس میں گیان چند کا ایک مضمون "اخلاقیاتِ تحقیق" بھی ہے۔ اس مضمون میں گیان چند نے آپ متعصب پرست، بخیل محقق اور ضعیف الحرکات ثابت کیا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے:

"ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پشاوری رجسٹرار اردو جموں یونیورسٹی میں انشا پر ریسرچ کر رہے تھے۔ قاضی عبدالودود دلی آئے تو ان سے وقت لیکر عابد ان سے ملنے گئے اور اپنے موضوع کے بارے میں رہنمائی چاہی۔ قاضی صاحب نے سوچا کہ یہ کون پنجابی ہندو لڑکا آگیا۔ اسے کیا شعور ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ مصحفی کے علاوہ انشا بھی میرا موضوع ہے۔ میں انشا کے بارے میں کچھ جانتا ہوں وہ آپ کو کیا بتاؤں۔" عابد نے کہا "نہ بتائیے۔" اور سلام کرکے اٹھ گئے ۔۔۔ قاضی صاحب نے شاید اس لئے بتانے سے انکار کیا ہوگا کہ وہ انشا پر بھی گاہ گاہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔" (شاعر بمبئی)

اس اقتباس سے نشان زدہ الفاظ دیکھئے:

قاضی صاحب نے سوچا یہ کون پنجابی ہندو لڑکا آگیا ہے۔ اسے کیا شعور ہوگا۔ میں انشا کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ آپ کو کیا بتاؤں۔ عابد نے کہا "نہ بتائیے" قاضی صاحب نے شاید اس لئے بتانے سے انکار کیا ہوگا وہ انشا پر بھی گاہ گاہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

صرف قیاس کی بنا پر گیان چند نے آپ کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی فراخ دلی، دریا دلی، اور تحقیق کے معاملے میں دوسروں کی رہنمائی کی بہت سی مثالیں میرے علم میں ہیں۔ خود میں نے کتنی ہی بار تحقیقی الجھنوں میں آپکی مدد سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور جب میں پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا تب بارہا آپکی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی گفتگو سے روشنی حاصل کی ہے۔ اس وقت بھی آپ نے یہ نہیں کہا کہ "تم ابھی بچے ہو، تمہارا شعور بالیدہ نہیں ہے تم مت آیا کرو۔" بلکہ ہمیشہ آپکی گفتگو سے مستفیض ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ گیان چند نے کس احساسِ کمتری کی وجہ سے یا اپنی تحقیقی انا کو برقرار رکھنے کیلئے آپ پر یہ الزام لگایا ہے۔

بہر حال میں یہ چاہوں گا کہ آپ مندرجہ بالا اقتباس کی وضاحت کردیں تاکہ آپ کی باتیں ان قارئین تک

پہونچا سکوں جو گیان چند کا مضمون پڑھ کر گمراہ ہو رہے ہیں۔ اور ممکن ہے آئندہ کا محقق گیان چند کی ان قیاسی باتوں کو بنیاد بنا کر آپ پر کیچڑ اچھالے۔

امید ہے آپ شکر گزار رہیں گے!

جواب کا منتظر، خاکسار مناظر عاشق ہرگانوی

میرے اس مراسلے کا جواب قاضی عبدالودود صاحب نے برملا دیانت داری سے دیا ملاحظہ ہو:

پٹنہ ۴

۱۴ر نومبر ۱۹۸۱ء

شفیق مکرم! خوش رہیں، عمر دراز پائیں۔ اور اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ خط ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ ڈاکٹر گیان چند نے میرے متعلق جو ایک مضمون لکھا تھا جو "معاصر" کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کا ایک خط آیا تھا۔ جس میں انھوں نے سوال کیا تھا، اور اپنی "دریدہ دہنی" کے لئے معذرت کی تھی۔ میں نے سوال کا جواب دیا، لیکن "دریدہ دہنی" کے بارے میں کچھ نہ لکھا۔ لکھتا تو یہ کہ "دہن دریدہ تر باد" اس کے بہت بعد ان کا ایک خط آیا، جس میں یہ مرقوم ہے کہ آپ میرے نزدیک کل محققین ماضی و حال سے بزرگ تر ہیں۔ آپ چاہیں تو یہ خط شائع کرا سکتے ہیں۔ اس خط کا جواب میں نے نہیں دیا۔ میں اسے شائع نہ کروں گا۔ مجھے انکے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ پٹنہ آئیں تو ضرور ملیں۔ میں یہ خط آپکو دکھا دوں گا۔

عابد پشاوری سے ملنا مجھے یاد نہیں ممکن ہے ملے ہوں۔ ہر کس و ناکس کی مدد میرا فرض نہیں۔

ہاں! ڈاکٹر جین نے اپنی ایک کتاب میں میرے نام معنون کی ہے۔ ان کی روش سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

مخلص: عبدالودود

ڈاکٹر گیان چند نے اخلاقیاتِ تحقیق کا درس دینے سے پہلے اصولِ تحقیق کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے۔ میں نے اپنا خط اور قاضی عبدالودود صاحب کا جواب ہفتہ وار "عظیم آباد ایکسپریس" پٹنہ کے ۸ر اگست ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع کر دیا تھا۔ اور یہ شمارہ گیان چند صاحب کو بھجوایا بھی تھا۔ لیکن اسکے باوجود "سہیل" میں گیان چند صاحب نے اپنے مضمون میں وہی کچھ دہرایا ہے بلکہ قیاس کو بنیاد بنا کر بہت سی بے بنیاد باتیں کہی ہیں جن سے قاضی صاحب کی شخصیت تو مجروح ہوتی ہے ان کے تئیں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ ▲▲

مناظر عاشق ہرگانوی۔ بھاگلپور

فارم۔ ۴، دیکھئے رول ۸

(۱) مقام اشاعت: گیا

(۲) وقفہ اشاعت: ماہنامہ

(۳) پرنٹر کا نام: مسعود منتظر

- کیا ہندوستانی ہیں؟: ہاں
- پتہ: ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ۔ گیا

(۴) پبلیشر کا نام: مسعود منتظر

- کیا ہندوستانی ہیں؟ ہاں
- پتہ: ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ۔ گیا

(۵) ایڈیٹر کا نام: جمیل منظر سنہاروی

- کیا ہندوستانی ہیں؟ ہاں
- پتہ: ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ۔ گیا

(۶) ان کا نام و پتہ جو اخبار کے مالک ہیں اور پوری پونجی کے کم از کم ایک فیصد کے حصہ دار ہیں

میں مسعود منتظر اقرار کرتا ہوں کہ میری معلومات اور یقین کے مطابق اوپر دیئے گئے تفصیل درست ہیں۔

[illegible]



SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
HAJI A. RAHIM KHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)

Regd. P. & T. Gay-4
R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL, Monthly, River Side Road, Gaya-823001
48 years of Publication
Phone : 21573



ماہنامہ

April • May 1987 Rs. 2.5


TRADE JRI MARK
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبُوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE·44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
66/H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL-700 046

بانی: حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سنہاروی ـــــــ بیادگار: زین العابدین احمد ادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل

اپریل و مئی ۱۹۸۷ء

چیف ایڈیٹر	مسعود منظر	مجلس مشاورت		شمارہ ۴، ۵	جلد ۴۹
ایڈیٹر	جمیل منظر	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی		بدل اشتراک فی شمارہ	۵۰/۲ روپے
معاونین	شکیل احمد جمالی	ڈاکٹر قمر رئیس		زر سالانہ	۳۰ روپے
	عبدالقیوم ابدالی	اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر برج پریمی		لائف ممبری	۵۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل ریلور سائیڈ روڈ گیا

نمود

فرقہ وارانہ ہم آہنگی

میرٹھ، دہلی، گجرات یا کہیں بھڑکے فرقہ وارانہ فساد سے تمام امن پسند ہندوستانیوں کا فکر مند ہونا لاحق ہے، پھر بھی فساد ہو رہے ہیں۔ مارکاٹ ہو رہی ہے آگ زنی اور لوٹ پاٹ ہو رہے ہیں۔ سینکڑوں مارے جاتے ہیں، ہزاروں مجروح ہوتے ہیں۔ گرفتاریاں ہوتی ہیں، دھن دولت کی بربادی ہوتی ہے اگر واقعی حکومت فرقہ وارانہ فساد روکنا چاہتی ہے تو سختی برتنی ہوگی فسادات کو روکنے کے لیے حکومت کو مندرجہ ذیل اقدامات فوراً کرنا چاہیے۔

۱۔ کسی بھی عہدے کے لئے ہونے والے چناؤ میں مذہب اور ذات کی بنیاد پر ووٹ نہ مانگے جائیں مسلم ووٹ ہندو ووٹ ہریجن ووٹ، اونچی ذات کا ووٹ پچھڑی ذات کا ووٹ کا قطعی چرچا نہیں کرنی چاہیے اور ایسا کرنے والوں کو سختی سے کچلا جائے۔

۲۔ سبھی فرقہ پرست تنظیموں پر فوراً پابندی عائد کی جائے۔

۳۔ سبھی مذہبی جلوسوں پر پابندی عائد کی جائے اسے مذہبی مقامات یا گھروں تک محدود رکھا جائے

۴۔ اُن فرقہ پرست لیڈران کو نیشنل سیکورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا جائے جو فرقہ پرستی پھیلائیں اور ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف بھڑکائیں۔

۵۔ فساد مخالف دستے تیار کئے جائیں اس میں سبھی فرقے کے لوگوں کو ٹرینڈ کیا جائے تاکہ وہ فساد پر قابو

۶۔ جسٹس مدن، جسٹس سکینہ وغیرہ کی طرح جانچ کمشنوں کی سفارشوں پر فوراً عمل کیا جائے۔

۷۔ قومی ایکتا کانسل کی میٹنگ پابندی سے ہو اور میٹنگ میں کئے گئے فیصلوں پر بے جھجک عمل کیا جائے

۸۔ فرقہ پرستی پھیلانے والی خبروں کی تشہیر روکا جائے اور افواہوں کو فوراً بے اثر کیا جائے۔

جمیل منظر سمنساروی

از:- ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
راج بھون، کوٹلہ مارگ
نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

این کہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب

ڈاکٹر مسعود حسین خان کی شاعری کا ایک مطالعہ

۲۴ فروری ۱۹۸۸ء کی سہانی صبح کو علی گڑھ میں جامعہ اردو کے پڑوس میں "جاوید منزل" اپنے مکرم و محترم کرم فرما ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب سے شرف ملاقات حاصل کرنا تھا۔ ابھی ابھی پروفیسر سرور سے مل کر آرہا تھا۔ سرور کی کیفیت ابھی طاری تھی۔ پھر ساتھ میں کبیر احمد جائسی اپنی نورانی داڑھی کے ساتھ ہمراہ تھے۔ پدماوت کے جائسی سے لیکر صدیقی جائسی تک سبھی کی یادیں آتی رہیں۔ راستہ انھیں کے متعلق باتیں کرتے کٹ گیا۔ پھر کبیر احمد جائسی تو جائسی میں کم ہی رہے ہیں اور دہلی اور علیگڑھ کو چھوڑ کے سوویٹ سینٹرل ایشیا تک پہونچے ہوئے ہیں اور ازبکستان، تاجکستان کی ادبیات میں دخل در معقولات کرتے رہتے ہیں۔

جب مسعود حسین خان صاحب کے دولت خانے پر پہونچا تو پہلی جو اطلاع ملی اسی نے سارا سرور کافور کر دیا۔ "مسعود صاحب علیل ہیں، آرام فرما رہے ہیں"۔ ہم سلام بھجوا کر واپس ہونا ہی چاہتے تھے کہ محترمہ نے فرمایا "ٹھہریے اطلاع کرتی ہوں"۔ پھر دیکھا کہ اودی رنگ کوٹ اوڑھے مسعود صاحب خود ہی تشریف لا رہے ہیں۔ ہم نے معذرت چاہی کہ انھیں زحمت دی مگر مسعود حسین خان صاحب میں تو خلوص اور وضع داری (غالباً حیدرآباد سے حاصل کی ہے یا علیگڑھ مرحوم سے ملی ہو، ویسے اردو کی ابتداء تہذیب، وضع داری ہی کا دوسرا نام ہے) کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ صحت اب ماشاء اللہ ٹھیک ہو چکی تھی۔ اسی دن صبح غسل صحت کیا تھا۔ کچھ بشاش ضرور معلوم ہو رہے تھے (یہ غسل صحت کا اثر تھا یا ہم سے اچانک ملنے کی مسرت یا دونوں کی ملاوٹ کہنا مشکل ہے)

پھر یکایک مسعود صاحب اٹھے، اندر گئے اور دو کتابیں لیتے آئے جو ہمیں عنایت فرمائیں۔ ایک تو ان کی مشہور کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کی ساتویں اشاعت تھی جس میں "نہ صرف پچھلے اٹھائیس سال کی نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ و ترمیمات کی گئی ہیں بلکہ ایک تیسرا باب از سر نو لکھا گیا ہے، ایک طرح سے چوتھا باب اس تحقیقی مقالے کی جان ہے"۔

دوسری کتاب ان کا شعری مجموعہ "روپیم" تھی جو پورے تیس سال کے بعد کچھ اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔
یقین مانئے میں قطعاً ناواقف تھا کہ اردو کے استاذ، لسانیات کے ماہر اور پروفیسر، اردو کا المیہ جنہیں منظوم کئے ہوئے ہے۔ وہی ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب مسعود بھی ہیں اور اعلیٰ پایہ کے شعر کہتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب "جلوتوں کی تنہائی" میں شعر نہیں پڑھتے۔ "خلوتوں کے ہجوم" میں سناتے ہوں تو ہوں۔ اور میں ان محفلوں سے محروم رہا۔ نہ ہی تیس برس پہلے شائع شدہ ان کے شعری مجموعے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے جب اس پر نظر پڑی تو بے اختیار یہ مصرعہ میرے ذہن میں رینگنے لگا۔

ع ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

"تمہید شعر" ہی میں ڈاکٹر صاحب نے کہہ دیا ہے۔

"شعر معاشرے سے ابھرتا ہے لیکن اسے معاشرتی اداروں اور تحریکوں پر مبنی سمجھنا غلط ہے"
شعر "معاشرے" سے ابھرتا ہے، لیکن معاشرتی اداروں اور تحریکوں پر مبنی نہیں ہوتا۔ یہ بات ان معنوں میں صحیح معزول ہے کہ "شعر" کسی تحریک یا ادارے کا "مینی فیسٹو" نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ "معاشرے" سے ابھرتا ہے تو معاشرے میں کارفرما عوامل سے اثر بھی لیتا ہے اور ان پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسی تمہید میں فرماتے ہیں۔

"شاعرانہ شخصیت اپنے معاشرتی ماحول میں بے ہمہ اور باہمہ ہو کر اس طرح مگن رہتی ہے جیسے ہمارا معاشرتی دائرہ کائنات کے طبعی ماحول میں۔"

یہ "باہمہ" اور "بے ہمہ" کا تواتر و تسلسل نہ تو دائرہ میں محصور ہے اور نہ ہی خط مستقیم پر رواں۔ یہ ارتقاء کا زینہ ہے۔ شاعر معاشرہ سے "باہمہ" بھی ہے اور پھر شعری تخلیقی دنیا میں کچھ لمحوں کے لئے "بے ہمہ" ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے اچھے برے ارتسامات سے دارو گیر ہوتی ہے۔ اس کے اپنے شعور سے (جو خود بھی سماجی عوامل اور شاعر کی ساخت و پرداخت سے تشکیل پاتا ہے) اس کے معاشرتی تجربات کی آویزش ہوتی ہے۔ اور پھر شعر کی تخلیق ہوتی ہے جسے لیکر وہ معاشرے ہی مخاطب ہوتا ہے۔ اسی لئے تو شعر، شاعر کی شخصیت کا، جس کی تشکیل و تعمیر میں سماجی عوامل کارفرما ہیں، بھرپور اور موثر اظہار ہے۔ شاعر اور سماج کے درمیان جدلیاتی رشتہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اسی تمہید میں کہا ہے ـــــــــ

"اعلیٰ ترین شعر، حکمت محسوس، ہے۔"

اور یہ بھی ـــــــــ

"شاعرانہ فکر ضروری نہیں کہ دقیع ہو۔ فلسفیانہ ہو مگر اس میں لہو کی گردش ضرور ہو۔"

یہ "حکمت محسوس" اور یہ "لہو کی گردش" کیا ہے؟ "حکمت محسوس" ہی تو شاعر کی منہ سے عصر حاضر کے لئے پیام کہلواتی ہے جو "لہو کی گردش" سے پیدا ہوتا ہے۔ حیات، کشمکش ہی کا حیات افروز نام ہے۔

اس کے بعد اپنی "تمہید شعر" میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ـــــــــ

" آج اردو شاعر کا ذہن، سیاسی، نفسیاتی اور لسانی سطح پر دونیم ہے۔ اس لئے میری شاعری کا سفر بھی گیت سے غزل، فرد سے سماج اور دل سے ذہن کی طرف ہو رہا ہے۔"

یہاں ڈاکٹر صاحب نے اس راز کو فاش کر دیا ہے جو ان کے شعر اور شعری سفر کے پیچھے کار فرما ہے۔

لیکن یہ "دونیم" شخصیت صرف شاعر ہی کی تو نہیں۔ معاشرے کا ہر فرد اسی تجربے سے گذر رہا ہے۔ طبقاتی سماج اپنے زوال کے دور میں انسانیت سے دور ہو کر بہیمیت پر اتر آتی ہے۔ حیات سے نفرت اور موت سے رغبت اس کی خصوصیت ہو جاتی ہے۔ اگر فرد نے پانچ حسین پیدائش سے فطرتاً حاصل کی ہیں اور چھٹی "جمالیاتی حس" اسے تہذیب نے عطا کی ہے، تو مائل بہ انحطاط طبقاتی سماج اس کے اندر "ہوس" کی ساتویں حس پیدا کر دیتی ہے جو جمالیاتی حس کو پامال کر کے اس کے سارے وجود پر حاوی ہو جاتی ہے اور یہیں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے "شق القمر" کا نام دیجئے یا "دونیم" کہئے۔ "ہوس" اور "آسودگی" میں بیر ہے۔ ناآسودگی اس کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ وہ اپنا چہرہ جابر معاشرے کے ٹوٹے آئینہ میں دیکھتا ہے اور بے چین ہو جاتا ہے۔ کیا یہی اس کا چہرہ ہے؟ ٹوٹا ہوا، ٹیڑھا میڑھا۔

غالباً اسی لئے ڈاکٹر صاحب گیت سے (جو عالم سرور و آسودگی یا پھر برہ کے الاپ کی دین ہے) آگے نکل گئے اور نئی غزل سے رجوع ہوئے۔ جو اپنی علامتی زبان میں "نشاط آرزو" سے لے کر "لذت جستجو" تک سبھی کیفیتوں کو آشکارا کر سکتی ہے اس سفر میں وہ فرد سے سماج تک چلے جاتے ہیں۔ اور پھر "کوئے یار سے سوئے دار"۔ دل سے ذہن تک سفر "غم جاناں" سے "غم دوراں" تک سفر ہے۔

اس مجموعے میں ڈاکٹر صاحب کی ۱۹ نظمیں، ۴۸ غزلیں، ۱۲ گیت، ایک ردیف، ۹ قطعات اور ۱۵ منفرد شعر شامل ہیں۔ اشعر، نجیب اشرف ماہ رپروفیسر عمر الدین کی وفات پر نظمیں کیا لکھی ہیں، خون کے آنسوؤں سے خراج محبت پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی نظموں میں آپ کو یہ کچھ ملے گا۔ ————

" ماہ تمام" میں کہتے ہیں ؎

اے مرے ماہ تمام　　تیری محفل کو دوام

.... لیکن اے عالی مقام ....

گریز دیکھئے۔ ———— تیرگی بن گئی اب عیشِ دوام

شاعر کیا چاہتا ہے

کر دے یہ عیش بھی تو مجھ پہ حرام ———— نور کی ایک کرن ماہ تمام

"وادی رنگ" میں یہ رنگ ہے

آج پس جائے گی یہ وادی رنگ

ہیتم و نذر کے عکس بے ایمان　　دامن کوہ کے فردوس نشان

دیکھ کر جن کو فرشتے بھی ہوں دنگ

ایک طرف یہ شان امارت ہے۔ اس کو دیکھ کر شاعر اس طرف گھوم جاتا ہے جہاں کوہ و دشت کے فرزند"

مصروف ہیں اس ایوان کو ڈھانے میں۔ جہاں درانتیاں چمک رہی ہیں اور کدال اچھل رہے ہیں۔

آج دھرتی کا ہے مگر جانا بھید — قلعہ کہسار سے آفتاب پکارا
ہو گیا بیدار رگِ مردہ سنگ — آج پس تہ کے گی یہ وادی رنگ

"زندگی کا خلا" شاعر کا موضوع ہے۔ اسے شاعر کا رویہ سمجھنا غلطی ہوگی۔ سماج کے نا ہموار حالات نے یہ کیفیت پیدا کی ہے یہاں "کربِ حیات" ہے لیکن "لذتِ جہاد" نہیں۔

زندگی کا خلا — یہ نہ بھر پایا کبھی
لالہ و گل کو کبھی پیار کیا — رات بھر تاروں کو بیدار کیا
بھر لیا اس میں کبھی درد مبین — کبھی بے نام مقاصد کی لگن

"بے نام مقاصد" پر غور کیجئے۔ یہ موڈ ہی ہو سکتا ہے۔ رویہ ہرگز نہیں۔

فن کی دیوی نے بھی برسائی شراب — وقت کی موج نے پھینکے گرداب
.... یہ نہ بھر پایا کبھی

ہندستان آزاد ہوا۔ لیکن مجاہدین آزادی نے جو خواب دیکھے تھے وہ چور چور ہوئے۔ اردو کے متعدد شاعروں نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کو سنئے۔

میں نے آزادی کے دن دیکھا تھا — ایک سیلاب نشاط ....
قوم کے تازہ نہال .... — جن کا دل تنگ تھا اور جسم نڈھال
.... — ذرے زیادہ تھے ستارے کم تھے

بھیڑیاں چند اداس ....
جن کی آنکھوں میں نہ نشہ نہ غرور ....
لذتِ شوقِ غلامی سے جو اب تک تھیں چور ....
یوم آزادی نے بخشا نہ جنھیں جذب و سرور ....
مل کے چلتے تھے مگر پھر بھی تھے کم آمیز ....

یہاں ڈاکٹر صاحب نے نوجوانوں اور عورتوں کا حال بیان کیا ہے کہ آزادی نے انھیں کچھ نہ دیا۔ ان کی دنیا نہیں بدلی۔

"مل کے چلتے تھے مگر پھر بھی تھے کم آمیز" میں وہ کیفیت بیان کی ہے کہ آزادی کے بعد ملک جب "دو نیم" ہوا۔ تو لوگوں کے دل میں ایک کو دوسرے کے خلاف شک و شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مل کے تو چلتے تھے مگر کم آمیز تھے۔

آزادی کے ادھورے پن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن مسعود حسین خاں صاحب نے جو دیکھا ہے وہ کچھ اور ہی ہے "ہندکی یہ شب ماہتاب" میں کہتے ہیں۔

ع تونے آسودگئ شوق سے کھایا ہے فریب

"آسودگئ شوق" کی ترکیب توجہ چاہتی ہے۔

"ذہنِ جدید و صداقتِ یقین" میں مسعود حسین خان صاحب یوں گویا ہیں۔

طویل رات ساتھیو — یہ کٹ سکے گی کس طرح

...... بتاؤ کتنی کٹ چکی؟ بتاؤ کتنی رات ہے؟

سحر کی آس پہ جئیں ....

یہاں "آسودگئ شوق" "سحر کی آس" میں بدل چکی ہے۔ اور شاعر کہتا ہے۔

قدم بڑھاؤ ساتھیو — کرن کے تیشے کو لئے

سحر کی جوئے شیر سے — بھریں گے اب ہم پیئے

حیات نو کے نور کا وہ سامنے فرات ہے۔

اس بند میں نہ صرف "فرات" ایک لطیف تلمیح ہے بلکہ عصرِ حاضر کے بدلے ہوئے تیور کی غماز بھی "جمہوریت" کا "صبرِ حسینؓ" جواب تھا لیکن یہ قربانی کی امر کہانی تھی اور اب یہ حوصلے ہیں کہ

سحر کی جوئے شیر سے — بھریں گے اب ہم پیئے

جہد کا طویل راستہ قربانی سے کامرانی تک جاتا ہے۔

اور ڈاکٹر صاحب انسان کو ایک نئے "مدینۂ آدم" کی طرف لے جاتے ہیں۔

وہاں بہار میں کوئی بھی سوگوار نہیں — چراغ ہنس کے یہ کہتے ہیں شہریار نہیں

"شہریار نہیں" کا تلمیحی اشارہ خود طلب ہے۔ فرہاد نے شیریں کو پانے کے لئے شیریں کے خواب کی تکمیل کیلئے (جو ریگستان کو نخلستان میں تبدیل کر کے ان کو قحط اور پانی کی قلت سے نجات دلانے کیلئے پہاڑ کو کاٹ کر دریا کا بہاؤ بدلنا تھا) تیشہ اٹھالیتا ہے لیکن ایک "شہریار" دھوکہ دیتا ہے۔ چاندنی رات میں ریت پر ململ چادر بچھا کر ہوا سے موجوں کی کیفیت پیدا کر کے شیریں کو باور کراتا ہے کہ اس نے پہاڑ کاٹ کر دریا کا رخ بدل دیا ہے اور شیریں اس کی ہو جاتی ہے۔ فرہاد کی محنت و محبت دونوں ہی ایک مسلسل کرب اور فریاد بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ایک ایسے "مدینۂ آدم" کی بشارت دیتے ہیں جہاں اُمید کے چراغ ہنس ہنس کر یہ کہتے ہیں کہ اب اس شہر میں کوئی "شہریار" نہیں۔ محنت و محبت دونوں ہی کامراں ہیں۔

نئے بشر کی خبر ملے گی وہاں جا کر — وہ ہے مدینۂ آدم ذرا قدم بڑھاؤ

ڈاکٹر صاحب کو دسترس سے باہر آسمانوں کے مقابلہ میں ان کے محبوب کی یہ دنیا عزیز ہے۔ کہتے ہیں۔

مرے دسترس میں ہے مری زمیں محدود بہت — کہ خارزار سے ملتا نہیں رہی ہے راہ

مرے نجوم کا عالم مجھے عزیز کہ تو — مری زمیں سے باہر کہکشاں بستر

آئیے اب ڈاکٹر صاحب کی غزلوں کو دیکھیں جو ان کی شاعری کے سفر میں ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں۔
خالص غزل کے شعر دیکھئے اور ساتھ ہی ان کے بدلے ہوئے تیور، عصر حاضر کی حشر سامانیوں کی طرف لطیف اشارے، اور یہ سب غزل کی روایتی علامتوں کے سہارے۔

درد ٹھہرا ہوا سا ہے دل میں — سوزشِ غم بھی آج کم کم ہے
تشنگی جی کی بڑھتی جاتی ہے — سامنے اک سراب رہتا ہے

حاصل و موجود محض 'سراب' ہے جو تشنگی کو اور بھی تیز کر دیتا ہے۔ تکمیل خواب کی آس تھی، جو محض سراب نکلی۔ احساس محرومی اور بھی شدید ہو گیا۔ اس کیفیت کو بیان کیا ہے۔ حسن بیان توجہ چاہتا ہے۔
۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا۔ اسی سال ڈاکٹر صاحب نے جو غزل کہی، اس کا شعر سنئے۔

ہے بجلیوں کو اشارہ کہ ہم اسیروں پر — کھلیں جو بندِ سیاست تو بندشِ غم ہو

پھر ۱۹۴۸ء میں کہا

مسعود باغِ ہند میں کیا آگئی بہار — ہم سے تو اس بہار میں گایا نہ جائے گا

مسعود صاحب کا ایک فکر انگیز شعر سنیئے۔

اک چومتی ہوئی سی نظر ڈال ڈال کر — مسعود تم نے ایک صنم کو خدا کہا

"چومتی ہوئی نظر" محبت کی نظر ہے۔ اس نے "صنم" میں ایک کیفیاتی تبدیلی پیدا کر دی۔ یہ عشق کی وہ منزل ہے جہاں معشوق مجازی، معشوق حقیقی بن جاتا ہے۔ حقیقت و مجاز کی سرحدیں معدوم ہو جاتی ہیں۔
خالص غزل کا روایتی شعر سنئے۔

تیرے خیال میں آج دل سوگوار سا ہے — مجھے گمان ہے کچھ اس کو انتظار سا ہے

۱۹۴۹ء میں ایک غزل کہی ہے۔ اس کا شعر سنئے۔

سنا ہے ہند کی شاداب وادیوں میں رفیق! — بہار آ بھی چکی ہے، بہار باقی ہے

اور

تجھے بہار ملی، مجھ کو انتظار ملا — اس انتظار میں لیکن کسے قرار ملا
کسی کی آنکھوں میں تاروں کی مسکراہٹ ہے — کسی کی آنکھوں کو شبنم کا کاروبار ملا

یہ شعر دیکھئے

خدا کرے کہ ترا غم دراز ہو جائے — غمِ حیات سے کچھ ساز باز ہو جائے

قارئین کے ذہنوں میں وہ شعر گونج رہا ہوگا جہاں شاعر کہتا ہے کہ "شبِ وصال" انتہائی مختصر ہے اس کے ساتھ "شبِ ہجر" کا ایک ٹکڑا ہی جوڑ دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب "غمِ جاناں" کو "دراز" کر کے "غمِ حیات" سے ساز باز کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بدلے ہوئے دور کے بدلے ہوئے تیور ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قطعات سے ایک قطعہ تبرکاً پیش ہے۔

بڑھیگا شوق ابھی آرزو کو پھیرے کر — چلیں گے یار تری جستجو کو پھیرے کر
ہم ایک ڈالیوں پہ کھ دیئے شب متاع تحرد — کریں گے رقص وہ جام و سبو کو پھیر لیکر

متفرق اشعار میں ان کے انداز دیکھئے۔

کس نے دیکھا ترا انداز جمیل — کبھی محدود، کبھی لامحدود

پھر وہی شامیں سونی سونی — پھر وہی راتیں تیرہ و تار
کس نے کہا تھا پھول کھلے تھے — کس نے کہا آئی تھی بہار

اور اس شعر کا موڈ دیکھئے۔

دل میں آتا ہی نہیں اب کسی دلبر کا خیال
گنگناتا ہی نہیں آج گلِ تر کا خیال

ڈاکٹر صاحب کے گیت بھی قابل توجہ ہیں۔

"موج کا گیت" عشق کی محرومیوں کی داستان ہے۔ دریا کی موج بے حس ساحل سے ٹکراتی ہے، ساحل کا بوسہ لیتی ہے اور ساحل کی بے حسی سے مایوس ہو کر "رہ رہ روتی" واپس ہو جاتی ہے۔

"آج سبھی انکار" میں شاعر "انکار" کیلئے ہی سہی اپنی محبوبہ کے بول سننا چاہتا ہے۔ بند لبوں کے "لال دوار" کو کھلوانا چاہتا ہے۔ مکھ کی لبس جھنکار سے اپنے ناآسودہ آوازِ محبوب کانوں کی آسودگی چاہتا ہے۔

"پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں" ایک لڑکی کی آہ ہے۔ سماج اس کے عشق پر ہوس کا الزام لگا کر اس کی توہین کرتا ہے۔ اسے رسم و رواج میں جکڑا رکھنا چاہتا ہے۔

لوگ جو دوش لگاتے مجھ کو .... وہ کیا جانیں چاہ
رسموں کے پھندے لیکر — پھانسنے آئیں، مجھ کو ڈرائیں
یہ مورکھ پر کیسے پائیں .... میرے مِلن کی تھاہ

پھر کہتی ہے۔

دوش لگاویں جو وہ چاہیں .... لیکن کیا پرواہ
پریم کے ہاتھوں میں بک جاؤں .... دیکھتی ہوں یہ راہ

"کیوں سج دھج کر آئی"۔ ۹ میں محبوبہ اپنے عاشق کی بے اعتنائی پر گریاں ہے۔

مسج کی دلہن شرمائی سی سج دھج کر جو آتی
.... کون ملا ؟ کیا پائی ؟

رات کی دیوی آنکھوں آنکھوں میں کس کس کو بلاتی
.... سویا پریم جگاتی ؟

کس نے کب پایا ہے کس کو، جو میں اُن کو ، پاؤں
.... کیوں سپنے دیکھ کر آؤں ؟

"جاؤ ستارو" میں شاعر اپنے "سویرے" کے لئے تڑپ رہا ہے۔

جاؤ ستارو جاؤ میرا سویرا لاؤ !
رات کے اس کالے آنچل سے رتنوں کے اس شیش محل سے
ڈھونڈھ کے لاؤ مت شرماؤ ....
جاؤ ستارو جاؤ میرا سویرا لاؤ !
چاند سے بھی کہہ دینا دیکھے لیکن تم آنا سنگ لے کے
رات تھوڑی لاکھ چھپائے آنچل دھیرے سے سرکاؤ
جاؤ ستارو جاؤ میرا سویرا لاؤ !

یہ ۱۹۴۵ء کا لکھا ہوا گیت ہے۔ دل تو یہ کہتا ہے شاعر کو "آزادی کے سویرے" کی تلاش ہے۔ ملک ایک کرب سے گذر رہا ہے۔ آزادی کی امنگ سینے میں موجزن ہے ایسے میں شاعر کے دل سے یہ آواز نکلی ہے۔

مجموعے کے آخر میں "روپ بنگال" ایک روپک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے تشریحی نوٹ میں کہا ہے کہ یہ روپک اس کرب کا غماز ہے جو ۱۹۴۷ء میں ایک تہذیب کے "دو نیم" ہونے پر شاعر محسوس کر رہا تھا۔

یہاں ایک افغانی اور ایک بنگالی لڑکی منجل اصل میں فلسفے کے دو مکتبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افغانی "او" کی فکر کا ترجمان ہے جو فلسفۂ عمل کے قابل اور اسی کو وجود کا جواز سمجھتے ہیں۔ منجل، ٹیگور کے فلسفۂ وحدت الوجود کی ترجمان ہے۔ (۱) دیس (۲) روپ (۳) ایک شام (۴) ناؤ میں (۵) بانسوں کے جنگل میں، افغانی اور منجل "ہم قدم" بھی ہیں۔ اور "ہم کلام" بھی سرزمین بنگال کے مختلف مسحور کن مناظر سے گذرتے ہیں۔ لیکن (۶) آموں کے کنج میں نظم اپنے نقطۂ عروج کو پہونچتی ہے۔

منجل دھیرے دھیرے فضا میں تحلیل ہو رہی ہے۔ اور افغانی سے مخاطب ہے۔

تم میرے سائے بن جاؤ خود کو کھو کر میرے بن جاؤ

اور پھر کہتی ہے ____________

"پتلے عمل کے
کر دو اپنے بندھن ڈھیلے منجل کو سایوں میں ڈھونڈھو
اور اس کا سایہ بن جاؤ خود کو کھو کر اس کو پاؤ

افغانی کہتا ہے ——"

آج کیا میں نے کچھ ایسا — خود کو کھویا اس کو پایا
مِل جاؤں گا اس سے، یا پھر — بن جاؤں گا اس کا سایہ

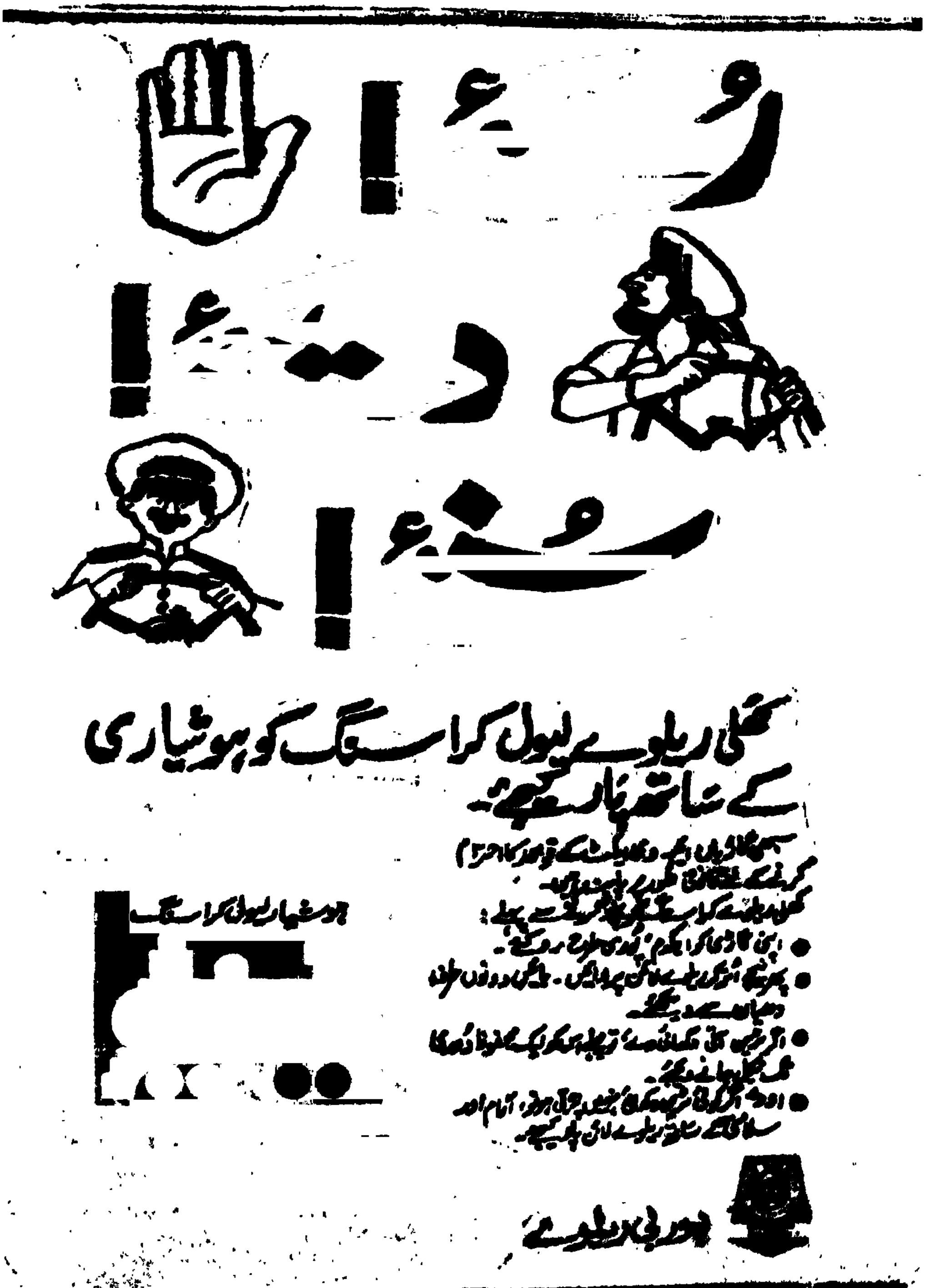
یہ وہ مقام ہے جسے ایک دکھنی شاعر نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا اسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کیسے
دیا کھول خودی اپنے خدا ساتھ مصطفےٰ — جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کیسے

یہاں ہجر و وصال کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ لذّتِ وصل، اور غمِ ہجر کی سرحدیں معدوم ہو جاتی ہیں جس منزل پر پہونچ کر بقول فراقؔ، "عشق، شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے درمیان ربط بن جاتا ہے۔

کیا یہی وہ مقام ہے جہاں "دو نیم" کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے؟

لیکن ڈاکٹر مسعود حسین خان تو عصرِ حاضر میں کرّۂ ارض پر بسنے والے اِنسان کی "دو نیم" کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور یہی اِنسان ان کا جذباتی مرکز ہے۔ اسی انسان کو وہ "نشاطِ شوق" کی منزل سے "اِنتظارِ بے قرار" کی کیفیت سے، "لذّتِ جستجو" کے راستے ایک نئے "مدینۂ آدم" کی طرف "قدم بڑھانے" کی بشارت دیتے ہیں۔ جہاں کوئی "شہریار" نہ ہوگا جو محبت کی توہین اور محنت کی تکذیب کرے۔



رُکیے!
دیکھیے!
سُنیے!
کھلی ریلوے لیول کراسنگ کو ہوشیاری کے ساتھ پار کیجیے۔
ہوشیار لیول کراسنگ
اپنی گاڑی کو بالکل پوری طرح روک لیجیے۔
شمالی ریلوے

عبدالسلام راحین

جیجا لین، ہتھل گوڈا، رانچی۔

چھپتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

(رانچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات)

۹ ستمبر کی آخری تاریخیں تھیں جب ابدالی صاحب نے دوبارہ استقبالیہ کمیٹی کی نشست کا اہتمام کیا۔ اس دن سویرے سویرے جب وہ میرے گھر آئے تو میں نے ہمیشہ کی طرح خدا سے دعا کی کہ رب العزت مجھے اپنی پناہ میں رکھیو۔ اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میری دعا مقبول نہ ہو سکی۔ چائے ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد موصوف نے یہ مژدہ سنا ہی دیا کہ وہ نومبر کے اوائل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کر ہی لینا چاہتے ہیں۔ چلئے صاحب ابھی ارادہ ہی کیا تھا۔ ۲۷ ستمبر کو ہم سب یاور صاحب کے دولت کدہ پر اکٹھا ہوئے کوئی بیس پچیس ادیب و شاعر ہوں گے طے یہ پایا کہ شہر کے ادب دوست حضرات اور ترقی پسند نظریات کے حامل نوجوانوں پر مشتمل ایک میٹنگ بلائی جائے۔

۳ اکتوبر کو مولانا آزاد کالج میں اس نشست کا اہتمام ہوا۔ اس ایک ہفتہ میں ابدالی صاحب اور وش اختر صاحب نے مل کر بہت سارے لوگوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا کانفرنس کے لئے XAVIER INSTITUTE OF SOCIAL SERVICE کا سیمینار ہال بک کروا چکے تھے۔ مجلس استقبالیہ کی صدارت کے لئے رانچی یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر اور علاقائی زبانوں کے ماہر ڈاکٹر رام دیال منڈا سے گفتگو کر چکے تھے۔ بہرحال اس نشست نے ایک باقاعدہ مجلس استقبالیہ کا انتخاب کر لیا۔ اور ۳ نومبر ۸۶ء کو ہی انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) بہار کی تیسری ریاستی کانفرنس اور جشن زریں تقریبات منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا گیا۔ نشست گاہ سے نکلتے ہی ہم لوگوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

یہ بات سب سے زیادہ خوش آئند تھی کہ پرانے ادیبوں کے علاوہ نئے اور نوجوان ادیبوں کی ایک پوری جماعت ہمارے قافلہ میں شامل ہو گئی تھی۔ ان میں سے کچھ نے ابھی ابھی لکھنا شروع کیا تھا۔ کچھ کی دو ایک چیزیں ادھر ادھر رسالوں میں چھپ چکی تھیں اور کچھ کی دس پندرہ تخلیقات شائع ہو چکی تھیں۔ بہرحال ان تمام لوگوں میں ایک زبردست جوش و ولولہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ادھر ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر وش اختر، ڈاکٹر صدیق مجیبی، پروفیسر طارق ندیم جیسے پرانے ترقی پسند ادیب نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ سامنے آئے۔ اور ایسا ان بزرگ رفیقوں کو ہم نے یک لخت پا لیا جو زمانہ اور حالات کے

غبار میں کھونے لیے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا ہمت افزا اور اتنا خوش کن تھا کہ اسے لفظوں میں بیان کر پانا ممکن ہی نہیں۔ لگتا تھا جیسے سارا شہر ترقی پسند ہو گیا ہے ہر شخص کانفرنس کی کامیابی کے لئے سرگرداں ہے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق ہر فرد کانفرنس کو کامیاب کرنا اپنی ذمہ داری سمجھنے لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مخالفین کے لیے ہی نہیں دوستوں کے لئے بھی خطرناک تھا۔

اکتوبر کے پہلے جمعہ کو ہماری میٹنگ ہوئی تھی دوسرے جمعہ کو ابھی نماز پڑھ کر واپس ہی آیا تھا کہ ابدالی صاحب ہاتھ میں کوئی کاغذ لیے نظر آئے۔ معلوم یہ ہوا کہ کسی انجمن خدام ملت کے بہادر اراکین نے ہماری کانفرنس کے خلاف ایک پمفلٹ نکالا ہے۔ ان کی بہادری کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا کہ اس میں تو کسی فرد کا نام تھا اور نہ ہی دفتر کا پتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مخالفین میں سامنے آنے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے اعلیٰ حضرت کو مبارک باد دی کہ لیجئے صاحب آپ پروپیگنڈے کے لئے پریشان تھے اب تو آپ کے مخالفین نے یہ فریضہ اپنے ذمے لیا ہے۔ ہم سب دستور شام میں شہر نکلے۔ دوستوں اور کرم فرماؤں سے گفتگو ہوئی ۔ا چندے کئے، کسی نے ہم سے یہ بھی نہ پوچھا کہ بھائی معاملہ کیا ہے؟ کیوں آپ لوگ ہم سے چندہ اکٹھا کر کے ہمارے دشمنوں کو کھلانا چاہتے ہیں؟۔ مطلب صاف تھا کہ پمفلٹ کو عوام نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اور یہ بات پمفلٹ نکالنے والوں کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ چنانچہ ہم نے فوری طور پر ایک میٹنگ بلائی۔ میٹنگ کیا بلائی گئی ا ہر روز رات میں اپنی اپنی کارگزاریوں کی تفصیل بتانے کے لیے ہم اپنے نوجوان ساتھی سرور ساجد کے یہاں اکٹھا ہوتے تھے۔ وہیں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم لوگوں کو اس پمفلٹ کا کوئی نوٹس نہیں لینا ہے۔ اور اگر کوئی پوچھے تو صاف طور پر یہ کہہ دینا ہے کہ ہم ایک ادبی کانفرنس کرنے جا رہے ہیں۔ یہ اردو کا دیوں کی کانفرنس ہے اس میں مختلف مذاہب، مختلف مذہب فکر اور مختلف نظریات رکھنے والے ادیب و شاعر جمع ہوں گے۔ جس طرح کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کو اس کی بات کہنے سے روک نہیں سکتے۔ اسی طرح کسی بھی مکتبہ فکر کے ادیب کو خیالات کے اظہار سے روکنا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح کمیونسٹ ادیبوں کی شمولیت کے باوجود یہ انجمن صرف کمیونسٹ ادیبوں کی انجمن نہیں ہے ہم ایک بالغ شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے لوگوں کو اپنے حقوق کا علم ہو سکے۔ اور وہ فرقہ پرست اور انگاڈ وادی جماعتوں کا شکار ہونے کے بجائے اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے لڑ سکیں ——— لیکن پھر ہفتوں کسی نے کسی سے کچھ نہ پوچھا۔

ادھر ہر آنے والے دن ابدالی صاحب ایک نیا مژدہ سناتے۔ آج ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی کاناٹولی شاخ کے سکریٹری محمد اقبال خان (چھوٹو) نے کانفرنس کے لئے ظہرانہ کا وعدہ کر لیا ہے۔ آج ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب نے پانچ سو کی خطیر رقم ادا کی ہے۔ آج محفوظ عالم صاحب نے اپنے دوستوں کی مدد سے باقی دو وقت کے عشرانہ کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ سوونیر کے لئے ڈاکٹر کیسری اور ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب سے مقالے حاصل کر لئے گئے ہیں۔ نوجوان ساتھی بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے برسر پیکار رہتے۔ الف ایوب، سرور ساجد، ہمایوں اشرف، انظر جمیل ہر کوئی اپنی جگہ سرگرداں تھا۔ آج میں اردو کی دکانوں میں چندہ ہو رہا ہے تو آج بس اسٹینڈ میں پیسے وصول ہو رہے ہیں۔ ادراکیہ کے تعاون سے ہم دونوں وقت ملنے کا پروگرام بنایا۔ سرور ساجد ہی کے کمرے کو دفتر کی شکل دیدی گئی۔ پیکر و لین لفظ سے

متصل نظیر خاں لین میں واقع ہے۔ کشادہ کمرہ ایک طرف ایک پلنگ، دیواری میں ہی کتابوں کی ایک الماری اور دو ایک کرسیاں یہیں ڈاکٹر مشتاق اختر، ڈاکٹر صدیق مجیبی اور ہم شام ممبران جمع ہوتے۔ اپنی اپنی ذمہ داریاں بانٹتے اور نکل جاتے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب اور طارق ندیم صاحب بھی آجاتے۔ شاید سرور کے گھر والوں کو ہماری بے سروسامانی پر رحم آگیا چنانچہ چند اور کرسیوں اور ایک ٹیبل کا اضافہ عمل میں آگیا جائے بھی کبھی کبھی اندر سے آجاتی اور ہم صاحب خانہ کے بجائے خدا کا شکر ادا کرتے۔

جیسے جیسے انتظامات ہوتے جا رہے تھے ہمارا حوصلہ بھی بڑھ رہا تھا۔ ادھر بمبئی سے سردار جعفری صاحب کا خط آگیا انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردار اب ہمارے لئے بذات خود ایک روایت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ وہ پچھلی بار ۱۹۶۲ء میں آئے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ کیسی کیسی تاریخیں وابستہ تھیں ہماری تحریک کے صف اول کے مجاہدین میں سب سے زیادہ متنازعہ اور سب سے محترم شخصیت بھی انہیں کی بچ رہی ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاہے سردار کو ہوائی جہاز سے ہی کیوں نہ لانا پڑے انہیں لایا ضرور جائے۔ انہیں دنوں ٹی وی کے ایک مشاعرے میں پڑھا گیا یہ شعر شہر کے پڑھے لکھے حلقے میں کافی مقبول ہو گیا تھا

اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے

بچ رہے گا جو لہو اب کے فسادات کے بعد!

سردار کے آمد کی اطلاع تے ہمارے درمیان ایک نئی لہر دوڑا دی ادھر دہلی سے قمر رئیس، غلام ربانی تاباں، اجمل اجملی، جوگندر پال، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر علی جاوید، اور ارتضیٰ کریم صاحبان کے آمد کی اطلاع دی۔ بہار کے مختلف شہروں سے بھی خطوط موصول ہونے لگے تو اندازہ ہوا کہ مہمانوں کی آمد ۳۰ نومبر کے صبح سے ہی شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا اس دن کے کھانے کی بھی فکر ہوئی۔ ہمارے ایک دوست سکندر صاحب جن کے بارے میں ہمیں یہ اندازہ تھا کہ وہ نظریاتی طور پر ہمارے مخالف ہیں۔ میرے پاس آئے اور انتظامات کے بارے میں دریافت کیا میں نے یونہی کہہ دیا کہ باقی انتظامات تو ہو گئے ہیں بس سہ پہر کے ظہرانہ کا انتظام نہیں ہو پایا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ ذمہ داری خود قبول کر لی۔ چنانچہ انہوں نے RALLY میں بدست لنچ کا اہتمام کیا

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ڈاکٹر مشتاق اختر صاحب کی تو جیسے جوانی لوٹ آئی تھی۔ ہم نے اس سے قبل انہیں اتنا چاق و چوبند اتنا فعال نہیں دیکھا تھا اس بار وہ بالکل ہی نئے پیکر میں ہمارے سامنے تھے۔ کہاں تو ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بے انتہا ARISTOCRATE ہیں، لوگوں سے ملنے جلنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور کہاں یہ حالت کہ دس بجا اور وہ حاضر۔ نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی ان نوجوانوں کے ساتھ جن میں زیادہ تر ان کے طالب علم تھے۔ ہم لڑکوں کے ساتھ دکانوں میں جا رہے ہیں، چندے اور اشتہارات وصول کر رہے ہیں۔ فیسٹا پاؤس بک کارنر کے مختلف آفسوں کا چکر لگا رہے ہیں کلک سے کرافورڈ تک کے ٹیکسال میں پیدل چل رہے ہیں۔ اسکوٹر دوڑ رہا ہے۔ گاڑی دوڑ رہی ہے اور کبھی کبھی آٹو رکشہ میں دھکے کھا رہے ہیں۔ HELON میں جہاں ان کا کنگ ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں منتظر

ملک کروانے کے لئے ملا جگر کاٹ رہے ہیں۔ سچ تنظیم اور تحریک سے وفاداری اور وابستگی کی آگ زندگی کے کسی موڑ پر بھی سرد نہیں ہوتی۔ جب بھی کریدئیے دہک اٹھتی ہے۔ لیکن یہ عالمیت کئی لوگوں کے لئے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوئی۔ خصوصاً شعبۂ اردو کا اسپین چیپٹر اور ایک دوسرے کو نقصان پہونچانے کی سازش سڑکوں پر آگئی، مخالفین تو اس بات کی ہی کوشش کر رہے تھے کہ کانفرنس نہ ہو پائے لیکن دوستوں کی یہ بھی خواہش تھی کہ ہم اس بات کا اعتراف کر لیں کہ ان کی مدد کے بغیر یہ کانفرنس کر لینا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ اس بارش اختر صاحب کی برسوں پہلے شائع ہوئی کتاب " اردو افسانوں میں سیس مین ازم " کو نشانہ بنایا گیا۔ ہم نے پھر بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ اب تک اردو کے تقریباً تمام اساتذہ اور تقریباً تمام اہم ادباء و شعرا کا ساتھ ہمیں میسر آچکا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے دوستوں کی حمایت ہمیں حاصل ہو گئی تھی جن کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا تھا۔

ماسٹر طالب صاحب خیر سے استاد تھے اور منتظمہ کے خلاف ایک طویل لڑائی لڑ چکے تھے۔ ٹیچر ایسوسی ایشن سے متعلق تھے۔ اور ہر کمزور آدمی کی لڑائی کو اپنی لڑائی سمجھتے تھے۔ یوں شہر میں ان کی ایک دوائی کی دکان (خدا اسے طالب صاحب کے اخلاق جلالی سے محفوظ رکھے) بھی ہے۔ لیکن ہم لوگوں سے ان کی ملاقات " ملت اکیڈمی " کے سلسلے میں ہونے والی ایک میٹنگ میں ہوئی تھی ہم اساتذہ کی طرف سے مدعو تھے۔ اور وہ اس سہ رکنی کمیٹی کے رپورٹ سنانے آئے تھے جسے اصلاحی کمیٹی نے منتظمہ اور اساتذہ دونوں فریقین سے مل کر رپورٹ مرتب کرنے کے لئے تشکیل دیا تھا۔ رپورٹ اساتذہ کے حق میں تھی۔ لہٰذا منتظمہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ نشست نے یہ طے کیا کہ کار بہین حضرات منتظمہ کو اس بات پر رضامند کریں کہ وہ اساتذہ کے جائز حقوق مان لیں۔ نشست کے بعد ہم لوگ طالب صاحب سے ملے اور انہیں مبارکباد دی۔ وہ دن اور آج کا دن، کبھی کبھار کہیں ملاقات ہو جاتی۔ لیکن کانفرنس کے انعقاد کو انہوں نے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ لوگوں سے لڑائیاں کیں۔ چندہ کیا اور ثابت کیا کہ حق کی لڑائیاں لڑنے والے نام، پیسے اور شہرت کی پرواہ نہیں کرتے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد۔ پیشہ کے اعتبار سے فزیشین، عقیدے کے اعتبار سے مسلمان، جماعت اسلامی اور اہل سنت کے یکساں دوست، پیشے سے وفاداری کچھ کم، انسانیت سے کچھ زیادہ۔ مجلس استقبالیہ میں نمائندگی کے لئے ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ دوستوں نے ان کا نام سجھایا۔ اور ہم نے ان سے درخواست کی۔ انہوں نے دو ایک روز کی مہلت مانگی، کچھ دوستوں نے بتایا کہ وہ تو کانفرنس کی مخالفت کر رہے ہیں ہمیں تشویش ہوئی، پھر کچھ دوستوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ باتیں ہوئیں، اندازہ ہوا کہ لوگوں سے ان کی ملاقات سرسری ہوا کرتی ہے۔ وہ تو آدمی ہی دوسرے ہیں۔ بہر حال یہ بات کل تک تھی آج تو ان سے بھی کمیونسٹ نہ ہونے کا حلف نامہ لکھوایا جاتا ہے۔ مرحوم ابن انشا نے اردو کی آخری کتاب میں یونہی نہیں لکھا تھا کہ :

" ایک دائرہ اسلام کا بھی ہوتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا، اب نکالا جاتا ہے۔ داخلہ پر پابندی ہے۔"

وہ کافی بڑا ایک ہالینڈ اسٹیج پوسٹر چھپوا کر لے آئے جیسے کہ پہلے ہی لگایا جا چکا تھا اور [illegible] ہوئی تھی۔

[illegible] کے بعد ان دنوں ایک شراب کمپنی نے شہر میں کچھ اشتہارات کا کام دیا تھا۔ روزی روٹی کا [illegible] تو [illegible] میں گذر جاتا تھا۔ رات کو چھوٹے بھائی کی مدد سے بینر لکھے تھے تاکہ جلد از جلد ٹانگے جا سکیں لیکن ابدالی صاحب کہہ رہے تھے کہ ابھی سے ٹانگ کر کیا کریں گے۔ غصہ تو سخت آیا تھا کہ اتنا جان پانی کر کے لکھا اب آپ کو جلدی ہی نہیں ہے۔ [illegible]لی صاحب کو یوں تو میں پہلے سے جانتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک نئے ابدالی صاحب کے [illegible]شن ہوئے ہیں۔ پچھلے سے آپ کا تشدد تر بے ہی مخصوص لکھنے میں ہوتا رہا ہے۔ آج بھی آپ اگر ان سے پہلی بار ملیں گے [illegible] ان کے چہرے پر آپ کو ایک خصوصیت نظر آئے گی۔ بلکہ ایسی خصوصیت، جس میں بے وقوفی کی جھوٹ نظر آئے۔ [illegible] کے سامنے ادب پر گفتگو کرتے رہیے یا سیاست پر وہ سعادت مندی سے سر جھکائے سنتے رہیں گے۔ آپ ترقی پسندوں [illegible] خیال رکھیے ان کے ماتھے پر شکن نہ آئے گی۔ لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں بارہا کام کرنے کا موقع ملا ہے [illegible]م آزادی فلسطین کی حمایت میں ہم نے فرینڈس آف فلسطین کے نام سے ایک تنظیم بنائی گئی۔ اور شہر بھر میں [illegible] جلسوں کا تانتا لگا دیا تھا۔ جلوس نکالے تھے۔ اس موقع پر ابدالی صاحب کو کسی نے دیکھا ہو گا تو اسے بھی ان کا [illegible] چہرہ کا پسینہ [illegible] غصہ آیا ہو گا۔ [illegible] بھی ہوں اشاعت سے قبل جنھیں ان کے مضامین پڑھنے سننے کا موقع ملتا ہے۔ نامساعد حالتوں میں ان کا سکون اور مخالفین کے یلغار کے وقت ان کا عزم میں نے دیکھا [illegible]۔ میں جانتا تھا کہ ابھی اگر وہ پوسٹر نہیں لگوا رہے ہیں یا بینر نہیں ٹنگوا رہے ہیں تو ضرور اس میں ان کی کوئی مصلحت [illegible] لہٰذا ہم سب خاموش ہو رہے۔ اس درمیان انہوں نے XISS کے سیمینار ہال کی جگہ ان کا کانفرنس ہال بک [illegible] لیا۔ اصلاح کا گیسٹ ہاؤس بھی ریزرو کروا لیا۔ ۳۰ اکتوبر تک ہال کے سلسلے کے تقریباً تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔

پہلی نومبر کو ہمارا پہلا پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ پمفلٹ میں مجلس استقبالیہ کے تمام اراکین کے نام بالترتیب [illegible] کئے گئے۔ انجمن کی تشکیل اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی۔ تعاون کے لئے لوگوں کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اور پھر [illegible]نس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مجلس استقبالیہ میں تقریباً تمام سیکولر اور جمہوریت پسند عوام کے نمائندے شامل کیا گیا تھا۔ سرپرستوں میں شیو پرشاد ساہو، اور پرمود جی کا نام تھا۔ شیو پرساد جی ہمارے علاقے کے [illegible] ایم پی ہیں۔ اور پرمود جی سائنس کے حلقہ انتخاب سے M.L.C یہ دونوں حضرات انجمن کی تنظیم کے بعد ہی ہمارے سرپرستی فرما رہے ہیں۔

مجلس استقبالیہ کے چیئرمین قائم مقام [illegible] وائس چانسلر ہیں۔ اس سے قبل [illegible] کے شعبہ میں صدر تھے۔ زندگی کا معتدبہ حصہ [illegible] گذر چکنے کے باوجود آدمی [illegible] [illegible] شعبہ اردو کے صدر اور [illegible] کے علاوہ [illegible] [illegible] کے شعبہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] صاحب [illegible]

آزاد کالج کے پرنسپل، طارق ندیم صدر شعبۂ اردو رام لکھن سنگھ کالج اور افسانہ نگار، بابولال جو کمیونسٹ پارٹی کی کیپول شاخ کے رہنما، مجلس صدور میں شامل تھے۔

جنرل سکریٹری ابدالی صاحب کے علاوہ سکریٹیریٹ کے دوسرے ممبران میں حیدراللہ آبادی صاحب INTUC سے وابستہ ہیں۔ مذہبی تحریک وابستگی کے باوجود بہت ہی کھلے ذہن کے مالک، اندھی تقلید کے مخالف اور خوش گو شاعر ہیں۔ حفیظ عالم صاحب ان دنوں پی پی کے کالج میں اردو کے صدر، طالب علمی کے زمانہ سے STABLISHMENT کے مخالف، محبت اور نفرت دونوں میں جان کی بازی کا خطرہ اور کٹھ ملائیت کے خلاف مسلسل برسرپیکار ہیں۔ اقبال خاں عرف چھوٹو کمیونسٹ پارٹی کے کھنٹا ٹولی شاخ کے سکریٹری، ماضی میں قتل و لوٹ کے دسیوں جرائم میں ملوث رہنے کے بعد اب مجبور اور کمزور لوگوں کی لڑائی لڑنے میں کسی مہم میں حکومت کی آنکھ کا کانٹا بنے ہوئے ہیں۔ اسلم پرویز، سجاد انور رشا، ابرار احمد، وسیک بیگ اور عقیل الرحمن سب کے سب مختلف سیاسی و سماجی تنظیموں سے متعلق نوجوان اراکین، اور اپنے اپنے شعبہ میں مجاہدانہ شخصیت کے مالک۔ جوائنٹ سکریٹریز میں زیادہ تر طلبا ہی تھے۔ اظہر جمیل ایک اچھا شاعر ہے۔ اور اس کی کئی تخلیقات ملک کے معتبر رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کی رانچی شاخ کا سکریٹری ہے۔ ہمایوں اشرف کی بھی کئی کہانیاں بہار و بنگال کے پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔ جلتے ہوئے مسائل پر تیکھی و تیکھی سی کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں۔ سرور ساجد اور انور ایرج ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں۔ ریحانہ پروین نے جس طرح زندگی سے آنکھیں ملا کر اسے اپنے قابل بنا لیا ہے وہ یقین و اعتماد اس کے ادب کا حصہ بن گیا ہے۔ اپنے خالو توحید احمد صاحب کے بارے میں، ہم صرف یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ہماری بے سروسامانی کو چادر انہی کے دم سے میسر آتی رہی ہے۔ اب تو بیشتر کتب فروشوں نے ہمارے پرچے منگانا شروع کر دئے ہیں۔ لیکن جب ان کو منگانا گھاٹے کا سودا تھا تب توحید صاحب ہی یہ کارنامہ بھی انجام دیا تھا۔

مجلس استقبالیہ کے دیگر اراکین۔ پرکاش فکری، وہاب دانش، قاضی شعیب رحمانی، صوفی طارق، یوسف اختر قمر حمید، حسن جعفری، شفیق عالم، ادریس اختر، اعجاز احمد، عبدالسمیع (راجو) مصطفےٰ قریشی، یسین زید حسن، ابن المبارک لئیق احمد، ایوب انصاری، محمد یونس، ظفر صاحب، عبدالرحمٰن امیر عامری، اختر سعیدی، صابر بہاری، افتخار عالم، عبید د بھائی، شاہد پرویز، امتیاز، سمیع اللہ شفق، محمد شاہد، سکندر احمد اور بانکے بہاری سہیم —— یہ تمام نام صرف نام نہیں تھے ہر آدمی اپنی جگہ ایک پورا اسکول، ایک پوری طاقت ہے۔ انور عمادی اور خلیل صاحبان وفاداری بہ شرط استواری کی وہ مثال ہیں جس کا کوئی ثانی نہیں۔

یہ پمفلٹ محض پمفلٹ نہ تھا۔ مخالفین کے منہ پر بھرپور طمانچہ تھا۔ ہماری اب تک کی خاموشی سے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ہمارا طریق کار کیا ہوگا۔ اور ہمارے ساتھ کون کون ہے۔ وہ اب تک یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے تھے کہ یہ کمیونسٹوں کی تنظیم ہے جس کے ذریعہ معصوم نوجوانوں کو ورغلا کر کمیونسٹ بنایا جا رہا ہے۔ اس لئے جب ہمارا یہ پمفلٹ آیا تو وہ بوکھلا گئے۔ ان کی جھنجھلاہٹ نے انہیں بالکل ننگا کر دیا۔ انجمن اور کانفرنس کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی تھی۔ اس نے عوام کے ایک بڑے حصے پر یہ تاثر دیا تھا کہ مخالفین کا سارا پروپیگنڈہ محض شرپسندی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ نتیجہ کے طور پر شہر کے مختلف

ملتوں میں بہاں سیکولر لوگوں نے ہمارے حق میں فضا بندی شروع کردی۔ مخالفین کو سربازار شرمندہ کیا جانے لگا۔ ابدالی صاحب نے یہ پمفلٹ تب شائع کروایا جبکہ کوئی جمعہ باقی نہیں بچ رہا تھا اب مخالفین کو میدان میں اترنا تھا جو ان کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر بھی ۳ نومبر کو ان کو مخالف پمفلٹ سامنے آگیا۔ اس پمفلٹ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو ان لوگوں نے پرسنل لاء بورڈ اور اصلاحی کمیٹی کے ممبران کو بلیک میل کرنے کی ٹھانی۔ ایک مقامی مسجد میں ۳ نومبر کو علما اور دانشوروں کی ایک میٹنگ بلائی گئی۔ اعجاز احمد، قاضی شعیب رحمانی، پروفیسر صدیق مجیبی، اور خود میں انجمن کی طرف سے اس میٹنگ میں شامل ہوئے۔ جماعت اسلامی اور یا اس کے حواریین کی پوری کوشش کے باوجود یہ طے نہیں پا سکا کہ کانفرنس کی مخالفت یا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی علما آپس میں الجھ گئے۔ اور یہ بھی طے نہیں ہو سکا کہ کون لوگ وفد لے کر کے کانفرنس میں جائیں گے تاکہ یہ دریافت کر سکیں کہ پرسنل لاء کے سلسلے میں ان کا موقف کیا ہے۔ ۳ نومبر تک ہمارے پوسٹر گیا دیواروں پر چسپاں کر دئے گئے۔ اور کارڈ بھی بانٹ دئے گئے۔

۳ نومبر ہی سے مہمانوں اور مندوبین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دہلی سے آنے والے مہمانوں کے لئے XISS کا گیسٹ ہاؤس بک کروایا گیا تھا یہ جگہ آرام دہ تو شاید اتنی نہ تھی لیکن ہال سے متصل ہونے کے ساتھ ساتھ پرسکون بھی تھی۔ کلکتے کے مندوبین کو سمراٹ ہوٹل میں اور جمشید پور اور دیگر شہروں سے آنے والے مندوبین کو ریپلک میں ٹھہرایا گیا تھا دوپہر کا کھانے کا انتظام تو سکندر صاحب نے RALLY ہی میں کیا تھا۔ لیکن مہمانوں کی آرام کی خاطر فوڈ پیکیٹس ان کے کمروں ہی میں پہونچا دئے گئے تھے۔ رات کے کھانے کا انتظام خلیل صاحب نے ہاشم ہوٹل میں کیا تھا۔ یہ ہوٹل مسلم اکثریت والے علاقے میں مین روڈ پر اردو لائبریری کے عین سامنے واقع ہے۔ اس علاقے کے مسلم نوجوان، کاروباریوں اور اردو لائبریری و انجمن اسلامیہ کے عہدیداروں نے جس خلوص و محبت سے ہماری معاونت کی اس کے لئے شکریہ کے رسمی الفاظ کافی نہیں ہو سکتے۔

(ii)

۴ نومبر کا دن یوں بھی ہمارے لئے بڑا ہی اہم تھا۔ کیونکہ مہینوں کی محنت صرف اسی ایک دن کے لئے ہی تو کی گئی تھی۔ پہلا مرحلہ ڈاکٹر رام دیال منڈا کو یاد دہانی کرانی تھی کہ انہیں ٹھیک ۹ بجے اپنے مہمانوں کا استقبال کرنا ہے۔ چنانچہ میں اور ابدالی صاحب ان کے مکان پر پہونچے، مرابادی میدان کے وسط میں رانچی کالج کے ٹھیک پیچھے ان کا چھوٹا سا پختہ لیکن خالص آدی واسی طرز کا مکان ہے۔ چاروں طرف درخت، پودے اور کیاریاں، کھڑکیوں میں بانس کی کھپچیوں سے بنے ہوئے پٹ، ایک طرف کچی مانڈر (آدی واسی ساز)، بیچوں بیچ گدے دار صوفہ جس پر ہم بیٹھے تھے۔ سامنے کے کمرے میں ایک قبائلی نوجوان اپنے تحقیقی کام میں منہمک ہے۔ شاید تری پورہ یا ناگالینڈ کا باشندہ ہو۔ ہمارے پاس ہی کلکتہ یونیورسٹی کے ایک سن رسیدہ پروفیسر بنگال کی قبائلی زندگی پر ریسرچ کر رہے ہیں اور کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ منڈا صاحب سے قبائلی موسیقی پر کچھ گفتگو کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ منڈا صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ابھی بیٹھے ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہ تشریف لائے دبلا پتلا، لیکن گٹھا ہوا جسم بھرے بھرے بازو، پیچھے کو مڑے ہوئے لمبے لمبے بال،

گندمگوں لیکن تیز آنکھیں، موٹے شیشوں کی عینک، موٹے دیسی کپڑے کا ہاف شرٹ اور ڈھیلا پینٹ۔ دیر کے لئے جھنجھلاہٹ، بتایا کہ بیمار رہے تھے پھر ابدالی صاحب پر چھلکتا ہوا پیار آتا ہے۔ بالکل آدی واسیوں کا لہجہ، وہی معصوم مسکراہٹ والہانہ اپنائیت۔ لگا کہ ہم اپنے بغل والے دادا یا کاکا (دبلے بھائی) سے باتیں کر رہے ہیں۔ چائے پی اور رخصت ہو گئے کتنی خوشگوار اور دوستانہ ملاقات، انہوں نے ۹ بجے تک پہنچنے کا وعدہ کیا اور چلے آئے۔ پھر کئی اور لوگوں سے ملاقات کر کے واپس آ گئے۔ دیکھا دروازے پر شیو رتن جی کھڑے ہیں۔ تین بار سے مستقل اس علاقے کی نمائندگی کر رہے ہیں لیکن کہیں سے بھی لیڈروں والی شان نہیں۔ ابدالی صاحب سے ناراض ہیں کہ انہوں نے کار کے لئے کہا تو تھا لیکن کار کہاں پہنچانی ہے یہ نہیں بتایا۔ بہرحال کار کے ساتھ کھڑے ہیں۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

ابدالی صاحب اپنا لمبا سا جھولا لٹکائے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں بانٹ رہے ہیں۔ خصوصی مہمانوں اور مندوبین کو بیج لگا رہے ہیں۔ ابدالی صاحب تھوڑی دیر غائب رہنے کے بعد پھر نظر آئے ہیں۔ لیجیے منظر صاحب بھی آ گئے۔ ساتھ میں اسٹوڈنٹ ویلفیر کے ڈین بھی ہیں۔ لوگوں سے ملوایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ش اختر صاحب نے مائک سنبھال لیا ہے وہ مہمانوں اور مجلس صدور کے ممبران کو ڈائس پر آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ تاباں صاحب ہیں غلام ربانی تاباں، بالکل سفید رنگ بھی اس قدر صاف ہے کہ خراش بھی لگ جائے تو خون باہر نکل آئے۔ عمر سے ضعیف، لیکن عزائم جوان، آنکھوں پر نیلے رنگ کی عینک۔ چند ماہ میں انہیں پدم شری (غالباً) کا ایوارڈ ملا تھا جو انہوں نے علی گڑھ میں ہونے والے فسادات پر قابو نہ پا سکنے کے لئے حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ فرقہ پرستی کے خلاف وہ مستقل لکھتے رہے ہیں۔ یہ ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر، کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری۔ شاندار شخصیت شاندار مسکراہٹ کے ساتھ ڈائس پر آ گئے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، دبلے پتلے اور خوبصورت، جدید تنقید پر اپنی کتاب کے لئے مشہور۔ منظر شہاب ترقی پسند مصنفین (اردو) بہار کے صدر، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر فصیح ظفر، ڈاکٹر شاہد احمد شعیب، ڈاکٹر دینیشور پرساد، بانکے بہاری شہا بھرم، ڈاکٹر آفتاب احمد، پرشیو رتن جی وغیرہ ڈائس پر آ گئے ہیں۔ اب منظر صاحب اپنے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ ترقی پسند ادب کو انہوں نے عوام ادب کہتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے پھر یہ مسئلہ آ کھڑا ہوا ہے کہ انہیں استحصالی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے تاکہ نچلے طبقے کو جینے کا حق مل سکے۔ انہوں نے کہا کہ رانچی کی اس آدی واسی دھرتی پر وہ ترقی پسند ادیبوں کا اس یقین کے ساتھ خیر مقدم کر رہے ہیں کہ آدی واسی علاقے کے مسائل یہاں کے لوگوں کی لڑائی کو وہ عوام کے سامنے پیش کریں گے، کرتے رہیں گے۔

ترقی پسند ادیبوں کے قومی فیڈریشن کے چیرمین غلام ربانی تاباں نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے قیام کے زمانہ ہی سے ظلم اور استحصال کے خلاف جنگ جاری رکھی ہے۔ اس نے انسانوں کے اندر یہ شعور بیدار کیا ہے کہ ظلم اور استحصال کے خلاف برسرپیکار رہے بغیر انسانوں کی اعلیٰ ترین تہذیب کی بقا ممکن ہی نہیں انجمن ترقی پسند مصنفین اردو بہار کے صدر منظر شہاب صاحب نے بہار میں ترقی پسند تحریک کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہم کسی طرح نہ صرف ادب کی تخلیق کے باب میں بلکہ عملی طور پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں—

چاہے رجعت پرست قوتیں ہمیں کتنا ہی مجبور کیوں نہ کر دیں۔ ہم اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے والے نہیں۔

جناب پرمیشور ج۔ ے۔ مہر نے ہمیشہ کی طرح اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اور دیا۔ اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ضلعی سکریٹری ڈاکٹر راجندر چودھری نے خیرسگالی کا پیغام دیا۔ دیگر سیاسی و سماجی تنظیموں کی طرف سے بھی کانفرنس کا خیر مقدم کیا گیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان فرمایا،،

"ایک بار پھر ہمارے سامنے اسی طرح کے چیلنج ہیں جو آزادی سے پہلے تھے۔ اور یہ چیلنج زیادہ جارح اور متشدد ہے۔ ہمہ گیر پبلسٹی اور میڈیا کے جدید ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ اعلان کے پیچھے منظم طاقتیں ہیں۔ ان کی دولت اور ان کے وسائل ہیں۔ ہمیں ان پھنکارتی چنوتیوں کا سامنا کرنا ہے اس لئے کہ ان سے شکست ماننے کا مطلب اس کرۂ ارض پر بنی نوع انسان کی آخری اور قطعی شکست ہے انسان کی بے کراں قوت، اس کی روحانی عظمت اور جذبۂ مزاحمت پر ہمارا عقیدہ بے لچک۔ اور اسی غیر فانی ہتھیار سے ہمیں ان تاریک قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے اسی کے ساتھ ساتھ گذشتہ دور میں اعلیٰ ادب کی جو تابناک روایت ہم نے اپنے خون جگر سے تخلیق کی ہے اسے نہ صرف ساتھ لے کر چلنا ہے، بلکہ اسے نئے افکار کی تلاش کی بہرہ ور کرنا ہے۔"

ڈاکٹر وہاب اشرفی صاحب نے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی تحریک ایک زندہ تحریک ہے اور انہوں نے جو تخلیقی سرمایہ چھوڑا ہے ان کے مخالفین اب تک اس کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں۔ اردو ادب کے آسمان پر چمکنے والے ستاروں میں سب سے بڑی تعداد ترقی پسندوں کی ہے۔

ڈاکٹر قیوم ابدالی نے کہا کہ وہ رسمی طور پر شکریہ ادا نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے مہمانوں، سرپرستوں، رانچی کے عوام اور کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے سرگرداں کارکنان کو مبارکباد دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ کانفرنس کی کامیابی محض ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کی کامیابی ہے جنہوں نے اپنے دوست نما دشمنوں اور دشمن نما دوستوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ بقول ان کے جن لوگوں نے انہیں ایک نیا حوصلہ اور نیا یقین بخشا ہے۔ اور حق و صداقت کی جنگ میں شر کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا عزم عطا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پہلے سیشن کے خاتمہ کا اعلان کیا اور تمام سامعین کو چائے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

چائے کے بعد دوسرا سیشن سمینار کا تھا۔ موضوع تھا قومی اتحاد کا مسئلہ اور ترقی پسند ادبی تحریک۔ اپنے کلیدی خطبہ میں ڈاکٹر قمر رئیس نے بڑی تفصیل سے ملک کی موجودہ صورت حال اور انتہا پسند قوتوں کے اعمال پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے ... کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ صورت حال میں ترقی پسندوں کے منصب پر ... ڈاکٹر ... وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔ اس ... نشست ... پہنچی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد "بہار میں ترقی پسند تحریک کے پچاس سال" کے موضوع پر سمینار تھا۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر مصطفیٰ اختر صاحب کا تھا انہوں نے بڑی ہی تفصیل کے ساتھ بہار میں انجمن کے قیام اور ترقی پسند ادبی تخلیق کی رفتار و سمت کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۸۰ء میں انجمن کے تنظیم نو کے بعد کے نوجوان ادیبوں کی انجمن سے وابستگی کا بھی ذکر کیا۔ دوسرا مقالہ ارتضیٰ کریم صاحب کا تھا انہوں نے بہار میں ترقی پسند اردو افسانے کے پچاس سال" کے عنوان سے مقالہ پڑھا، مقالہ بڑی ہی محنت اور جانفشانی سے لکھا گیا تھا، منظر شہاب، افصح ظفر، وہاب اشرفی ڈاکٹر قمر رئیس، جمشید قمر وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔

آخر میں ڈاکٹر ابدالی نے پھر ایک بار مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ رات آٹھ بجے سے MECON کے شیامل ہال میں مشاعرہ کا اعلان کیا اور سب کو شامل ہونے کی درخواست کی۔

شام ہی سے بوندا باندی شروع ہو جانے کی وجہ سے مشاعرہ میں توقع کے مطابق رش تو نہ ہو سکی لیکن مشاعرہ دیر تک جاری رہا اور مقامی لوگوں کے علاوہ غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر قمر رئیس، منظر شہاب، شیدا چینی، سید احمد شمیم وغیرہ نے اپنا اپنا کلام سنایا اور اس طرح بہار کی کانفرنس کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے ۔۔۔ مجھ کو جانا ہے بہت آگے حد پرواز سے



مشرف عالم ذوقی

کربِ خود کلامی

میرے قہقہے
موسم کی نذر ہو گئے
سوکھے ہوئے زرد چہرے پہ
میرے اپنے ہی زہریلے ناخنوں کی بدولت
ان گنت خراشیں اُگ آئی ہیں
میرے بدن کی کمزور عمارت کو دیکھ کر
تہذیب نے
ہنسنا، مسکرانا چھوڑ دیا ہے
میں رحم نہیں بننا چاہتا
کہ ہنستے، مسکراتے ہوئے
اور کھاتے ہوئے
میں اس بات کا یقین کرنا چاہتا ہوں
کہ میں ———
مشرف عالم ذوقی ہوں ▲

زِندگی

زیبا کے دُبلے جسم کو دیکھ کر کہتا
تم کتنی کمزور ہو گئی ہو!
ندیم سے مسکراتے ہوئے پوچھتا
تمہارا اسکول کب کھلنے کا ہے؟
بچی کو گود میں بھرتے ہوئے کہا
تمہارے لئے بازار سے کیا لے آؤں؟"

چھٹیوں کے موقع پر گھر آتے ہوئے
لگتا ہے ———
زندگی میں لوٹ آیا ہوں ▲

نقیب اکیلا

اگر

اگر وقت سے پہلے میں مر گیا تو
میری لاش
اپنا چیل کوؤں کو تم دان کر دینا
تو سالہا سال سے
چوٹیوں پر یونہی آس جمائے
جانے کر خون سورج کا زرد ہونے ہیں

سپاٹ ہتھیلی پر اُگا ہُوا سورج

میرے دونوں ہاتھوں کی یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں
روز ہی
اک ایک کر کے مٹتی جا رہی ہیں
مگر خوش ہوں میں
ایک پیغام یہ مل رہا ہے
اِک نیا انقلاب آ گیا زندگی میں :

سورج ڈوبنے کے بعد

کتنا بدبخت ہوں میں
مجھے اپنے ہی گھر میں گھستے ہوئے
ایک اجنبیت کا احساس ہوتا ہے
دیوار و در
اپنی انجان آنکھیں اٹھا کر
مجھے دیکھتے ہیں
تو لگتا ہے میں ایک بھٹکا مسافر
کسی اجنبی غار میں آ گیا ہوں
جہاں وسوسے گہرا سناٹا اور تیرگی منتظر ہیں!

کرشن لال کو اپنی بیٹی کا بے حد خیال ہے...
تبھی تو انھوں نے لڑکے والوں کو
دو سال ٹھہرنے کے لئے تیار کر لیا!



• کرشن لال کے سبھی دوست احباب حیران ہیں کہ آخر انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی دو سال تک کے لئے کیوں ملتوی کر دی؟ لیکن کرشن لال کا [illegible] ان کی بیٹی کی بھلائی میں ہی ہے۔
• ان کی بیٹی ابھی صرف ۱۶ سال کی ہے اور

وہ شادی اور اس سے جڑی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لائق نہیں ہے۔ دوسرے، کرشن لال اپنی بیٹی کو پڑھنے لکھنے اور بڑھنے کے پورے مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔
ایک ذمہ دار باپ ہونے کا ثبوت دیا ہے کرشن لال نے۔ وہ جانتے ہیں کہ لڑکی کی شادی

اٹھارہ سال اور لڑکے کی شادی پچیس سال سے قبل کرنا ان کے لئے بہت نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ بچوں کو بھی ذہنی اور بالغ ہونے دیں تاکہ وہ ایک صحت مند اور خوشحال مستقبل کے مالک بن سکیں۔

ڈاکٹری صلاح مانئے!

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشوونما ۱۸ برس کی عمر تک [illegible] سال تک [illegible] لیکن [illegible] اگر لڑکی ۱۸ برس سے کم عمر میں [illegible]

• لڑکی کے بدن کی نشوونما رک جاتی ہے۔

• ۱۸ برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔
• ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے۔
• کیونکہ ۱۸ برس کی عمر تک رحم اور [illegible] کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی اس لئے [illegible] بچہ [illegible] میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

• بچہ دانی کی نشوونما ۱۸ سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے بچے کا سر [illegible] پھنس سکتا ہے جس سے [illegible] کمزوری آ جاتی ہے۔
• کم عمری میں [illegible] کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ [illegible]

یاد رکھئے: بچی کے بچہ ہونا اس پر بہت بڑا ظلم ہے
اٹھارہ برس سے کم لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے
مزید معلومات [illegible] کے لئے اس پتے پر لکھئے: پوسٹ بکس نمبر [illegible]، نئی دلی [illegible]

عقیل گیاوی

بانکتا ہے سمٹتے وقت کا تیور ہوں میں
حادثوں کی بھیڑ میں کھویا ہوا پیکر ہوں میں
دھوپ گھر کی خم شدہ دیوار پہ لکھتی رہی
مجھکو مت چھونا زوالِ صبح کا منظر ہوں میں
میں کسی شوکیس کی زینت بنوں ممکن نہیں
منفرد ہے ذات میری میل کا پتھر ہوں میں
صفحۂ قرطاس پہ بے صوت لفظوں کا دھواں
عقابِ فکر کا ٹوٹا ہوا شہپر ہوں میں
بھاگنا پیچھے سرابوں کے مقدر ہے مرا
تشنگی کی دھوپ میں جلتا ہوا پیکر ہوں میں

عنایت الرحمٰن شاکلیوی

ریت پہ صحرا کی میرا نام لکھ
زرد موسم کی ہوا میں اک شام لکھ
کون سی اس میں برائی ہے بھلا
ہوں زمانے میں بہت بدنام لکھ
کوچہ کوچہ گھومنا فطرت مری
میں کہ ہوں اک گردشِ ایام لکھ
آج کی اس رات کا کیف و سرور
خوشبوئے لالہ بدن کے نام لکھ
میری ساری ذلتیں، رسوائیاں
میری ساری شہرتوں کے نام لکھ

حبیب عادل

یہ حادثہ بھی تھا کس درجہ دل شکن دیکھا
وطن میں رہتے ہوئے خود کو بے وطن دیکھا
یہ آگ کتنی بھیانک ہے کھل گیا مجھ پہ
کبھی جو بھڑک سے جلتا ہوا بدن دیکھا
ہر شخص یہاں ہے ہجوم میں تنہا
ہر ایک سمت یہی رنگِ انجمن دیکھا
کھلی جو آنکھ تو سپنے تمام روٹھ گئے
لگی جو آنکھ تو صحرا میں بھی چمن دیکھا
زبان رکھ کے بھی عادل خموش رہنا پڑا
جو بے زباں ہیں انہیں اہلِ سخن دیکھا

غزلیں

اظہر نیّر دربھنگوی

وہ بظاہر آئے آکر چل دیئے
مہر ہونٹوں پہ لگا کر چل دیئے
میرے لب پہ آ گیا تھا انکا نام
لوگ افسانہ بنا کر چل دیئے

خواب میں جن کے رہا مرکا تاج
وہ فقط آنسو بہا کر چل دیئے
پھول جیسی آرزو کو ناز سے
پیر کے نیچے دبا کر چل دیئے
سنگ ساروں کیلئے ہم راہ میں
کانچ کے برتن سجا کر چل دیئے

منتظر نوسادری

لڑکے آفت سے دن گزارا ہے
زیست کو اس طرح سنوارا ہے
عزم و ہمت نہیں ہے جس دل میں
زندگی میں وہ بے سہارا ہے
کل یہ بھڑکے گا شعلہ بن بن کے
آج عارض پہ جو شرارا ہے
غم کے طوفاں میں ڈوب ہی جاتے
میری یادوں نے ہی ابھارا ہے
منتظر جس کے تھے ہم اے منتظر
اب تو نزدیک وہ کنارا ہے

اعجاز احمد چاپاسوی

اک نئی راہ مجھے جبکہ قضا دیتی ہے
زندگی کیوں مجھے جینے کی سزا دیتی ہے
شامِ ظلمت کے جو آنے کا پتہ دیتی ہے
صبحِ امید کی جو کھوٹ کو ضیا دیتی ہے
ہجر ظلمات میں ڈوبی ہوئی کشتی اک دن
تہ میں گہرے سمندر کا پتا دیتی ہے
جب بھی گردوں سے نکلتی ہیں صدائیں اپنی
کھل کے پھر کوئی طوفاں اٹھا دیتی ہے
پیار کی ایک انیٹ سے جب گھر کو بنایا چاہا
بارشِ سنگ کیوں بنیاد ہلا دیتی ہے

غزلیں

حبیب سوزن

خیال میرا، دماغ میرا
ہوا کی زد پر چراغ میرا
ہے مصلحت کُش تلاش میری
حقیقتوں میں سُراغ میرا
مری جبیں پر نشانِ سجدہ
نظر نظر میں ہے داغ میرا
نگارِ قریہ بھی جیب سِلیں گے
جلے گا کب تک چراغ میرا
ہیں سبز خوابوں کے زرد چہرے
اُجڑ نہ جائے یہ خواب میرا

منت ظہیر

بقدرِ حوصلہ ہم بھی زمانے کا چلن دیکھیں
شریکِ انجمن جو جائیں رنگِ انجمن دیکھیں
ہوئے اس دور میں آمادہ دونوں آزمائش پر
دبِ انساں فتنہ پرور ہے کہ دورِ پُر فتن دیکھیں
شکستِ نکہتِ گل کو سمجھتے ہیں مگر پھر بھی
شگفتِ گل کو کس انداز سے اہلِ چمن دیکھیں
نہیں کچھ منحصر دورِ خزاں یا موسمِ گل پر
زمانہ بھی بدل لیتا ہے کیسے پیرہن دیکھیں
کسی کی بات کی تہ تک پہنچنے کے لئے منت
ضروری ہے کہ ہم اس شخص کا روئے سخن دیکھیں

ڈاکٹر نفیس نقی

میں بھی اپنے دور کے محشر میں تھا
اے خدا ہارے ہوئے لشکر میں تھا
آگ کا دریا تھا یخ بستہ ہوا
میں جب اپنے نوجواں پیکر میں تھا
بوڑھی گویائی کے لب خاموش ہیں
جس سے ہنگامہ ہمارے گھر میں تھا
جگمگا اُٹھتا تھا اکثر رات میں
چاند سا ٹکڑا کبھی بستر میں تھا
اب نہ وہ ہنگامہ جوشِ جنوں
جو کبھی اس خاک کے پیکر میں تھا

عاصم شہناز شبلی

ہر کسی کو ناکس لہو میں تر ملا
خون میں ڈوبا ہوا ہر گھر ملا
بے شجر ہر شہر کا منظر ملا
جو پرندہ بھی ملا بے پر ملا
ہم نے سچی بات کہہ دی اس لئے
دار پہ لٹکا ہوا ہی سر ملا
دوستی نے آج یوں بدلا ہے روپ
دوستی کے نام پر خنجر ملا
جو رہے گا کیسے خوش عہد میں
سایۂ دیوار میں ہر سر ملا

افسر سکندپوری

نشانِ کوچۂ جاناں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں
نہیں اب طاقتِ ہجراں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں
فراقِ یار میں تھمتی نہیں ہے چشمِ تر میری
رہا ہوں روز و شب گریاں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں
نہ کی تقدیر نے یاری نہ گردوں نے وفاداری
بتا اے گردشِ دوراں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں
نظر آتا ہے ہر ذرہ میں نور اس مہرِ تاباں کا
مگر مجھ سے ہے وہ پنہاں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں
زمین و آسماں ہیں جس کی جستجو میں سرگرداں
اسی کا افسر ہوں کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈوں

نیاز سلطانپوری

قہر و غضب کا بازار کل بھی تھا اور آج بھی ہے
کوچہ کوچہ گریاں گریاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
لاکھ کھلے تہذیب کے غنچے لاکھ ہوئی تعمیرِ حیات
بارِ الم سے بوجھل انساں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
حدِ نظر تک گلکاری ہے موسمِ گل کی مہکاری ہے
پھر بھی خالی اپنا دامن کل بھی تھا اور آج بھی ہے
ہر منزل پہ دار و رسن ہیں ہر لمحہ پیغامِ اجل ہے
مطربِ دل ہے پھر بھی غزل خواں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
لاکھ چھپا رکھا ہے دامن خود کو سو پردے میں نیاز
چشمِ بشر میں عریاں عریاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

غزلیں

فردوس گیاوی

نر کا نشتر ملا اور کرب کا خنجر ملا
ملا اس شہر میں یادہ ظلم کا پیکر ملا
س پرندے کی بہت اونچی کبھی پرواز تھی
پرندہ آج دھرتی پہ شکستہ پر ملا
دل خزاں آلودگی میں آب بہار زندگی
س طرف بھی میں گیا بے کیف سا منظر ملا
پھر ترسا کیا جس شخص کی دیدار کو
ملا تو زندگی کے آخری در پر ملا
ابھی دیکھ آئے اسے فردوس جسکا نام تھا
س کا پیکر ملا اور رنج کا خوگر ملا

ضمیر درویش

میں ترے زردار بیٹے کے برابر تو نہیں
پر کسی بھی بات میں ماں تجھ سے باہر تو نہیں
پھر ملا سی کی لڑائی میں اترنا ہے مجھے
سچ بتا دو تم میں کوئی میر جعفر تو نہیں
ہم نے مانا تجھ سے قد آور نہیں ہیں ہم مگر
جو اٹھا رہتا ہے تیرے پاس وہ ہم سر تو نہیں
کیوں سجا رکھا ہے کاندھوں پہ غلیموں کے اسے
دیکھ لو قاتل کے ہاتھوں میں مرا سر تو نہیں
مجھ سے کیوں اے میرے دشمن اسقدر خائف ہے تو
ہاتھ میں میرے قلم ہے کوئی خنجر تو نہیں

صابر نیازی

شام ہوتے ہی درختوں پہ کبوتر ٹھہرے
دل کی شاخوں پہ تمناؤں کے لشکر ٹھہرے
میرے افکار کو جملوں نے سجایا اکثر
لفظ و معنی میرے مفہوم کے اندر ٹھہرے
آپ کے حسن سراپا کا میں نقشہ کھینچوں
میری آنکھوں میں اگر خواب کا منظر ٹھہرے
ہم سے مہکے گا ہر اک روز گلستان غزل
ہم کسی شعر کی خوشبو کا مقدر ٹھہرے
تیرے ہر شعر میں صابر ہیں ہزاروں معنی
تو اگر چاہے تو کوزے میں سمندر ٹھہرے

عابد نجم

غا اُن سے انکی نظر آج بھی ہے
ہی دردِ دل بیشتر آج بھی ہے
سمت کیوں دل کھنچا جا رہا ہے
ہی حسن کیوں کارگر آج بھی ہے
بلا میں اسے بے وفا کیسے کہہ دوں
بے سامنے چشم تر آج بھی ہے
نہ ہوا دل کی بستی جلی تھی
دھواں سا اُفق پر مگر آج بھی ہے
معلوم کیوں ہم سفر ہیں گریزاں
ی رہگذر آج بھی ہے

اعجاز طالب

جانے والے نشان چھوڑ گئے
اک نئی داستان چھوڑ گئے
پھر تیقن کے بے صدا لمحے
مجھ میں وہم و گمان چھوڑ گئے
جانے کیسی فضا تھی باہر کی
لوگ صحن و مکان چھوڑ گئے
وہ پرندے چلے گئے لیکن
اپنی میٹھی زبان چھوڑ گئے
کس نے پائی ہے تشنگی طالب
جو بھی آئے جوان چھوڑ گئے

شہناز کانپوری

گڑیوں کا کھیل ہے نہ گھروندا ہے زندگی
طوفاں سے جو لڑے وہ سفینہ ہے زندگی
خونِ شفق نہ خونِ تمنا ہے زندگی
سیلاب رنگ و نور ہے نغمہ ہے زندگی
تجھ کو خبر نہیں مگر اے سیل اشکِ غم
بھولی مسرتوں کا زمانہ ہے زندگی
جب لوحِ کائنات پہ تحریر کچھ نہ تھا
خالق نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے زندگی
یہ زندگی ہے خواب کی مانند کیوں کہیں
تخلیقِ کائنات کا منشا ہے زندگی

غزلیں

عندلیب تاج

...رام ہو نصیب کوئی گھر دکھائی دے
بھٹکے ہوؤں کو میل کا پتھر دکھائی دے

آیا ہے آج پاس تو دل کی زباں کھول
ممکن نہیں کہ تو مجھے اکثر دکھائی دے

آنکھوں میں تشنگی کا جزیرہ لئے ہوئے
ہر شخص مجھکو خشک سمندر دکھائی دے

بچوں کے خشک ہونٹوں پہ ہیں پپڑیاں جمیں
چاروں طرف یزید کا لشکر دکھائی دے

ہر گام پہ ہیں تاج لٹیروں کے قافلے
ہر موڑ قتل و خون کا منظر دکھائی دے

محمد جان شاداب

زہر کھا لوں گا کچھ نہ بولوں گا
ان سے میں رازِ دل نہ کھولوں گا

غم کے بادل برسنے آئے ہیں
کشتیِ دل کو اب ڈبو لوں گا

مست آنکھوں کا جامِ مے ساقی
آج خود کو بھی میں ڈبو لوں گا

مسکراتے ہوئے لبوں کے لئے
گھٹ کے تنہائیوں میں رو لوں گا

جن کی فطرت ہی عشق ہے شاداب
رنگ ان کا غزل میں گھولوں گا

سعید روشن

زینہ زینہ وقت کی تہہ میں اتر جائیں گے ہم
دکھ بڑھ جائیگی بڑھائی، سنور جائیں گے ہم
ایک سے تیرے جدا ہو کر بکھر سے یوں کہ ہم
تیز آندھی میں نہ جانے اب کدھر جائیں گے ہم

دھوپ ہے چاروں طرف قدموں میں تپتی ریت ہے
دو قدم چل کر ہی شاید اب بکھر جائیں گے ہم
اپنے زخموں سے ہی وابستہ رہی اپنی زندگی
زخم جب بھر جائیں گے روشن تو مر جائیں گے ہم

عبدالقادر کلیم اندوری

اہلِ وفا کے بھیس میں یہ دھوکا کرینگے لوگ
ایسے حسین روپ میں ایسا کرینگے لوگ

جس دن مرے وجود پہ چھا جائیگا سکوت
آئینہ مجھکو جان کر دیکھا کرینگے لوگ

پھولوں سے یوں ہی آگ برستی رہی اگر
جشنِ بہار دور سے دیکھا کرینگے لوگ

[illegible] سکوت
گھر میں لگے گی آگ تو دیکھا کرینگے لوگ

الفت اگر کلیم کی معراج پا گئی
[illegible] کرینگے لوگ

مضطر صدیقی

خزاں نصیب شجر صورتِ چمن نکلے
تصورات میں جب کوئی گل بدن نکلے

مزہ تو جب ہے کہ آئے لہو سے بوئے خلوص
ہر ایک زخمِ جگر مثلِ نسترن نکلے

تمہارے جسم کی دھرتی جو گل بداماں ہو
تو بالیقین مرے احساس کا گگن نکلے

مری دعا ہے کہ افکار نو کی خوشبو سے
ہر ایک شے سے معطر ہر انجمن نکلے

نہ جانے کون سے ظلمت کدے میں ہے مضطر
وہ آفتاب کہ جس کی کوئی کرن نکلے

شمیم اقبال

آسماں اپنا ہے فضا اپنی
ہر طرف پھیلی ہے صدا اپنی

ہم پہ ظلم و ستم جفا کرکے
کر رہے ہیں بیاں وفا اپنی

زندگی ہے تو ہم بھی دیکھیں گے
رنگ لاتی ہے کیا دعا اپنی

قابلِ رشک ہے وہی انسان
مان لیتا ہے جو خطا اپنی

دہر کے قید خانے میں اقبال
کاٹتے ہیں یہاں سزا اپنی

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی

اور
وزیر اعلیٰ شری بندیشوری دوبے کی گتی شیل قیادت میں
(۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء تک)
۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت
بہار کی اہم کامیابیاں

- گاؤں کی ترقی پروگرام کے تحت ۷،۸۹،۴۹۳ لوگوں کو غریبی سطح سے اوپر اٹھایا گیا۔
- راشٹریہ گرامین نیوجن پروگرام کے تحت ۵۶،۶۳۰ لاکھ شرم دیوس اور گرامین بھومی ہین نیوجن گارنٹی پروگرام کے تحت ۱۰،۸۸۴ لاکھ شرم دیوس منظور کئے گئے۔
- ۲۵،۸۶۴ ایکڑ زمین کا بٹوارا۔
- ۹۱۱ بندھوا مزدوروں کو بسایا گیا۔
- انوسوچت ذات کے ۴،۶۰،۴۸۶ خاندانوں اور انوسوچت جن ذات کے ۲،۳۲،۱۷۴ خاندانوں کو مالی امداد دی گئی۔
- ۸،۷۴۳ سمیا گرست گاؤں کو پینے کا پانی مہیا کرایا گیا۔
- ۵۱،۵۱۵ مکان کی زمین غیر زمین والوں کے بیچ بانٹی گئی۔
- ۲۶،۷۶۷ خاندانوں کو اپنی حالت سدھارنے کے لئے امداد۔
- ۷۴،۲۰۰ گھر گاؤں میں کمزور طبقے کے لوگوں کے لئے تعمیر
- ۲۱،۵۰۴ گاؤں میں بجلی کرن : ۲۰،۳۴۲ پمپ سیٹ لگایا گیا۔
- ۴۳،۲۴ کروڑ درخت لگائے گئے۔ ۱۰،۳۳۸ بایو گیس لگائے گئے۔
- ۵،۲۱،۴۵۵ لوگوں نے پریوار کلیان کے تحت خوشی سے بندھیاکرن کرایا۔
- جن وترن پرنالی کے تحت ۳۲۶ چلت دوکانیں کھولی گئی۔
- ۱۵،۵۱۷ اسمال انڈسٹریز / ہنڈی کرافٹ اکائیاں کھولی گئی۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار کے ذریعہ جاری

सू० ज० स० बि०-633 (खे-366)/86-87

ریڈیو ناٹک

نوید ہاشمی
اے بی سی انجنیئرنگ کارپوریشن انڈسٹریل ایریا کرجی پٹنہ ۱۰

"سماج کے دشمن"

افراد :- پروین، رضیہ، نادرہ، عارف، اناؤنسر، بدس، شہناز، طاہر، گپتا، انسپکٹر

(ابتدائیہ موسیقی)

(نادرہ کے مکان پر دستک)

درہ : کون ہے (کچھ وقفے کے بعد) ارے رضیہ باجی آپ! آیئے آیئے۔

ضیہ : آج تم آفس کیوں نہیں گئیں نادرہ؟

درہ : بس یوں ہی طبیعت ذرا سست تھی۔

ضیہ : جس دن تم آفس نہیں جاتی ہو اس دن اکیلے پن کے احساس سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

درہ : یہ تو آپ کی محبت ہے رضیہ باجی ورنہ اس زمانے میں ایک سہیلی کو بہن جیسا پیار کون دیتا ہے۔

ضیہ : ہاں نادرہ تم ٹھیک کہتی ہو۔

درہ : اچھا ہوا آج آپ آ گئیں۔

ضیہ : کوئی خاص بات ہے کیا؟

درہ : آج ٹی وی پر بہت اچھا پروگرام ہونے والا ہے اس لئے بلا رہی تھی۔

رضیہ : (خوش ہوکر) تو ٹی وی کھولو نا ... ہے۔

نادرہ : ابھی کھولتی ہوں۔

(ٹی وی کھول دیتی ہے)

اناؤنسر : آج گاندھی میدان میں جہیز کے خلاف ایک آیوجن میں شری عارف نے کہا۔

عارف : اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ اللہ نے عورت کو مرد کے لئے ہی پیدا کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مرد اسے گھر کی چہار دیواری میں قید کرکے رکھ دے، اپنی ہوس کا شکار بنائے اور انگنت بچوں کی پرورش کروائے۔ عورت کو بھی جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک مرد کو ہے (کچھ وقفے کے بعد) ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ جہیز کی رسم آج بھی ہمارے سماج میں عام ہے۔ جہیز جو سماج کے بدن کا کوڑھ ہے جہیز جو ایک ناگ ہے اور ہمارے دیش کی معصوم لڑکیوں کو ڈس رہا ہے لیکن اس کا احساس کسے ہے۔

اس کے خلاف کون نعرہ بلند کرتا ہے ، کون ؟ میں اپنی بہنوں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں ۔ اسکولوں ، کالجوں ، اور دفتروں میں نوکری کریں ۔ اور خود کو اس قابل بنالیں کہ جب کوئی لڑکا والا اس سے جہیز کی بات کرے تو وہ خود جہیز کی فرمائش کردیں ، انہیں بتادیں کہ وہ ان کے لڑکے سے کسی طرح کم نہیں ہیں ۔ وہ تعلیم یافتہ ہیں برسرروزگار ہیں وہ جہیز نہیں دیں گی ، جہیز لیں گی جہیز لیں گی ۔

(عارف کی تقریر ختم ہوتے ہی)

رضیہ : ہاہاہا ...... ہاہاہا ..... ہاہاہا (زوردار قہقہہ)

نادرہ : (حیرانگی سے) ارے رضیہ باجی یہ بھی کوئی ہنسنے کا موقع ہے کیا ؟

رضیہ : (گمبھیر آواز میں) ہنسنے کا موقع زندگی نے کبھی نہیں دیا نادرہ ، کبھی نہیں ، لیکن تمہارا یہ نیتا (زوردار قہقہہ)

نادرہ : آپ سچ مچ پاگل ہو گئیں ہیں رضیہ باجی ورنہ یہ بے تکی باتیں ......

رضیہ : (سرد آہ بھر کر) کاش ! کاش میں پاگل ہوجاتی ، اتنا تو ضرور ہوتا کہ روز روز کے موت سے چھٹکارا پا جاتی ۔

نادرہ : میں سمجھی نہیں کیا بات ہے رضیہ باجی ؟

رضیہ : تم نہیں سمجھ سکتیں نادرہ ، نہیں سمجھ سکتیں ۔ میرے مقابلے میں تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے ۔ تم نہیں جانتیں کہ یہ دنیا کیا ہے اور اس دنیا کے لوگ گرگٹ کی طرح کیسے رنگ بدلتے ہیں ، تم نے اس نیتا کی تقریر محسوس کیا تا ۔

نادرہ : ہاں ہاں کیا وہ ٹھیک نہیں کہہ رہے تھے ۔

رضیہ : (آہ بھر کر) وہ کیا ٹھیک کہے گا نادرہ وہ مکار ہے شکار ، تم نہیں جانتیں ، تم نہیں جانتیں ۔

نادرہ : (حیرانگی سے) یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں رضیہ باجی ، دنیش کے اتنے اچھے نیتا کو آپ مکار کہہ رہی ہیں ، اگر کسی نے سن لیا تو جانتی ہیں کیا ہوگا ؟

رضیہ : (اداس لہجے میں) اب کیا ہوگا نادرہ ، اب کیا ہوگا ۔ جو نہیں ہونا تھا وہ بہت پہلے ہو چکا ہے اب باقی ہی کیا بچا ہے ہونے کو ۔

نادرہ : آپ کیا کہہ رہی ہیں رضیہ باجی ، یہ تو میں جانتی ہوں آپ اب تک کنواری ہیں ۔ اور زندگی کے دن بس یوں ہی گذار رہی ہیں لیکن ......

رضیہ : (بات کاٹ کر) میں کنواری نہیں ہوں نادرہ ، میں کنواری نہیں ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی ۔

نادرہ : رضیہ باجی ہوش کے ناخن لیجئے ، اس قدر جذباتی نہ بنئے کہ جذبات کی رو میں آپ کا سب کچھ بہہ جائے

رضیہ : میں ہوش میں ہوں نادرہ ۔ میں جذبات کی رو میں بہہ نہیں رہی ہوں ۔ میں تو حقیقت بیان کر رہی ہوں حقیقت

نادرہ : لیکن مجھے یقین نہیں آتا رضیہ باجی ، بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے ؟

رضیہ : آخر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا نادرہ ۔ یہ کوئی انہونی بات تو ہے نہیں ، میری طرح بہت سی لڑکیاں اس دیش میں موجود ہیں جن کی آبرو لوٹ کر انہیں حالات کی صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے ۔

نادرہ : آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے کیا ؟

رضیہ : ہاں !

نادرہ : آخر وہ بدمعاش کون ہے جس نے آپ کی زندگی برباد کی ۔

رضیہ : یہی تمہارا نیتا عارف احمد کون ۔

نادرہ : (حیرانگی سے) کیا مجھے یقین نہیں آتا رضیہ باجی۔ یہ تو عورتوں کا محبوب لیڈر ہے صرف عام جلسوں میں ہی نہیں بلکہ اسمبلی میں بھی عورتوں کے حقوق کی پیروی اور جہیز کے خلاف احتجاج بلند کرتا ہے

رضیہ : یہ سب ڈھونگ ہے، فراڈ ہے، دکھاوا ہے۔ اس کے پیچھے بھی اس کا اپنا مقصد کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔ ورنہ آج کا کوئی بھی نیتا عوام کی بے لوث خدمت نہیں کیا کرتا۔

نادرہ : آپ کا مشاہدہ بالکل درست ہے جب سے ان لیڈروں نے عورت کے حقوق کی پیروی اور جہیز کے خلاف نعرے لگانا شروع کئے ہیں عورتوں کا استحصال اور جہیز کی رسم اور شدت اختیار کرنے لگے ہیں۔ لیکن خیر، آپ عارف صاحب کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔؟

رضیہ : ہاں میں تمہیں اندھیرے سے روشنی میں لانا چاہتی ہوں میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ان لیڈروں سے کوئی امید وابستہ رکھنا فضول ہے۔ ان کی زبان بے لگام ہے۔ جو جی میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں کالج میں پڑھتی تھی۔ اور تمہارا یہ نیتا میرا کلاس فیلو تھا۔ ایک دن۔

(موسیقی)

(فلیش بیک)

(کالج کا احاطہ)

عارف : ہیلو رضیہ (کچھ وقفے کے بعد) کیا بات ہے رضیہ تم مجھ سے کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو۔؟

رضیہ : نہیں عارف ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

عارف : رضیہ تم نہیں جانتیں، میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ (کچھ وقفے بعد) رضیہ تم خاموش کیوں ہو، میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟

رضیہ : کیا جواب دوں عارف، میں خود کو اس لائق نہیں پاتی۔ میں ایک معمولی کلرک کی بیٹی ہوں۔ اور تم ایک آفیسر کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ہمارا میل کبھی نہیں ہو سکتا۔

عارف : نہیں رضیہ نہیں، ایسا نہ کہو، محبت ذات پات اونچ نیچ کچھ نہیں دیکھتی۔ اس کالج میں تمہارے علاوہ اور بھی بہت ساری لڑکیاں موجود ہیں جو اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے کئی تو مجھے لفٹ بھی دیتی ہیں۔ لیکن میرا دل ان کی طرف نہیں جھکتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے صرف تمہیں میرے لئے پیدا کیا ہے۔ اور میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

رضیہ : اس دن میں رات بھر سو نہ سکی تھی۔ رات بھر میں عارف کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ اسمارٹ ہے، خوبرو ہے، نڈر ہے، مجھے چاہتا ہے، اس کے دل میں میرے لئے محبت ہے۔ وہ اگر چاہتا تو فریدہ سے محبت کر سکتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو شہناز سے محبت کر سکتا تھا۔ شہناز تو اس پر بری طرح فریفتہ تھی۔ وہ خوبصورت تھی، اسمارٹ تھی، دولتمند تھی۔ لیکن اس نے کبھی شہناز کو لفٹ نہ دیا۔ وہ کبھی لڑکیوں کے پیچھے نہ بھاگا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مجھے چاہتا ہے۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا میں رات بھر اس کے بارے میں سوچ

رہی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ وہ میرے لئے صرف میرے لئے۔ اور میں رفتہ رفتہ اس کے قریب ہوتی گئی۔ وہ میرے قریب ہوتا گیا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔

نادرہ : گویا آپ اس کے جال میں پھنس گئیں۔

رضیہ : ہاں!

نادرہ : پھر کیا ہوا؟

رضیہ : پھر ایک دن۔

(موسیقی)

(فلیش بیک)

عارف : ہیلو رضیہ

رضیہ : ہیلو عارف

عارف : کالج کے لان میں پھولوں کے درمیان تم طرح بیٹھی ہوئی ہو جیسے خوشنما رنگ والی تتلی۔

رضیہ : (ایک خاص ادا سے) ہاں تو بھی ہر وقت تمہارا موڈ شاعرانہ ہی رہا کرتا ہے کام کی بات کبھی نہیں کرتے۔ پتہ نہیں تم شاعر بن کر لیڈر کیسے بن گئے۔

عارف : (ہنستے ہوئے) شاعر، لیڈر، کام کی بات! بہت خوب بہت خوب۔

رضیہ : عارف! میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔

عارف : صرف ایک ہی کیوں؟

رضیہ : مذاق نہ کرو عارف! میں بالکل سنجیدہ ہوں۔

(عارف) : سنجیدگی سے (کیا بات ہے رضیہ، اچانک تم اتنی کیوں ہو گئیں۔

رضیہ : اب ہمیں شادی کر لینی چاہئے۔

عارف : کر لیں گے، کر لیں گے۔ اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔

رضیہ : (خوش ہو کر) سچ؟

عارف : بالکل سچ، ہم نے محبت کی ہے، ایک دوسرے کو چاہا ہے، پسند کیا ہے۔

رضیہ : (خوش ہو کر) تو پھر آج ہی اپنے ڈیڈی سے بات کرو۔ میں بھی اپنے گھر والوں کو بتا دیتی ہوں۔

عارف : ضرور بتا دو، لیکن آج اچانک تمہیں شادی کا خیال کیسے آ گیا، تعلیم ختم کرنے کے بعد اگر ہم شادی کرتے تو ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔

رضیہ : اگلے مہینے ہمارا فائنل امتحان ہے ہم امتحان کے بعد ہی شادی کریں گے لیکن گھر والوں کو بتا دیں کہ تاکہ وہ بھی اپنے انتظام میں لگ جائیں

عارف : ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں آج ہی اپنے ڈیڈی سے بات کرتا ہوں

موسیقی

(منظر بدلتا ہے)

رضیہ : کئی دن گذر گئے۔ اور عارف کالج نہیں آیا۔ تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ ایک انجانا سا خوف مجھے پریشان کرنے لگا۔ اس کے کالج نہ آنے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی کبھی سوچتی بیمار تو نہیں ہو گیا۔ کبھی سوچتی اس کے گھر والوں نے شادی سے انکار تو نہیں کر دیا کبھی سوچتی اگر اس کے گھر والے رضامند نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ باصلاحیت اور نیک خصلت کا حامل ہے۔ وہ ہے اس کے سینے میں پیار کرنے والا ایک دل ہے۔ وہ مجھے بے حد چاہتا ہے وہ ضرور کسی کام کے تحت باہر گیا ہوگا۔ اور دو چار دنوں میں آ جائے گا۔

نادرہ : تو کیا وہ نہیں آیا؟

رضیہ : آیا!

نادرہ : تو پھر کیا ہوا؟

رضیہ : سپھر

(موسیقی)

(فلیش بیک)

رضیہ : (شکایت آمیز لہجے میں) کیا بات تھی عارف! کئی دنوں سے تم کالج نہیں آرہے تھے؟

عارف : (لاپرواہی سے) بس یوں ہی کوئی خاص بات نہیں تھی

رضیہ : میں بہت شدت سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔

عارف : کیوں؟

رضیہ : میں نے اپنے گھر والوں سے بات کرلی ہے، وہ تیار ہیں، میرے والدین تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ آج شام کی چائے تم میرے گھر پیو۔ ماں نے خاص طور سے تاکید کی ہے۔

عارف : (بے رُخی سے) مجھے افسوس ہے رضیہ

رضیہ : (حیرانگی سے) کیوں؟

عارف : میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔

رضیہ : (بہت ہی حیرت سے) مجھ سے شادی نہیں کرسکتے؟

عارف : (سپاٹ لہجے میں) ہاں رضیہ! مجھے اپنا بھی تو فیوچر دیکھنا ہے، تمہارے فادر ایک معمولی کلرک ہیں۔ وہ مجھے جہیز میں کیا دیں گے۔ میرے ڈیڈی دوسری جگہ میرا رشتہ طے کر رہے ہیں۔ وہ لوگ کافی دولتمند ہیں۔

رضیہ : (رندھی ہوئی آواز میں) تو یا تمہیں بھی جہیز چاہئے؟

عارف : (سینہ پھلا کر) کیوں نہیں۔ میں اسمارٹ ہوں، خوبرو ہوں، پڑھا لکھا ہوں۔ میرے ڈیڈی آفیسر ہیں۔ ارے آج کل تو جہیز وہ لے رہے ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کیا میں ایک لڑکی سے ملنے والا سے بھی گیا گزرا ہوں۔

رضیہ : (حیرانگی سے) یہ تم کیا کہہ رہے ہو عارف! تم نے تو ہمیشہ جہیز کے خلاف احتجاج کیا ہے پچھلے دنوں کالج کے ایک فنکشن میں تم نے عورتوں کے بنیادی حقوق اور جہیز کے خلاف کتنی اچھی تقریر کی تھی۔ تم نے تو جوانوں کو جہیز کے خلاف اکسایا تھا۔ ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جہیز کے خلاف کام شروع کردیں۔ اور اب تم خود ہی۔

عارف : دیکھو رضیہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے یہ ضروری نہیں کہ جو میں کہوں اس پر خود بھی عمل کروں۔

رضیہ : (رندھی ہوئی آواز میں) اور وہ عہد و پیماں؟

عارف : وہ سب وقتی تھا دل بستگی کے لئے۔

رضیہ : اور میرا کنوارہ پن؟

عارف : (بگڑ کر) بیکار کی باتیں نہ کرو رضیہ! وہ جوانی کا اک خوب صورت کھیل تھا جسے ہم دونوں نے مل کر اسٹیج کیا تھا اگر تم اپنے کنوارے پن کا دعوی کر سکتی ہو تو میں بھی اپنے کنوارے پن کا دعوی کر سکتا ہوں۔ عزت مرد کی بھی ہوا کرتی ہے۔

رضیہ : (روتے ہوئے) ایسا نہ کہو عارف! ایسا نہ کہو۔ عورت و مرد کی عزت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا عارف لیکن میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں کہیں کی نہ رہ پاؤں گی۔ مجھ پر ترس کھاؤ عارف! مجھے تباہ ہونے سے بچالو عارف بچالو (پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز)

عارف : تمہارے ان آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا ہے رضیہ! میں نے فیصلہ کرلیا ہے اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔

(پس منظر میں رضیہ کے رونے کی آواز اور دردناک

(موسیقی کی لہر)

(منظر بدلتا ہے)

رضیہ : (سرد آہ بھر کر) اور اس طرح میں ٹوٹ گئی بلکہ یوں سمجھ لو نادرہ کہ میں مر گئی، زندہ درگور ہو گئی ہوں۔

نادرہ : ہوں! تو یہ بات ہے آپ نے اس سلسلے میں پھر کچھ نہیں کیا رضیہ باجی؟

رضیہ : (ڈوبتی ہوئی آواز میں) کیا کر سکتی تھی نادرہ۔ میں ایک غریب اور کمزور لڑکی بھلا کیا کر سکتی تھی۔ اور پھر ہمارے سماج نے ہمیشہ مردوں کو سرخ رو اور عورتوں کو حقیر سمجھا ہے۔

نادرہ : لیکن اب تو ایسی باتیں نہیں ہیں۔ اب سماج نے ہمیں برابری کا حق دے رکھا ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں۔

رضیہ : یہ تمہاری خوش فہمی ہے نادرہ، تم نیتاؤں کی تقریروں، اخباروں اور رسالوں کی بنیاد پر ایسی باتیں کر رہی ہو۔ ورنہ عورتوں کا استحصال آج بھی عروج پر ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اسکولوں، کالجوں، اور دفتروں میں نوکری کرنے والی عورتیں استحصال کا شکار نہیں؟

نادرہ : ان کا استحصال کیسے ممکن ہے؟

رضیہ : یہ تو اپنے اپنے طور پر محسوس کرنے کی چیز ہے نادرہ! میں جسے استحصال سمجھتی ہوں ممکن ہے کہ تم کوئی اسے اور نام دے دو۔

نادرہ : کیا مطلب؟

رضیہ : میں بتاتی ہوں، ایک دن میں آفس گئی۔ اس دن میں نے گلابی رنگ کی ساڑی اور بلاؤز پہن رکھی تھی۔ کوئی میک اپ نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی میں کبھی میک اپ نہیں کیا کرتی ہوں۔ لیکن اس دن نہ جانے کیوں میرا چہرہ کچھ نکھرا نکھرا سا تھا۔ آفس میں پہونچنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی بھوکے شیر کے پنجرے میں آ گئی ہوں۔ چپراسی سے لے کر بڑا بابو تک مجھے بھوکی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اور فقرے کستے رہے۔ اور میں اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ اور جب مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں اٹھ کر بوس کے چیمبر میں چلی گئی۔

(موسیقی)

(فلیش بیک)

رضیہ : میں اندر آ سکتی ہوں سر

بوس : ضرور ..... ضرور کیوں نہیں کیا بات ہے رضیہ؟

رضیہ : (تیز لہجے میں) آپ کے آفس میں کوئی شریف لڑکی کام نہیں کر سکتی کیا؟

بوس : کیوں نہیں، کیوں نہیں، بات کیا ہے؟

رضیہ : آپ اپنے اسٹاف کو جا کر سمجھا دیں وہ مجھے اکثر چھیڑتے رہتے ہیں۔

بوس : (ہنستے ہوئے) صرف چھیڑتے ہیں نا اور تو کچھ نہیں کرتے؟

رضیہ : (غصے میں) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟

بوس : (بہت ہی اطمینان سے) ٹھیک کہہ رہا ہوں رضیہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور تو تمہاری جوانی اور خوب صورتی کا ہے۔ آفس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو اس طرح کا کوئی خیال نہیں کرنا چاہئے

رضیہ : (غصے سے دانت پیس کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟

بوس : میں ٹھیک کہہ رہا ہوں رضیہ، اگر پروموشن کی خواہش ہو گی تو دفتر کے باہر مجھ سے مل لینا، ڈبل پروموشن دیدوں گا۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

رضیہ : سبھی دفتر کا یہی حال ہے۔ اب ایسی صورت میں ہمارے دیش کا کوئی نیتا یا افسر جو عورتوں کو بستر کی چادر سمجھتا ہے وہ اگر عورتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کی باتیں کریں تو کیا ہنسی نہیں آئے گی ؟

نادرہ : ہاں رضیہ باجی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

رضیہ : اچھا نادرہ! اب میں چلتی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے

نادرہ : اچھا، خدا حافظ۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

(سڑک کا پس منظر)

شہناز : ڈرائیور ذرا گاڑی روکنا (پکار کر) رضیہ اے رضیہ

رضیہ : (دیر آگئی سے) ارے شہناز تم ؟

شہناز : ہاں! ہاں میں، تم تو اپنی سہیلی کو ایک دم بھول گئیں کالج چھوڑنے کے بعد ایک دن بھی یاد نہیں کیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اس شہر میں نہیں ہو۔ اور شادی کر کے کہیں اور چلی گئی ہو۔ ورنہ میں تم سے ضرور ملی ہوتی۔

رضیہ : یہ تمہاری محبت ہے شہناز ورنہ کہاں میں اور کہاں تم۔

شہناز : بیکار کی باتیں نہ کرو رضیہ، یہ بتاؤ کہ تم کیسی ہو اور تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں۔ اور اب تک تم کتنے بچوں کی ماں بن چکی ہو۔ اب تو ماشاء اللہ تمہارے بچے بھی جوان ہو چکے ہوں گے۔؟

رضیہ : (اداس لہجے میں) میں نے اب تک شادی نہیں کی شہناز

شہناز : (بہت ہی حیرت سے) کیوں ؟

رضیہ : بس یوں سمجھو کہ زندگی کا سکھ میرے مقدر میں نہیں تھا تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم نے کہاں شادی کی اور زندگی کے دن کیسے گذر رہے ہیں ؟

شہناز : تم عارف کو جانتی ہونا ؟

رضیہ : کون عارف ؟

شہناز : ارے وہی جو ہمارے کلاس فیلو تھے اور اب بہت بڑے لیڈر ہیں۔

رضیہ : ہاں، اسے بھلا کون نہیں جانتا۔ آج ہی ٹی وی پر اس کا پروگرام بھی تھا۔

شہناز : وہ میرے شوہر ہیں۔ اور انہیں بیوی بچوں سے زیادہ اپنی سیاست پیاری ہے۔

رضیہ : گویا تم اس سے خوش نہیں ہو ؟

شہناز : چھوڑو ان باتوں کو میں ذرا جلدی میں ہوں۔ اگلے ہفتے میری بیٹی پروین کی شادی ہے۔ اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہ لو ویڈنگ کارڈ، شادی میں ضرور آنا۔ اگر نہیں آؤ گی تو میں سمجھوں گی کہ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اور نہ ہی تم مجھے اپنی سہیلی سمجھتی ہو۔

رضیہ : ایسا نہ کہو شہناز میں پوری کوشش کروں گی۔

شہناز : کوشش نہیں، وعدہ کرو۔

رضیہ : اچھا بابا وعدہ کرتی ہوں ضرور آؤں گی۔

(دونوں کے ہنسنے کی آواز)

شہناز : ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔ ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کرو۔ بائی بائی رضیہ۔

رضیہ : بائی بائی شہناز۔

(کار کی آواز)

رضیہ : (خود کلامی) گویا عارف نے شہناز سے شادی کی تھی۔ اور اب شہناز عارف سے خوش نہیں ہے۔

عارف کو بیوی بچوں سے زیادہ سیاست پیاری ہے۔ اس نے تو صرف دولت کی خاطر شہناز سے شادی کی تھی۔ اب جب دولت مل گئی تو بیوی بچے جہنم میں جائیں۔ کیا فرق پڑتا ہے، لالچی کمینہ۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

(شہناز کی کوٹھی میں چہل پہل، شہنائی کی آواز)

شہناز : (خوش ہو کر) آؤ رضیہ آؤ، بہت دیر کر دی تم نے میں تو ناامید ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ سبھی مہمان آگئے ہیں لیکن رضیہ اب تک نہیں آئی وہ نہیں آئے گی کیا؟

رضیہ : (ہنستے ہوئے) جب وعدہ کر لیا تھا تو آنا ہی تھا شہناز، بارات آگئی کیا؟

شہناز : نہیں، بس آتی ہی ہو گی۔

رضیہ : پروین کہاں ہے؟

شہناز : اپنے کمرے میں سہیلیوں کے ساتھ، چلو اس سے ملواتی ہوں۔

رضیہ : چلو

شہناز : پروین ان سے ملو، یہ ہیں تمہاری آنٹی، رضیہ میری بہت پرانی سہیلی۔

پروین : ہیلو آنٹی۔

رضیہ : ہیلو پروین،

پروین : آپ اس شہر میں نہیں رہتی ہیں کیا رضیہ آنٹی۔ میں ممی کی سبھی سہیلیوں کو جانتی ہوں لیکن آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔

رضیہ : رہتی تو اسی شہر میں ہوں پروین۔ لیکن میں یہ سمجھ رہی تھی کہ شہناز اس شہر میں نہیں ہے ورنہ ضرور ملی ہوتی۔

پروین : اب برابر آیا کیجئے گا آنٹی۔

رضیہ : ہاں ہاں ضرور آؤں گی۔

شہناز : چلو رضیہ، ہال میں چلتے ہیں۔

رضیہ : عارف کہاں ہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔

شہناز : اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھے شراب پی رہے ہیں

رضیہ : (حیرت سے) شراب؟

شہناز : ہاں، ہاں شراب، شراب ان کے لئے حرام نہیں ہے

رضیہ : میرا مطلب حرام حلال سے نہیں ہے شہناز، میں تو یہ سوچ کر حیران ہوں کہ ان کی بیٹی کی بارات آنے والی ہے اور وہ اطمینان کے ساتھ شراب پی رہے ہیں۔

شہناز : سچ پوچھو رضیہ تو میں نے عارف سے شادی کر کے اپنی زندگی تباہ کر لی۔ مجھ سے زیادہ سکھی تو میرے گھر کی نوکرانی ہے۔ جو اکثر مجھے اپنے شوہر کی محبت، وفاداری کے قصے سناتی رہتی ہے اور اس کے گن گاتی رہتی ہے۔

رضیہ : ہوں۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

عارف : (جھومتے ہوئے) اب شراب نوشی بند، اب ہم سب پنڈال میں چلیں گے بارات کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

ایک ساتھ کئی آوازیں، ضرور ضرور۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

عارف : (حیرت سے پھٹی آواز میں) ارے رضیہ تم، تم یہاں کیسے آگئیں۔؟

رضیہ : میرا آنا تمہیں اچھا نہیں لگا کیا؟

عارف : نہیں نہیں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں یہ تو میری خوش نصیبی ہے کیا تم اسی شہر میں ہو مجھے پتہ ہی نہیں تھا ورنہ تم سے ضرور ملا ہوتا۔

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

گپتا : انسپکٹر

انسپکٹر : یس سر

گپتا : کوٹھی چاروں طرف سے گھیر لو

انسپکٹر : یس سر

(موسیقی)

(منظر بدلتا ہے)

گپتا : مسٹر عارف آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔

عارف : (چونک کر) مجھے؟

گپتا : جی ہاں آپ کو، یہ رہا میرا آئیڈینٹیٹی کارڈ۔ اور یہ آپ کا وارنٹ۔

عارف : (کارڈ پڑھتے ہوئے) کے این گپتا سی بی آئی آفیسر، ہوں مسٹر گپتا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرا جرم کیا ہے؟

گپتا : بے شک! آپ کے خلاف یہ رپورٹ ہے کہ آپ نے ملک اور قوم کو لوٹ کر بے شمار دولت جمع کیا ہے۔ اور اب آپ اپنی بیٹی کو جہیز میں اسی کالے دھن سے خرید کر امپورٹیڈ کار، امپورٹیڈ فریج، ہیرے جواہرات کے زیورات، اور بھی بے شمار اشیاء دے رہے ہیں۔ کیا یہ جرم سنگین نہیں ہے جبکہ آپ خود ایک بڑے لیڈر ہیں۔ آپ کو تو ایک مثالی آدمی ہونا چاہئے تھا۔

عارف : ہا ہا ہا ...... مثالی آدمی، بہت خوب، بہت خوب (لہجہ بدل کر) مسٹر گپتا کیا آپ جانتے ہیں کہ میں ایک خاندانی دولت مند ہوں۔ میرے فادر بہت بڑے آفیسر تھے۔ اور میرے فادر اِن لا بہت بڑے بزنس مین ہیں اور یہ کہ میرے خلاف یہ رپورٹ میرے مخالف ایک گروپ کا ہتھکنڈہ بھی تو ہو سکتا ہے تاکہ میں بدنام ہو کر عوام کی نگاہوں سے گر جاؤں۔ اور وہ اپنا الو سیدھا کریں۔

گپتا : مسٹر عارف ایک سیاست داں ہیں۔ اور ملک کا ایک خاص رکن۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ سی بی آئی ڈیپارٹمنٹ جب تک مکمل چھان بین نہیں کر لیتا کہیں چھاپہ نہیں مارتا۔ آپ کی کوٹھی چاروں طرف سے گھیر لی گئی ہے۔ آپ اپنی صفائی کورٹ میں پیش کریں۔ انسپکٹر عارف صاحب کو وین میں لے چلو اور گھر کے سارے سامان کو سیز کر لو۔

انسپکٹر : چلئے! مسٹر عارف

عارف : (عاجزی کرتے ہوئے) دیکھئے مسٹر گپتا میری بیٹی کی زندگی کا سوال ہے آج شادی ہو جانے دیجئے کل میں خود ہی چل کے آپ کو پولس کے حوالے کر دوں گا۔

گپتا : مجھے افسوس ہے مسٹر عارف میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا

عارف : (گڑگڑاتے ہوئے) ایسا نہ کیجئے مسٹر گپتا ایسا نہ کیجئے میری بیٹی کی شادی ہو جانے دیجئے پلیز! مسٹر گپتا پلیز،

شہناز : عارف میں یہ سب کیا سن رہی ہوں۔

عارف : (رندھی ہوئی آواز میں) تم نے جو کچھ بھی سنا ہے ٹھیک ہی سنا ہے شہناز میں ارریسٹ کر لیا گیا ہوں۔

شہناز : (رندھی ہوئی آواز میں) نہیں عارف نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا، (رونے کی آواز)

پروین : (گھبرائی ہوئی آواز میں) کیا ہوا امی، آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں آخر بات کیا ہے؟

شہناز : (روتے ہوئے) تمہارے ڈیڈی ارریسٹ ہو گئے، پروین ارریسٹ۔

پروین : (روندھی ہوئی آواز میں) لیکن کیوں؟

رضیہ : بلیک منی کے جرم میں۔

پروین : (حیرت سے) بلیک منی کے جرم میں؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں رضیہ آنٹی۔

رضیہ : ہاں پروین، بلیک منی۔

پروین : (روتے ہوئے) نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کہہ دیجئے ڈیڈی یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز)

عارف : (رومانسی آواز میں) سب ٹھیک ہو جائے گا پروین۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہیں روؤ بیٹی، نہیں روؤ۔

(رونے کی مسلسل آواز)

(دور سے بینڈ باجے کی آواز ابھرتی ہے)

ایک شخص : بارات آگئی، بارات آگئی۔

(کچھ وقفے کے بعد)

طاہر : (حیرانگی سے) ارے بات کیا ہے یہ گھر ماتم کدہ کیوں بنا ہوا ہے؟

شہناز : (روتے ہوئے) ہم لٹ گئے طاہر صاحب برباد ہو گئے پولیس نے عارف کو اریسٹ اور جہیز کے سارے سامان کو سیز کر لیا ہے۔

طاہر : (حیرانگی سے) لیکن کیوں؟

شہناز : (سسکتے ہوئے) بلیک منی کے جرم میں۔

طاہر : ہوں تو یہ بات ہے۔ (تیز آواز میں) بارات واپس لے چلو۔ یہ شادی نہیں ہوگی۔ بھلا بغیر جہیز کے ہم یہ شادی کیسے کر سکتے ہیں۔

شہناز : (گڑگڑاتے ہوئے) میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں طاہر صاحب، ایسا نہ کیجئے اگر بارات واپس لوٹ گئی تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ میری بیٹی کی زندگی برباد ہو جائے گی برباد۔

طاہر : گویا میں آپ کی بیٹی کے لئے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر دوں آخر میرا بیٹا بھی افسر ہے افسر۔ کیوں عارف صاحب ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

عارف : (گڑگڑاتے ہوئے) میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں طاہر صاحب: بلیز یہ شادی ہو جانے دیجئے، میں بعد میں لسٹ کے مطابق سارا سامان دے دوں گا۔

طاہر : (مذاق اڑاتے ہوئے) ہا ہا ہا ..... لسٹ کے مطابق۔ (لہجہ بدل کر تیز آواز میں) مسٹر عارف اپنی زبان بند کیجئے ایسی ذلت اٹھانے کے بعد بھی آپ کے ہوش ٹھکانے نہیں آئے۔ آپ پھر مجھے جہیز کا لالچ دے رہے ہیں مسٹر عارف میں آپ کی طرح جہیز کے خلاف لمبی چوڑی تقریریں نہیں کرتا ہوں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ جہیز کتنی بری لعنت ہے اور جس نے کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ لیکن میں آپ کی بیٹی کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا۔ میرے بیٹے کو آپ کی بیٹی پسند ہے یہی میرے لئے کافی ہے۔ میں غریب ضرور ہوں۔ لیکن لالچی نہیں۔ یہ شادی ہوگی، ابھی ہوگی، اسی وقت ہوگی۔

رضیہ : آداب بھائی جان

طاہر : (حیرانگی سے) ارے رضیہ تم، تم گھر کیوں نہیں آئیں۔ اماں اور تمہاری بھابی تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں۔ ابا بھی تمہیں بہت یاد کر رہے تھے، ان دنوں کافی بیمار ہیں۔ ارے بھئی نند اور بھاوج کا جھگڑا تو مشہور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھر ہی چھوڑ دو۔ اور ماں باپ بھائی بہن سب کو بھول جاؤ۔ دلہن کو ساتھ لے کر تم ہمارے ساتھ گھر چلو گی عارف صاحب یہ میری چھوٹی بہن رضیہ ہے۔ اور اسی شہر میں رہتی ہے۔ (تیز آواز میں) چلو بھائی نکاح کا انتظام کرو۔ (شہنائی کی آواز کے ساتھ فیڈ آؤٹ)

بہار میں
نئی صنعتی پالیسی کے تحت
صنعتوں کو رعایت

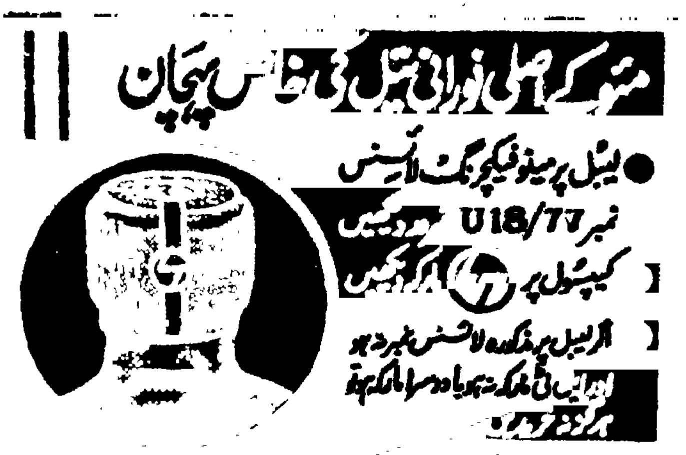
- الیکٹرانکس کے کچے مال اور الیکٹرانک اتپادن پر بکری ٹیکس سے چھوٹ۔
- بجلی سے متعلق مالی امداد میں اضافہ۔
- بجلی ٹیکس میں ۲۵ فی صد اضافہ۔
- ساد ھت/ اساد ھت کچے مال پر بکری ٹیکس سے متعلق رعایت۔ ● تکنیکی معلومات کیلئے مالی امداد میں اضافہ
- جانچ لیبارٹری کیلئے ضروری مشین یا سامان کی خریداری پر چھ ہزار روپے تک انودان۔
- آئی۔ ایس۔ آئی مارک حاصل کرنے کے اخراجات میں دو ہزار روپے تک انودان۔
- انڈسٹریل اسٹیٹ میں صرف ۵ فیصد قیمت کی ادائیگی (باقی رقم آسان قسطوں میں ادا کرنے پر) پر زمین پر قبضہ
- آدی باسی اور پچھڑوں کو خاص رعایت۔
- پہلی قسط میں صرف ۵ فیصدی ادائیگی پر انڈسٹریل اسٹیٹ میں کرایہ خرید کی شرطوں پر زوڈ کا انتظام۔
- امداد شدہ قیمتوں پر شیڈ/ زمین کا الاٹمنٹ۔
- بہار اسٹیٹ فنانس کارپوریشن، بہار اسٹیٹ کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن سے پونجی گت خرچ کے لئے آسان شرطوں پر میعادی قرض کا انتظام،
- ضرورت مند صنعتوں کے لئے ورکنگ کیپٹل کا انتظام،
- سات غیر صنعتی ضلعوں میں زمین، مکان اور مشینوں کے لئے ۲۵ فی صد کی در سب سیڈی۔

سنگل ونڈو سسٹم کے تحت زمین، پانی، بجلی، مالی امداد وغیرہ سے متعلق معلومات کی فراہمی۔

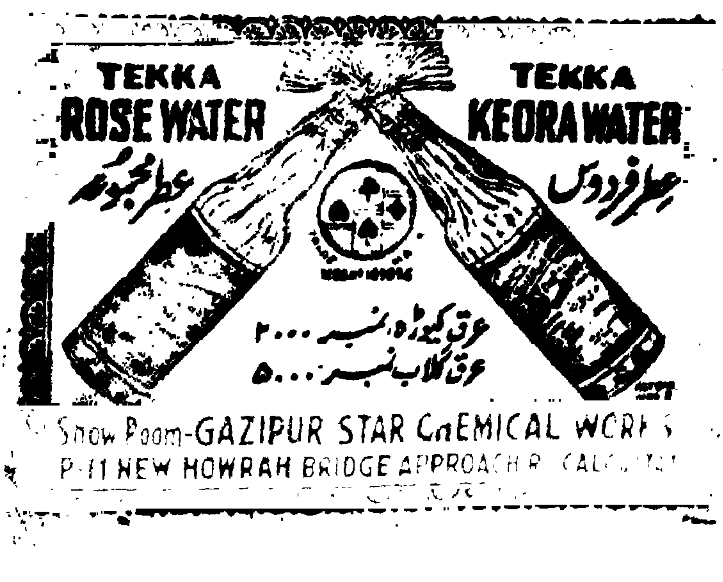
ڈاٹا بینک کے ذریعہ سے ایک ہی جگہ پر صنعت اور بازار سے متعلق آنکڑے اور تکنیکی معلومات حاصل کرا دینے کا انتظام۔

محکمہ صنعت، بہار کے ذریعہ جاری

सं० जा० सं० वि०-11 आर (सं०-6) 87-88


مئو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان
لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس
نمبر U18/77 ضرور دیکھیں
کیپسول پر مارکہ دیکھیں


نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰
GAZIPUR STAR CHEMICAL
P-11 NEW HOWRAH BRIDGE

عبدالباری خاں
تاجو خیل
شاہجہاں پور (یوپی)

"بھولے سیاں"

سیٹھ ملو داس ٹلو مل کی کئی بیگھہ زمین پر زیر تعمیر کوٹھی کا کام اچانک روک دینا پڑا۔ ایک طرف سمنٹ فیکٹری میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی تو دوسری طرف بھتیجوں نے تعمیر کے خلاف ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کر لیا تھا سیٹھ جی نے حفاظت کے لئے ایک پہاڑی چوکیدار مقرر کر دیا جو مع اپنی بیوی کے کوٹھی میں رہنے لگا۔

کوٹھی کے احاطے میں کھڑے بڑے بڑے سایہ دار درختوں پر طرح طرح کے پرندوں و چڑیوں کا بسیرا رہتا۔ پچھلے اپریل کی بات ہے کہ کوٹھی کے ایک برآمدے میں کئی چڑے ایک حسین و نوجوان چڑیا کے گرد بازو کھولے و پر پھیلائے، جیسے آغوش وا کئے ہوں فدویانہ انداز میں چوں چوں کرتے ناچ رہے تھے اور چڑیا کبھی کسی ایک چڑے کی طرف دوڑ کر بڑے پیار کے انداز میں اس کے اپنی ننھی سی چونچ مارتی، تو وہ پھر سے اڑ کر دوسری طرف چلا جاتا۔ تو چڑیا کسی دوسرے چڑے کی طرف راغب ہو جاتی کچھ دیر تک یوں ہی چڑوں کے اس رقص فدویانہ اور چڑیا کے انداز دلربایانہ کا سلسلہ جاری رہا اور پھر چڑوں میں ایک خوفناک جنگ چھڑ گئی، چڑیا پھر سے اڑ کر برآمدے میں ایک طرف کو بڑی دوری پر جا بیٹھی اور عاشقان جانباز کی جنگ رقیبانہ سے لطف اندوز ہونے لگی، آٹھ دس منٹ کی جنگ کے بعد ایک دلیر و بہادر چڑے کو فتح نصیب ہوئی۔ چڑے نے سینہ پھلا اور گردن تان کر بہ انداز قلندرانہ ادھر ادھر دیکھا پھر دونوں بازو پھیلا کر فدویانہ انداز میں چوں چوں کرتا پھر سے اڑ کر چڑیا کے پاس جا بیٹھا۔ چڑیا نے بڑی محبوبانہ ادا سے چوں چوں کر کے چڑے کے دو تین چونچیں مار دیں اور یوں اس کی کامرانی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور چڑے کو قبول کر لیا۔

اگر چڑا ایک بہادر نوجوان اور خوبصورت نر تھا تو چڑیا بھی حسن و شباب کا ایک مکمل شاہکار تھی۔ ہلکے ہلکے خاکی کالے و کھتئی رنگ کے ملے جلے ریشمی بال و پر، چھوٹے چھوٹے سرخی مائل نازک نازک پیر، ذرا کو لٹکتی ہوئی پتلی دُم، ابھرے ہوئے سینے پر ریشم سے ملائم سفید چمکیلے پر، چھوٹی سی مگر تنی ہوئی گردن، ننھی سی گندمی چونچ، گول گول خوب گہری سیاہ آنکھوں میں شوخیوں و شرارتوں کی چمک بھری تھی، جب وہ گردن اٹھا کر اپنی گہری سیاہ گول آنکھ سے کسی چڑے کو ذرا ترچھی نظر سے دیکھتی تو بیچارے چڑے کے دل کا کام ہی تو ہو جاتا۔ اور وہ دور ہی سے پر پھیلا کر چوں چوں کر کے اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتا مگر چڑیا کے قریب جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ چڑیا کا اپنا معیار انتخاب

کبھی آس پاس ہی موجود ہوتا۔

ایک دن چڑیا اور چڑا دونوں اپنا گھر بنانے کی فکر میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکلے۔ انہیں کوٹھی کا ایک کمرہ جو قریب قریب مکمل ہو گیا تھا پسند آ گیا۔ ایک طرف کارنس پر انہوں نے ایک محفوظ جگہ کا انتخاب کر لیا اور اپنے نشیمن کی بنیاد رکھ دی۔ اب وہ دونوں اس کمرے کے مکین تھے۔ راتوں کو بے خوف و خطر آرام و سکون سے سوتے اور دن عیش و عشرت میں گزرتا۔ ایک روز کمرے کی ایک الماری میں رکھی ایک عجیب، شفاف و چمکدار شیشے پر چڑیا کی نظر پڑی۔ وہ پھر سے اڑ کر الماری میں جا بیٹھی۔ اس نے اپنے مقابل اپنی ہی جیسی ایک چڑیا کو دیکھا چڑیا کو وہ دیکھ کر رقابت سے جل اٹھی۔ کیا وہ اسکے پیارے چڑے کو بہلانے، للچانے اور اس پر قبضہ کرنے آئی ہے؟ اس نے غصے و طیش میں آ کر مقابل کی چڑیا کے دو تین ٹھونگیں رسید بھی کیں مگر یہ کیا؟ کھٹ کھٹ کی آواز اور بس! بالکل ایسا ہی عمل اس دوسری چڑیا نے بھی کیا تھا۔ وہ حیرت زدہ سی دیکھنے لگی۔ یہ کیا بات ہے، دوسری چڑیا بھی حیرت زدہ تھی! پھر اس نے چونچ سے اپنے بازو کے پروں کو کریدا۔ دوسری چڑیا نے بھی یہی عمل کیا۔ "حرامزادی مجھے چڑاتی ہے" اور عمل کر دو تین زور دار ضربیں دوسری چڑیا کے لگائیں۔ کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ کیا طلسم ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ وہ پھر سے اڑ کر کارنس پر جا بیٹھی۔ اس نے دوسری چڑیا کو بھی اڑتے دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ اس کے ساتھ کارنس پر آ کر نہیں بیٹھی تھی۔ کیوں؟ وہ شاید ڈر کر بھاگ گئی؟ مگر جیسے ہی وہ پھر الماری میں گئی دوسری چڑیا بھی سامنے موجود تھی۔ بڑا ہی عجیب معاملہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر پھر سے اڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چڑا کارنس پر بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی چڑیا کے پیچھے اڑ گیا۔ اب چڑیا کا الماری میں بار بار آئینے کے سامنے جا کر شرارتیں و شوخیاں کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ایک کھیل تھا وہ....

گھر کی بستی مکمل تھی تو کھانے وغیرہ کا انتظام بھی گھر ہی میں ہونے لگا۔ ایک روز جو دونوں اناج کی تلاش میں باہر نکلے چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے چارپائی پر گیہوں پھیلے ہوئے تھے چڑیا تو ادھر ادھر پھدکنے لگی اور چڑا چارپائی پر جا بیٹھا اور گیہوں چگنے لگا۔ اتفاقاً چڑیا کو ایک سرخ رنگ کا چمکدار موتی ہاتھ آ گیا۔ وہ موتی کو چونچ میں دبا کر سیدھی کمرے میں آ کر الماری میں جا بیٹھی، پھر اس نے موتی کو ناک میں پہن کر ہر ہر زاویئے سے اپنے کو دیکھا اور مسرت و خوشی سے کھل اٹھی، وہ بہت ہی حسین نظر آنے لگی تھی۔

چڑے نے دو تین چکر لگا کر گیہوں کے دانے جمع کئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اسے اپنی چڑیا ایک نئی ادا، ایک نئے انداز و آرائش سے طاق میں بیٹھی نظر آئی، ناک میں پہنے موتی کی سرخ شعاعوں کے عکس نے چڑیا کے حسن کو اور تابانی بخش دی تھی۔ چڑے کے دل میں اس کی محبت کا جذبہ اور زیادہ چمک اٹھا تھا۔ چڑے نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔ مگر چڑیا نے کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ نو لفٹ۔ وہ ویسی ہی گردن ٹیڑھی کئے تنی بیٹھی رہی۔ چڑا اس بانکی ادا پر ہنستا ہوا اڑ کر پھر سے دانوں کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنی چوں چوں کی زبان میں چڑیا کو آواز دی ...... چڑی بی بی آؤ دانے بنا لیں۔

چڑیا نے بڑی حقارت سے منہ بنا کر اپنی موسیقی ریز چوں چوں میں نفرت سے جواب دیا "ہونہہ ناک میں موتی، طاق میں بیٹھی میں تیرے لئے دانے بناؤں۔ ہونہہ......"

ارے! چڑے نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا! اپنی چڑیا سے اسے بے حد محبت تھی۔ اس کی شوخی پر اسے ہنسی آ گئی۔ اس نے

خاموشی سے خود ہی دانے پھٹکے اور بین بنا کر پھر چڑیا سے کہا۔ ....

چڑی بی بی، چڑی بی بی آؤ دانے پیسیں......

..... اسے پھر وہی تلخ جواب ملا۔

"واہ رے واہ: ناک میں موتی، طاق میں بیٹھی میں تیرے لئے دانے پیسوں! ..... اللہ رے محبت کی ستم ظریفی چڑا برداشت کر گیا۔ اس نے اکیلے ہی چکی چلا کر دانے پیسے پھر آٹا چھان کر گوندھنے کے لئے کونڈی میں رکھا، پانی لے کر آیا اور اس یقین کے ساتھ کہ چڑیا آٹا گوندھنے تو ضرور آئے گی، یہ تو خاص اسی کا کام ہے، بڑی لگاوٹ اور محبت سے کہا:

چڑی بی بی، چڑی بی بی آؤ آٹا گوندھو...... مگر ادھر سے وہی دل شکن جواب تھا۔

"کیا خوب، ناک میں موتی، طاق میں بیٹھی، میں تیرے لئے آٹا گوندھوں!۔

چڑیا کے اس تحقیرانہ انداز اور عدم تعاون سے چڑے میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی، وہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ ایک چونچ کی بھی تو نہیں ہے، مگر دل سے مجبور ہوگیا۔ خاموشی سے آٹا بھی گوندھ لیا، چولہے میں آگ جلائی، توا رکھا اور بڑی بے دلی سے اس توقع پر کہ شاید اس بار چڑیا تعاون کرے اس نے کہا..... چڑی بی بی! چڑی بی بی آؤ روٹی پکائیں۔

..... مگر چڑیا کا وہی دو ٹوک اور خشک جواب تھا۔

"اونہہ، ناک میں موتی، طاق میں بیٹھی، اب میں تیرے لئے روٹی پکاؤں۔ اور وہ پھر سے اڑ کر الماری میں آئینے کے سامنے گئی چند لمحے اپنے حسن جہاں سوز سے لطف اندوز ہونے کے بعد پھر آ کر طاق میں تن کر بیٹھ گئی۔

چڑا غصّے میں کانپنے لگا۔ وہ حیران تھا۔ آخر اس کی چڑیا کو یہ کیا ہوگیا۔ اتنی کیوں اترا گئی ہے اس سرخ موتی پر، کیا وہ اپنی گھر گرہستی کو تباہ و برباد کر دینا چاہتی ہے؟ اس کے دماغ میں یہ کیسا فتور اس سرخ موتی نے پیدا کر دیا ہے۔ کہیں وہ جادو کا موتی تو نہیں؟ یا کیا وہ مجھے چھوڑ کر کسی غیر کی ہو جانا چاہتی ہے۔ کیا وہ تعاون و محبت کی اپنی قومی خصوصیت سے منحرف ہو کر انسانوں کی خود غرضی، منافرت اور جنگ کی سرشت اپنانا چاہتی ہے؟ وہ سوچتا اور روٹی پکاتا رہا۔ جب روٹیاں تیار ہوگئیں تو حسبِ عادت اس نے دسترخوان بچھا کر اس پر روٹیاں رکھیں، رات کی بچی دال کا پیالہ لا کر رکھا اور غصّہ کے باوجود دل سے مجبور ہو کر، چڑیا کی نادانی کو نظر انداز کر کے، وہ پھر اس سے مخاطب ہوا، یہ سوچ کر کہ بیوقوف رات بھر بھوکی پڑی رہے گی۔

"چڑی بی بی: آؤ کھانا کھائیں"۔

چڑیا جو بیٹھی بیٹھی کن انکھیوں سے چڑے کی ہر ہر حرکت دیکھتی رہی تھی، نے نرم اور بڑی لگاوٹ آمیز گہری نظر سے چڑے کو دیکھا اور اپنی جادو بھری آواز میں ایک ادا سے گانے کے سے انداز میں بولی:

"اچھے سیاں، بھولے سیاں، میں کیا تجھ سے روٹھی تھی" اور طاق سے اڑ کر دسترخوان پر چڑے کے پہلو میں آبیٹھی۔

چڑا حیران رہ گیا۔ پھر بے ساختہ اس کے منہ سے گہرے طنز میں ڈوبا ایک قہقہہ پھوٹ پڑا۔ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ پھر اس نے محبت سے چڑیا کی گردن کو اپنی چونچ سے گدگدایا اور کہا:

"پیاری چڑیا تجھے تو کسی جمہوریہ خاورستان کی وزیر اعظم ہونا چاہیے تھا..... اور پھر قہقہے لگانے لگا۔

نئی کتابوں کا تعارف

مبصر
ڈاکٹر فریدہ کول

خواہشمندانِ تبصرہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں

نام کتاب : چلتے توے کی مسکراہٹ

فن کار : انور ندیم
ناشر : ہم لوگ پبلشرس، لکھنؤ۔ قیمت : ۳۰ روپے

انور ندیم کی اس تصنیف کو اگر ۲۲ رنگ برنگ دلچسپ سفرناموں کا مجموعہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد مشاعروں کے رپو تاژ کی بھی شکل ہے۔ اندازِ بیان کچھ ایسا انوکھا اور دلکش ہے جس سے اس کی حیثیت منفرد ہو جاتی ہے۔ چلتے توے کی مسکراہٹ میں شاعروں کے سفرنامے ہیں، لطیفوں کی صدا بندیاں ہیں۔ اخلاقی رویوں کے خاکے ہیں، اسٹیج کی جھلکیاں ہیں، اس میں شعر و حکمت کے جائزے ہیں، مختلف اردو سماجوں کی کہانیاں بھی ہیں، پس منظر کا ماحول ہے، قصبوں شہروں مہانگروں کی باتیں ہیں اور فکر و نظر کے دائرے ہیں۔

اور ان سارے خیالات کا اندازِ بیان نہ صرف انوکھا بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جانا ان کے یہاں ایک عام سی بات ہے۔ طنز بھی ہے، مزاح بھی ہے اور قہقہے بھی ہیں، شہروں اور قصبوں، شاعروں اور مشاعروں کا، اسٹیج اور کارکنوں کا تعارف بڑے ہی دلچسپ پیرائے سے کرائی ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ یہ رپورتاژ کے ساتھ ساتھ سفرنامہ بھی ہے، جہاں سفر کی تلخیاں بھی ہیں اور تجربے بھی، تو دوسری طرف مداحوں کی بھیڑ اور خوش گپیاں بھی ہیں۔ انور ندیم کے اندازِ بیان میں خاص بات یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے خوب صورت ٹیلیگرافک سے جملے استعمال کرتے ہیں جو معنویت اور ادبیت سے بھرپور ہوتے ہیں، مثلاً گیارہ گھنٹے تک چل رہے ایک مشاعرے کی رپورٹ چند سطور میں کس خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو :

"شاعروں کے تین مختلف اسٹیجوں پر
بن سنور کر بیٹھے سگریٹ پینے، پان
کھانے، چائے مانگنے، داد و طلب
کرنے پردے کے پیچھے ادھر ادھر بھٹکنے
مصلحت کی شہ پر کسی کو داد دینے
کسی کی کامیابی میں کیڑے ڈالنے، کسی
کی ناکامی پر فقرے کسنے، منھ لٹکانے،
آنکھ میچنے، ڈکاریں لینے اور جمائیاں
لینے، گالیاں بکنے اور خصوصی مہمانوں
کی بغل میں کھسکنے میں گذر گئے گیارہ گھنٹے"

ان گیارہ گھنٹوں کی داستان کو چند سطور میں قید کرنا انور ندیم کے ہی بس کی بات ہے۔

انور ندیم کے اندازِ بیان میں اردو ہندی کا

سنگم ایک نئی تحریک کی نشاندہی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا ایک شعر ؂

ہم نے یہ محسوس کیا کہ کوئی مجھ سے کہتا ہے
شبدوں میں ارتھوں کو جوڑو ارتھوں کا وستار کرو

اس کتاب کا "پیش لفظ" اختر بستوی نے ایک خط کے ذریعے کرایا ہے۔ لکھتے ہیں :

"شریمان انور ندیم جی ! جے بجرنگ ولی کی !!"

اور خط کے آخر میں انور ندیم نے ایک اشارہ تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے :

"یہ شریمان کی آواز" یہ "بجرنگ بلی" کا نعرہ "یہ بھگوان" کی صدا "یہ نمستے" کا انداز ——— میں صرف یہ عرض کردوں کہ میری بیوی کا نام ہے منجو سنگھ (اپنی ماں کی طرف سے آریہ سماجی سکھ ار جاٹ) جو لوگ یہی سمجھ کے خوش رہنا چاہتے ہیں کہ انور نے قشقہ کھینچ لیا، ندیم دیر میں بیٹھ رہا، آفریدی نے اسلام ترک کر دیا، میں انھیں یقین بھی دلاؤں تو کیسے کہ انور ندیم نہ کل مسلمان تھا، نہ آج ہندو ہے !

یہ ہیں انور ندیم : عملی زندگی اور تخلیقات دونوں ہی میں وسیع النظری اور انسان دوستی کے جذبات منعکس ہیں۔ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل "جلتے توے کی مسکراہٹ" کو ہم لوگ پبلشرس نے بڑے ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔ کور پیج نہایت دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ انور ندیم کے طرزِ تحریر کا تیکھا پن قاری کو یہ یقین دلاتا ہے کہ ان کی اور بھی تخلیق منظرِ عام پر آسکے گی۔

نام کتاب : صد چاک (شعری مجموعہ)

مصنف : دواکر راہی

صفحات ۱۲۸ ، قیمت ۲۰ روپے

ناشر : بزمِ ادب ، رام پور

دواکر راہی ایک عرصے سے شاعری کر رہے ہیں۔ ان کے اشعار اور لہجے کی شگفتگی یہ بتاتی ہے کہ وہ ایک وسیع النظر شاعر ہیں۔ شاعر اپنی شاعری کا پہلا قاری ہوتا ہے۔ جب کبھی شاعر بہکتا ہے، لڑکھڑاتا ہے اور جب کبھی اس کی شاعری میں بے ربطگی پیدا ہوتی ہے تو اسے اندر کا قاری سہارا دیتا ہے۔ راستہ بتاتا ہے، اس کی زندگی اور اس کی شاعری کے مقصد سے اُسے آگاہ کرتا ہے۔ شاعری جتنی مقصدی ہوگی اتنی ہی پائے کی ہوگی۔ دواکر راہی کے اندر کا قاری کافی مخلص، انسان دوست، باشعور اور باعلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دواکر راہی کی شاعری میں انسان دوستی کے جذبات پنہاں ہیں۔ وہ معشوق کے غم میں آنسو نہیں بہاتے۔ اور نہ ہی ان کی شاعری جذبات کے رو کی شاعری ہے۔ دواکر راہی کے ایک اچھے شاعر ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ ساری

خوبیاں بدرجۂ اتم ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔

کہتے ہیں زمانے کے کرب سے سب سے زیادہ شاعر متاثر ہوتا ہے۔ شاعر کی نگاہ سماج اور اپنے اردگرد کی دنیا پر بڑی سخت ہوتی ہے۔ شاعر کا دل حساس ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی حادثے کا اثر جلد قبول کرتا ہے۔ اور اس کا اظہار اس کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔

دوا کر راہی نے زندگی کی سچائیوں کو مواد اور اسلوب کے ذریعے تخلیقی روپ اتنی خوبصورتی اور موثر ڈھنگ سے دیا ہے کہ بس اشعار پڑھتے چلے جایئے۔ ان کے اشعار برجستہ بھی ہوتے ہیں اور دل کو چھونے والے بھی۔ کلام میں نہ جھول ہے نہ پیچیدگی۔ ملاحظہ ہوں اُن کے چند اشعار ؎

دستِ گلچیں کا شغل جاری ہے
آج اس کی کل اس کی باری ہے

اندھیروں سے مجھے ضد ہے، یہاں تک
جلا ڈالا ہے اپنا آشیاں تک

چار دن کے واسطے کیا چاہیئے
یہ سمجھنے کو زمانہ چاہیئے

میں لامذہب نہیں شیخ و برہمن
مرا مذہب مری انسانیت ہے

انکا ہی عکس ہے مرے جام میں جتنا ہیں
سیراب کر رہی ہے مری تشنگی مجھے

[illegible]

خود شناسی خدا شناسی ہے

رہنماؤں سے کیا ملا۔ ہا
راستے کی چلت پھرت کے سوا

اس چھوٹی بحر کے شعر میں "چلت پھرت" کی ترکیب بڑی خوبصورت ہے۔ ان کے اشعار میں بے ساختگی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

زندگی میں بڑا ضروری ہے
یہ سمجھنا کہ کیا ضروری ہے

سوچتا ہوں کہ کوئی دیوانہ
سوچتا ہے تو سوچتا کیا ہے

دوستوں سے بچایئے راہی
دشمنوں سے میں خود نمٹ لونگا

دوا کر راہی کا پُرخلوص شاعرانہ انداز بڑا دلکش ہے جو اُن کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

باہمی بغض و تعصب کو مٹانے کیلئے
کسی شاعر کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں

آفسیٹ پہ چھپی ہوئی ان کی یہ کتاب بڑی خوبصورت، دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ لیکن ساتھ ہی مہنگی بھی ہے۔ عام قاری اس سے مستفید نہیں ہو سکیگا۔ کتاب کے گرد پوش پر رئیس امروہوی کراچی (پاکستان) کے خوبصورت پیرائے میں کچھ تعارفی الفاظ درج ہیں۔ ○○

عطریات

عطر فردوس۔ عطر محبوبہ۔ عطر شبنم
عطر سہاگ۔ مشک عنبر۔ دربار
اور گلشن وغیرہ

عرق کیوڑہ ۵۵۵ نمبر
عرق گلاب ۵۵۵ نمبر اور
میٹھا عطر استعمال کیجیے

دماغی قوت کے لیے

روغن مقوی خاص

ایچ۔ ایم۔ ادریس، ایچ۔ ایم زکریا

نزد سندریہ مسجد، ۱۱۰۔ رابندر سرانی۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

پائیوریا، خون و پیپ کا آنا، ہلتے ہوئے دانتوں کو جمانے اور دانتوں کے جملہ امراض میں اکسیر ہے۔

ایک حیرت انگیز پیشکش
چوٹ، موچ، درد، زخم، کٹے جلے، ورم ... کی مالش میں کام آنے والا ...

قارئین کے خطوط

شہرِ خیال

عزیز محترم جمیل منظر صاحب

کل دسمبر ۱۹۸۷ء اور جنوری ۱۹۸۸ء کا سہیل ملا، شکریہ جنوری کے سہیل میں مس کائنات رشید کا مضمون "جمیل مظہری کی شاعری" بغور پڑھا۔ جمیل مظہری پر سہیل نے جو دو ضخیم نمبر شائع کیے ہیں۔ میں نے بھی جمیل صاحب پر دو مضامین لکھے ایک ان کی مثنوی "آب و سراب" پر دوسرا ان کی شاعری اور شخصیت پر۔ اول الذکر مضمون "سریر" میں چھپا اور موخر الذکر "کائنات" کے جمیل مظہری نمبر میں۔ "کائنات" ہدایت گراہ لوپل سے نکلتا تھا۔ جو بہت پہلے بند ہو گیا۔ میں نے علامہ موصوف کے اس پہلو پر واضح انداز میں لکھا ہے جس کی طرف مس کائنات رشید نے اشارہ کیا ہے علامہ جمیل مظہری سے میں ۱۹۵۱ء اپنے بھیا احسان صاحب کے توسط سے ملا اور ان کی آخری سانس تک ان سے بے حد قریب رہا۔ میرے بھیا احسان صاحب علامہ مرحوم کے سب سے زیادہ چہیتے شاگرد ہیں۔ علامہ کی ذہنی ساخت سے میں بھی کچھ کچھ واقف ہوں۔ مذہب اور خدا اور مذاہب کے بارے میں ان کا تصور وہی تھا جو نیاز فتحپوری یا ان جیسے لوگوں کا تھا۔ تشکیک کا پہلو جمیل مظہری کی شاعری میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا ذاتی معاملہ ہے جس کو لے کر بحث چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مذہب پرائیویٹ چیز ہے۔ ویسے مس کائنات رشید کا مضمون اچھا ہے اور پسند آیا۔ سہیل کا اداریہ "محمود" بڑے چاؤ سے پڑھتا ہوں شعیب راہی کا مضمون ابھی پڑھا نہیں ہے۔ ویسے وہ میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔

اویس احمد دوراں، دربھنگہ

محبی جمیل صاحب! سلام خلوص

میرا مضمون آپ نے شامل شمارہ کیا، شکریہ، طباعتی خامیاں رہ گئی ہیں، جس کا افسوس ہوا۔

جس عظیم شخصیت کی شاعری پر تبصرہ تھا ان کے سلسلے میں حرفے چند پیش ہے۔ آپ کا وطن مالوف پورنیہ کا ایک گمنام گاؤں رام پور ہے۔ آپ کے والد ماجد کو فارسی تعلیم دلانے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ لوگوں کے مشورے کے بعد عظیم فارسی داں مولانا معین الدین دربھنگوی کے پاس بھیج دیا گیا۔ ۱۳۴۲ھ میں مدرسہ حنفیہ آرا میں داخل درس ہوئے تھے۔ جہاں متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی پھر اس کے بعد سید محمد کی ہمراہی میں ۱۳۴۹ھ میں عظیم ایشیائی جامعہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی زندگی گذارنے کے لئے تشریف لائے۔ وہاں سے فضیلت کی سند حاصل کی اور شعر و ادب کا خاصا ذوق، جس کی بنا پر شعری نشست میں اپنے کلام سے نوازتے اور رسائل و جرائد میں اسے بھیجتے رہتے تھے۔ تخلص قرتاب تھا جو ان کی ذہانت پر دلیل ہے۔ ایک مرتبہ تعلیم کے بعد از مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ان سے قرتاب کا معنی دریافت کیا۔ تو انہوں نے کرامت جو کہ

دی آسانی کے معنی بتلائے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ یہ لفظ غریب معلوم ہوتا ہے کوئی شعر سند میں پیش کرو۔ تو فوراً مرزا اسد اللہ غالب کے یہ دو شعر پیش کئے۔

بہ نیرد سرکشاں را پنجہ بر تاب
بدانش صاحب آثار فرتاب
بنمائے گوسالہ پرستاں ید بیضا
غالب سخن صاحب فرتاب کجائی

مولانا کی شخصیت اور فن کے سلسلے میں زیادہ تحریر کرنے کا وقت نہیں ہے میری خواہش ہے کہ نقادان سخن ان کے کلام کو پڑھ کر اپنی آراء سے نوازیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ علامہ اقبال نے ان کی تخلیقات کو پڑھ کر سراہا تھا۔ نہ جانے کس حد تک صحیح ہے۔ اور یہ بھی کہ مخزن میں ان کی شخصیت کے متعلق کوئی مقالہ موجود ہے۔ جو ابھی تک میری نظر سے تو نہیں گذرا۔ اگر کسی صاحب کی نظر سے گذرا ہو تو وہ ان کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں۔

عبدالحق حقانی القاسمی علی گڈھ

محترمی و مکرمی! سلام مسنون

وافی الخیر مع الخیر۔ رسالہ پابندی سے مل رہا ہے۔ اس عنایات، خلوص و محبت کے بدرجہ غایت ممنون و مشکور ہوں۔ دسمبر ۷۸ء اور جنوری ۷۹ء کا الگ الگ شمارہ کا تمام شمولات معیاری ہیں۔

علامہ جمیل مظہری اور مس کائنات صاحبہ کا مقالہ بھرپور اور جاندار ہے۔ غزلوں میں گلشن صاحب روشن بنارسی کی غزل اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ اسی طرح رابطہ قائم رکھیں گے تاکہ "سہیل" سے تعلق بنا رہے۔

گوہر شیخپوروی، بنارس

برادرم جمیل صاحب! سلام مسنون
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

سہیل کے دسمبر اور جنوری کے دونوں شمارے ایک ساتھ ملے شکریہ! "عبدالمغنی کا تنقیدی نظام"، ایک اچھا مطالعہ ہے۔ مانک ٹالہ نے اوپندر ناتھ اشک پر مضمون لکھ کر بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے ایسے اشک صاحب ہمیشہ صاف گو رہے ہیں۔

دسمبر کے شمارہ میں کچھ آزاد نظمیں شائع ہوئی ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ان کے بارے میں توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ان میں کوئی تاثر نہیں ہے جو آزاد نظم کے لئے بیحد ضروری ہے۔ صرف اسی سے آزاد نظم ادب کا حصہ ہو سکتی ہے۔ ورنہ لکھنے والے کی ذہنی بکواس کے سوا کچھ نہیں۔

جناب جگن ناتھ آزاد کی غزل اچھی ہے۔ سیدہ شان معراج کی ایک غزل کا آخری شعر پسند آیا ؎

یادوں کا دشت برف کے خیموں میں چھپ گیا
روشن کہیں کہیں ہیں چناروں کے سلسلے

اس شمارہ میں کچھ غزلیں ہیں جن کی جگہ آپ اچھی غزل شائع کر سکتے تھے مثلاً ناوک جاوید کی غزل صرف تک بندی ہے۔ افسوس ہے ایسی چیزوں کو بھی آپ سہیل جیسے معیاری رسالہ میں جگہ دیتے ہیں۔ دسمبر کے شمارہ میں صرف ایک کہانی ہے جس سے رسالہ کے توازن میں فرق آجاتا ہے۔

قارئین کے خطوط کے لئے "شہر خیال" خوبصورت عنوان ہے لیکن اس کے نیچے قارئین کے خطوط لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ خطوں سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ قارئین کے خطوط ہیں!

دونوں شماروں کے افسانے بے حد کمزور اور مایوس کن ہیں۔ آج کا افسانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ مواد اور اسلوب میں کافی فرق آگیا ہے اپنے ماحول کی صحیح عکاسی اعلیٰ ادب کی خاص[یت] ہو سکتی ہے۔ اردو میں اچھے افسانے لکھے جانے لگے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دو سالوں میں اچھے افسانے نہیں آ رہے ہیں۔؟

نسیم بن آسی۔ مغل سرائے


ہسند تیل ...... اور
روغن سرخ اصلی بنانیوالوں کی طرف سے
برادران اسلام کو
عید مبارک
تیل
روغن سرخ اصلی


دل پسند ○ سُبک ○ تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار اور ارزاں
Baba
cushion
AND
Air India
cushion

Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, Riverside Road, Gaya - 823 001
48 years of Publication Phone : 21573

ماہنامہ

June 1987 Rs. 2.

بانی: حافظ محمد عبدالرحمٰن لسبیل سنہاروی   بیادگار: زین العابدین احمد داورلس سنہاروی

ماہنامہ سہیل

فون نمبر ۲۱۵۸۳

جون ۱۹۸۷ء

چیف ایڈیٹر	مسعود منظر	مجلس مشاورت		شمارہ ع۶	جلد ۴۹
ایڈیٹر	جمیل منظر	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی		بدل اشتراک فی شمارہ	۲/۵۰
معاونین	شکیل احمد جمالی	ڈاکٹر طلعت قمر رئیس		زر سالانہ	۳۰ روپے
	عبدالقیوم ابدالی	اصغر علی انجینیر، ڈاکٹر برج پریمی		لائف ممبری	۵۵۱ روپے

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ گیا

نمود

آہ! خواجہ احمد عباسؔ

خواجہ احمد عباس کا نام بیسویں صدی کے ان کہانی کاروں اور دانشوروں میں عزت اور پیار کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ عباس صاحب مانتے تھے کہ ملک کو جدید بنانے کے لیے صرف آزادی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ تمام طرح کی قدروں کی تعمیر کرنے والی عوام کو باعزت بنانا اور انسان کی انسانیت کو جگانا، اور مضبوط کرنا ضروری ہے۔

بلٹز میں انہوں نے "آزاد قلم" کے عنوان سے جو مستقل کالم لکھا اس میں ان کی رائے اپنے ملک اور اپنی عوام کے سائنسی، سیکولر اور جمہوری قدروں کو مضبوط کرنے کی لڑائی کو ہی نڈر آواز دیتے رہے۔ ان کالموں کے ذریعہ انہوں نے آزاد، نڈر اور جمہوری صحافت کی مثال قائم کیا ہے جو آج کے صحافیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ انہوں نے کبھی سنسنی خیز صحافت نہیں کی۔ انہوں نے کئی ناول اردو اور انگریزی میں لکھے تقریباً ۱۰ سال قبل شائع شدہ ان کا اہم ناول "انقلاب" اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ ان کے شائع شدہ ناول "ایک دل چار راہیں" "سات ہندوستانی" وغیرہ بھی کافی مشہور ہوئی ہیں۔ انگریزی میں ان کا ناول "ماریا" اور "میرا نام جوکر" بھی بہت مشہور ہوا۔ انہوں نے ڈھیر ساری کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کے قلم نے ادب میں ایک نئے سماج کی تعمیر کا کام کیا ہے۔ جو لوگ انہیں صرف فلموں کے ذریعہ جانتے ہیں انہیں اس سے زیادہ اہم رُخ پر غور کرنا چاہئے۔

یوں تو فلمی دنیا کو بھی عباس صاحب نے جس گہرائی سے متاثر کیا ہے وہ بھی فلمی تاریخ میں صدیوں یاد کیا جائیگا۔ قومی آزادی اور عوام کی جمہوریت کے لئے چلنے والی تحریک سے عوامی بیداری کو انہوں نے فلموں تک پہونچایا۔ شہر اور سپنا، سنسار، میرا نام جوکر، آوارہ، نکسلائیٹ، جیسی فلمیں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

عباس صاحب! ادب اور آرٹ میں ترقی پسند تحریک شروع کرنے والوں یعنی سجاد ظہیر ملک راج آنند جیسے شروعاتی دور کے مجاہدوں میں تھے۔ ان کے نہیں رہ جانے سے اس دور کا ایک اور مجاہد اور سپاہی ہم سے جدا ہو گیا۔ ان کی غیر موجودگی ہمیشہ کھلتی رہیگی۔ انہیں ہمارا انقلابی سلام!

جمیل منظر سنہادوی

اقبالیات میں شکیل الرحمن صاحب کا مقام و مرتبہ

(پیش لفظ)

ڈاکٹر شکیل الرحمن صاحب نے اردو اور فارسی ادبیات پر جو اعتقادی تصانیف نیز مضامین سپرد قلم کئے ہیں اور وہ مقالے جو معیاری سیمیناروں میں پیش کئے ہیں ہنوز ان کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اردو تنقید کی یہ روگردانی بڑی یاسفانہ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ اور ایک لحاظ سے حیرت انگیز نہیں بھی ہے، کیونکہ حیرت انگیز نہیں ہے؟ حیرت انگیز نہ ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ رحمٰن صاحب کی ذات ستودہ صفات خود استشہاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ نہایت کم سخن انسان ہیں اور بے زبانی "جریان اللسانی" میں مبتلا ہونے کا، مزید برآں انہوں نے ادبیات پر کام ادبیاتی اعتقادی اقدار کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ ایسی متوازن و مستقیم طرز فکر دلوں کا تحفظ، پیش افراد۔ نیز مضرات قلبی کو کیونکر جگہ دے سکتی ہے۔

غالباً بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حسب و نسب کے اعتبار سے ان کا سلسلہ سابق صدر جمہوریہ ہند راجندر پرساد سے جا ملتا ہے۔ یہی نسل پہلے سری واستو خاندان کے جو شکیل صاحب کے جد امجد تھے مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر موصوف اسی خاندان عالی کے چشم و چراغ ہیں۔ متعدد صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس خاندان سے تعلق رکھنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں ہیں بلکہ رشتہ جذبات میں ایک دوسرے میں امتیاز نہیں برتتے ملحوظ رہے اس امر پر میری شکیل الرحمن صاحب سے کبھی گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ ایک سری واستو صاحب نے مجھے یہ بتایا تھا اور انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ سابق صدر راجندر پرشاد شکیل الرحمن کو اپنے خاندان ہی کا فرد سمجھتے تھے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر موصوف پی ایچ ڈی بھی ہیں اور ڈی لٹ بھی ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔

تنقید عالیہ کو جو مقام و مرتبہ دیا جانا چاہئے اس پر ہنوز روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اقبالیات جو بذات خود ایک مخصوص تعلیم (DISCIPLINE) کی شکل میں اختیار کر چکا ہے۔ اس پر کچھ لکھنا نہایت مشکل بھی ہے اور بہت آسان بھی۔ آسان اس لئے ہے کہ معیار مرتبہ علامہ علامہ، حکیم ملت، حکیم الامت، وغیرہ کہہ کر جادو جگایا جا سکتا ہے۔

اور قارئین وسامعین جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ اور اس طرح یا در مضمون نگار کو "ماہر اقبالیات" سمجھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ذات گرامی نے اقبال کے یہاں خودی و غیر خودی کے تصادم کو سے متعلق صحیح کھینچ کھانچ کر اسلام اور غیر اسلام کا تصادم بتانا شروع کر دیا۔ ظلمت پسندوں (OBSCURANTIST) پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ظلمت پسندوں کا ذکر آیا ہے تو ایک بات جو نہایت اہم ہے مگر جس پر ہنوز کسی کی توجہ نہیں گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان ظلمت پسند کبھی کبھی ایک بات پر متفق نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً اقبال کے آبا و اجداد کشمیری برہمن تھے مسلمان اس پر اس لئے ایمان لے آتے ہیں کیونکہ ایک اونچی (؟) ذات سے اقبال کا تعلق تھا۔ ہندو ظلمت پسند یہ کہتے ہیں کہ اقبال کے آبا و اجداد کو بعد میں مسلمان بنایا گیا ہوگا۔ وحید صاحب محقق نے یہ ثابت کر دیا ہے اور اعجاز احمد (اقبال کے بڑے بھائی کے صاحبزادے) بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ لوگ برہمن نسل سے متعلق نہیں ہیں بلکہ میر مغل ہیں۔ اعجاز احمد نے اپنی تصنیف "مظلوم اقبال" میں یہاں تک بتایا ہے کہ ہمارا خاندان ہمیشہ احمدیہ عقائد کا پیرو رہا ہے۔ اقبال بھی تھے۔ اور اسی لئے انہوں نے اپنے بڑے لڑکے آفتاب اقبال کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے قادیان بھیجا تھا۔ اعجاز صاحب اپنے موقف میں باوجود کامیاب نظر آتے ہیں۔ مگر اس مضمون میں اس پر مزید کچھ کہنے کا جواز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ مضمون اقبالیات کے اس پہلو سے مخاطب نہیں ہے۔ بات سے بات پیدا ہو گئی اور یہ جملہ معترضہ در آیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شکیل الرحمٰن صاحب کی تنقید میں جذباتیت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

انہوں نے اقبالیات پر گہری نظر ڈالی ہے میری نظر میں تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ متن کو ہم متن سے آشنا کرے جیسا کہ میں نے ایک انگریزی ادب سے متعلق سمینار میں کہا تھا۔

CRITICISM CONSISTS IN PROVIDING CONTEXT TO THE TEXT

ہم متن (CONTEXT) کے تحت سب کچھ آجاتا ہے کیونکہ تنقید متعدد تناظیم پر مشتمل عمل کو کہتے ہیں۔ جمالیات، سماجیات، ثقافیات، بشریات، نفسیات، تاریخ وغیرہ جیسے علوم سے اعلیٰ دماغ متصف ہوتا ہے اور کسی ادبی پارے کے معنی میں انسانی دلچسپی کا بہت دخل ہوتا ہے۔

کلینتھ بروکس (CLEANTH BROOKS) نے اپنے ایک حالیہ مضمون LITE- RATURE IN TECHNOLOGICAL AGE - تکنولاجی دور میں ادبیات جو WINSON QUARTERELY میں شائع ہوا تھا WISDOM IS MEDIATED THROUGH LITERATURE دانشمندی ادبیات کے توسط سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد دانشمندی کی تشریح کرتے ہوئے فاضل نقاد نے بہت کچھ کہا ہے۔ جو میں نے اصطلاح (CONTEXT) ہم متن کے تحت لے لیا ہے۔

مزید براں میں اقبال کی شاعری کو ایک فعل (VERB) سمجھتا ہوں اسم (NOUN) نہیں۔ فعل اس لئے کہ اس کا عمل دوامیت کا حامل ہوتا ہے بڑی شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ہر طرح سے مخاطب رہتی ہے جس کو میں

نے انگریزی ادبیات سے متعلق ایک مضمون میں اس طرح لکھا ہے۔

GREAT POETRY EVER REMAINS CONTEMPORARY

آمدن بر سر مطلب، شکیل الرحمٰن صاحب نے اقبال پر بڑی ژرف نگاہی سے توجہ صرف کی ہے اور اس وقت میرے سامنے ان درج ذیل تصانیف و مضامین ہیں۔

(۱) اقبال، روشنی کی جمالیات (۱۹۷۷ء)
(۲) زبور عجم کی ایک غزل
(۳) اقبال اور تصوف
(۴) اقبال اور فنون لطیفہ (۱۹۷۸ء)
(۵) اقبال، خطیبانہ شاعری کی جمالیات
(۶) جبرئیل و ابلیس (ایک نظم)
(۷) مصرع من قطرہ خون من است کی ایک مثال
(۸) والدہ مرحومہ کے نام، تجزیاتی مطالعہ
(۹) اقبال اور مذہبی حسیت
(۱۰) اقبال حلقۂ افسوں و تسخیر کا پیکر
(۱۱) اقبال کی جمالیات میں علامتوں اور استعاروں کا عمل۔

اور بھی بہت سی تصانیف و مضامین ہیں۔ جن کو میں جمع کر رہا ہوں یہ مضمون محض تمہیدی ہے ایک مضمون میں رحمٰن صاحب کے کام پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ ان کے کام کو متعدد مضامین میں ہی پیش کیا جائے گا۔ جو غالباً تعداد میں پانچ چھ ہوں گے۔ قارئین کرام جب تک انتظار کریں۔

آپسی میل، ایکتا اور خلوص قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات اور مذہب سے اوپر اٹھکر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقے کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا۔ یہ سبھی فرقوں زبانوں، مذہبوں اور کلچر کا ملک ہے۔ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ شاعر رویندر، اور قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے گاؤں گھر میں گائے جاتے ہیں، مختلفتا میں ایکتا ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی بنی روایت ہے یہ ہماری مریادا ہے آئیے ہم سب مل کر اس روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار کے ذریعہ جاری

सू० ज० स० नि-84-स (सू-47)/1987-88

از: ع۔ ض۔ ابراہیمی (ریسرچ اسکالر)
۳/۲-۷۶۲-۸ روڈ نمبر ۱۳
بنجارا ہلز، حیدرآباد، ۳۴

منبع علم و عرفان قرآن و حدیث
سلسلۂ شیخیہ کے عالم، علامہ شیخ احمد احسائی رح

عالم ربانی حکیم حمدانی حضرت شیخ احمد احسائی مرحوم بزرگ ترین علمائے شیعہ اثنا عشری میں شمار کئے جاتے ہیں۔
آپ کی ولادت ماہ رجب سنہ ۱۱۶۶ھ میں بمقام قریہ مطیرفی ہوئی جو قصبۂ احساء بلاد عرب کا ایک حصہ ہے۔ آپ کے پدر بزرگوار زین الدین بن ابراہیم بن صقر بن داغر تھے یہ سب حضرات مذہب امامیہ کے پابند تھے۔ ایام طفولیت ہی سے آثار علم و جلالت آپ کی کیفیات سے ظاہر تھے۔ چنانچہ پانچ چھ برس کی عمر میں آپ نے قرآن کریم کی تلاوت با قرأت مکمل کر لی تھی۔ خود شیخ بزرگوار نے اپنے زمانہ طفلی کی کیفیات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بچپن میں اپنے ہم سن لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اگرچہ کہ جسمانی طور پر میں ان کے ساتھ ہوتا مگر ہر قابل فکر مسئلہ پر میری توجہ مرکوز ہو جاتی۔ اکثر جنگل میں قدیم و ویران عمارتوں کو دیکھتا اور یہ سوچنے لگتا کہ کیا ہوئے ان عمارتوں میں بسنے والے اور ان عمارتوں کے بنانے والے کدھر گئے پھر جب ان لوگوں کے حالات کا اندازہ ہوتا تو میری آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز شیخ محمد بن شیخ محسن کی تلمیذی سے ہوا۔ اس کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ خود اپنے بیان کے مطابق شیخ مرحوم تحصیل علم کے دور میں ان پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری رہتی۔ اسی دور میں آپ نے چند عجیب خواب دیکھے اور عالم رویا میں زیارت ائمہ اطہار علیہم السلام سے مشرف ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ اسی سلسلے کے علاوہ مختلف علوم تحصیل فرما رہے تھے۔ بیس برس کے سن میں شیخ بزرگوار مقامات مقدسہ کی زیارات سے مشرف ہوئے۔ اور اس دوران کربلائے معلی و نجف اشرف میں آقا محمد باقر بہبہانی رحمۃ اللہ علیہ اور آقائی سید مہدی طباطبائی بحر العلوم نور اللہ مرقدہ کی محافل درس میں حاضر رہے۔ حسب روایت آپ آقائی مہدی بحر العلوم سے اجازۂ روایت کے خواہشمند ہوئے اور اپنی تصانیف کے نمونے کے طور پر اپنا وہ رسالہ بحر العلوم کو خدمت میں پیش کیا جو آپ نے علامہ حلی کی ایک مسئلہ کی شرح میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد بحر العلوم نے فرمایا کہ آپ کی مرتبت علمی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں آپ سے اجازت لوں۔ پہلے اجازہ دینے سے پہلو تہی کر دی لیکن بالآخر شیخ کے اصرار پر اجازہ تحریر فرما دیا۔ شیخ مرحوم کی زندگی کے مطالعے سے پتا

واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہم عصر علماء و کاملین نے انہیں ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی تعظیم و تکریم کی چنانچہ ان کی حکایات کا ذکر کرتے ہوئے آقائی حاج ابوالقاسم خاں کرمانی نے کتاب فہرست کتب مشائخ عظام میں تحریر کیا ہے کہ آقا حاجی کلباسی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جید عالم بزرگ بھی جب اصفہان میں شیخ مرحوم کی آمد کی اطلاع سن لیتے تو اپنا حوزۂ درس کو تعطیل دے کر شیخ کی محفل درس میں حاضر ہو جاتے اور انہیں کی اقتدا میں نماز بھی ادا فرماتے ۔

ترک وطن کے ایک طویل عرصے بعد شیخ بزرگوار نے ایک بار پھر وطن کو مراجعت فرمائی اور یہیں ازدواج فرمایا۔ کچھ دنوں بعد سفر اختیار کیا اور مختصر مدت کے بعد بحرین، بصرہ اور پھر ذروق نامی قریہ میں قیام کیا۔ ۱۲۱۶ھ میں کربلائے معلی میں قتل و غارت گری کے واقعے کے بعد بصرہ لوٹے۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد انتقال مکانی فرمایا۔ اور مختلف قریوں میں تنویہ، نشوہ، صفادہ، شط الکار اور سمادہ نامی مقامات میں قیام پذیر رہے۔ ان کے اس پیہم سفر اور غیر مستقل سکونت کے انداز سے ان کا یہ قول ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہجوم اور بھیڑ بھاڑ سے کنارہ کش رہنا چاہتے تھے۔ ۱۲۲۰ھ میں آپ دوبارہ زیارات سے مشرف ہوئے۔ اور واپسی میں یزد کے راستے سے مشہد مقدس خراسان کے لئے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں اہل یزد سے کئے ہوئے وعدے کی بناء پر مشہد مقدس سے یزد واپس ہوئے۔ اور کچھ عرصہ یہاں قیام فرمایا۔ اسی طرح فتح علی شاہ والی تہران کے اصرار پر تہران میں اور کرمانشاہ کے حاکم کی دعوت پر ۱۲۳۴ھ میں کرمانشاہ میں بھی قیام فرمایا۔ ۱۲۴۱ قمری میں مشہد مقدس اور اصفہان کے سفر کے بعد جب کرمانشاہ سے بعزم حج سفر کرتے ہوئے مدینہ سے دو منزل ہدیہ نامی قریہ میں آپ نے اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی قبر جنت البقیع میں چار ائمہ اطہار کے مزارات مقدس سے قریب ہی واقع ہے۔ آپ کی اولاد ۹ فرزندوں اور ۱۱ دختروں پر مشتمل ہے ۔

اپنی حیات میں آپ نے فقہ، اصول اور حکمت الٰہی کے موضوعات پر جملہ ایک سو بتیس ۱۳۲ کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض طبع بھی ہو چکی ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتابیں شرح زیارت جامعہ کبیرہ، شرح فوائد، شرح عرشیہ اور شرح مشاعر ہیں ۔

شیخ بزرگوار کے اعلیٰ مراتب علمی اور ان کے زہد و تقویٰ کی تصدیق ان کے زمانۂ حیات میں اور ان کے بعد بھی دوست اور دشمن سبھی کرتے ہیں سوائے چند ایک لوگوں کے جو اپنی کم علمی، حسد و دشمنی اور بعض اوقات اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی بناء پر ان کے بعض نظریات کو قبول نہ کرتے تھے۔ لیکن مرحوم آقائی سید مہدی بحر العلوم اور سید بزرگوار سید علی طباطبائی جیسے جید علماء نے ان کی قدر کی اور انہیں اجازۂ روایت عطا کیا اور شیخ محمد حسن مرحوم صاحب "جواہر الکلام" جیسے بزرگ عالم نے ان سے اجازہ حاصل کیا۔ مرحوم آقائی سید کاظم رشتی اعلی اللہ مقامہ نے اپنی تصنیف "دلیل المتحیرین" میں شیخ مرحوم کی حاصل شدہ اجازت کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے اہم ترین اجازات آقائی سید مہدی بحر العلوم، سید سید میرزا مہدی شہرستانی، آقائی شیخ جعفر اعلی اللہ مقامہ اور سید بزرگ آقائی سید علی طباطبائی نور اللہ مرقدہٗ ہیں۔

ان بزرگوں کے عقائد بعض حضرات کے عقل و فہم کے بالکل برعکس ہرگز و قطعی کچھ نہیں ہیں، نہ وہ کسی تازہ فرقے یا مذہب کے

موحد و موسس ہیں۔ بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے آثار اور ان کی تصانیف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا اعتقاد یہی تھا کہ حقیقی صحیح اور واقعی علم وہ ہے جو قرآن، احادیث اور اخبار محمدؐ اور آل محمدؐ سے حاصل کیا جائے۔ اور تمام عمر ان کی سعی و کوشش بس یہی رہی کہ تمام مسائل و مطالب کی اسناد کتاب خدا اور احادیث اہل بیت علیہم السلام سے ہی لی جائیں حتی کہ انکی استعمال کردہ اصطلاحات و لغات بھی قرآن و احادیث سے ماخذ کردہ ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تمام مسائل میں قرآن اور آثار اہل بیتؑ سے رجوع کرنا لازم ہے۔ اس اساس پر تو انہیں مکتب آل محمدؐ علیہم السلام کا احیا، کنندہ تسلیم کرنا چاہئے۔ نہ کہ کسی نئے فرقے کا موجد۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہارون الرشید بعد مامون الرشید کے دور میں یونانی فلسفے کی کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ان کی بناء پر علمائے یونان کے استدلالات کی اساس پر علم الکلام کی توسیع ہوئی۔ اس طرح فلسفۂ یونانی اسلام میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ اسلامی عقاید کا استدلال یونانی فلسفوں سے کیا جانے لگا۔ جو ایک غلط راہ تھی۔ شیخ بزرگوار نے اس غلطی کی اصلاح اور فلسفۂ یونانی کے ابطال کا بیڑا اٹھایا۔ اور فلسفۂ آل محمدؐ علیہم السلام کے ذریعے اس کا ابطال کیا۔ اسی بناء پر جہاں ان کے ہم عصر علمائے عظام نے ان کی تائید کی اور ان کی خدمات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا وہیں کچھ مطلب پرست اور کوتاہ نظر لوگ ان کے مخالف ہو گئے کیونکہ ایسے لوگوں کو اپنی ریاست علمی کے ہاتھ سے چلے جانے کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال پروردگار عالم کی تائید و نصرت سے ایسے لوگوں کے اکراہ کے باوجود ان بزرگوار کے علم و کمال کی اعتراف کی آوازیں اطراف جہان سے بلند ہونے لگیں۔ شیخ مرحوم کا مسلک تو مسلک آل محمدؐ علیہم السلام ہی تھا اور حکمت الٰہی اور فلسفہ کے بارے میں جو کچھ انھوں کہا وہ قرآن اور احادیث اہل بیتؑ ہی سے ماخوذ ہے۔ مثلاً روح اور جسم کی توصیف کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی بناء پر معاد جسمانی کا اعتقاد راسخ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ جسد عنصری کی بازگشت کے معتقد نہیں تھے۔ بلکہ فرماتے تھے کہ انسان کا جسم حقیقی جو حامل روح انسانی ہوتا ہے اسے ہی محشور کیا جائے اسی قول کی بناء پر بعض لوگوں نے اس پر غور و فکر کئے بغیر ان کی مخالفت شروع کر دی۔ حالاں کہ ان کا یہ قول قرآن و احادیث سے ہی ماخوذ ہے۔ وہ وحدت وجود پر اعتقاد کو بھی توحید واقعی کے منافی سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ ملا صدرا، سہروردی، ملا محسن وغیرہ کی مخالفت فرماتے تھے کیونکہ یہ دونوں حضرات وحدت وجود یا وحدت موجود کے قائل تھے۔

مرحوم شیخ بزرگوار کے فلسفہ کی تشریح و توضیح جو حقیقت میں فلسفۂ قرآنی اور فلسفۂ آل محمدؐ علیہم السّلام ہی ہے انکے بعد انکے ممتاز شاگردوں اور انکے سلسلے کے علمائے فرمائی۔ جیسے آقائی سید کاظم رشتی اعلی اللہ مقامہ اور انکے بعد کے علماء جو شیخ احمد احسائیؒ مرحوم کی پیروی کی بناء پر علمائے شیخیہ کہلاتے ہیں اس مکتب کے علماء نے تا حال ایک ہزار سے زائد کتابیں مختلف دینی و علمی موضوعات پر تصنیف کی ہیں ان کا خصوصی موضوع حکمت الٰہیہ بھی ہے جو لوگ ان علماء کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان سے متعارف ہونے کے خواہشمند ہیں وہ ان طبع شدہ کتابوں کو مدرسہ ابراہیمیہ کرمان ایران سے خط و کتابت کر کے منگوا سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نام شیخیہ سے مراد مذہب امامیہ اثنا عشریہ سے ہٹ کر کوئی نئے نہیں اور یہ نام انہیں محض اس لئے دیا گیا ہے کہ بعض مسائل میں وہ امتیازی نظریات رکھتے ہیں جس طرح مذہب امامیہ میں "اصولی" اور "اخباری" کی اصطلاحیں رائج ہیں۔ اسی طرح شیخی بھی ایک اصطلاح ہے اور بس۔ ورنہ حقیقت میں یہ سب ایک ہی مسلک اور آپس میں برادران ایمانی ہیں۔ ——— والسّلام

اپنے بچوں کا پرائمری اور مڈل اسکولوں میں داخلہ کرائیں

اور ان کی تعلیم کا راستہ متعین کریں

ہمارے قومی ڈھانچہ میں سب کے لئے تعلیم، ہماری فطری، طبعی اور روحانی ترقی کی کلیدی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی تکمیل کی بنیاد ہمارے بچے ہیں جنہیں تہذیب، علم اور قوم کے تئیں آراستہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ مستقبل میں آج کے ہی بچے ہمارے آئین میں وقار، سماج واد، سیکولرزم اور جمہوریت کے مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

ان کی تعلیم کے لئے اپنے بچوں کا داخلہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں کرائیے اور اپنے پڑوسی کو بھی اپنے اپنے بچوں کا داخلہ کرانے کے لئے رغبت دلائیں۔

پرائمری ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ آپ کے بچوں کو سنہرے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے نیز ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

(۱) ہریجن اور آدی باسی طلبا کے لئے ہماری سہولتیں دستیاب ہیں۔ مفت پوشاک۔

(۲) سب کے لئے کتابوں کی فراہمی۔

(۳) سبھی پرائمری اسکولوں کو تلقین کر کے بچوں کیلئے بہتر تعلیمی مواقع مہیا کرنا۔

(۴) آپ کے بچے کو مناسب پیار اور ماں کا پریم دیا جا سکے، اس کے لئے ہر ایک اسکول میں ایک لیڈی ٹیچر کی تقرری۔

(۵) اسکول کو زیادہ سے زیادہ موثر اور پرکشش بنانے کے لئے عمارت اور جدید آلات سے مزین کرنا۔

آیئے... دیر نہ کیجئے.....

(۶) **آج ہی اپنے بچہ کا داخلہ کرانے کا فیصلہ لیجئے... کیونکہ تعلیم حال اور مستقبل کی تعمیر کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔**

جاری کردہ: محکمہ تعلیم، بہار، پٹنہ

सू०ज०सं० नि०-62-स (शि-32) 87-88

مناظر عاشق ہرگانوی

پسِ دیوار

تو ہوا کا قافلہ
تیرے لئے
اب دستِ بے ساحل میں
اک ذرہ نہیں
ساعت نہیں
منزل نہیں !
کاغذ نہیں
پنسل نہیں !
عینک نہیں !
جانے کیسے راستے تھے
جس جگہ پہونچا نہیں تھا
کہ منزل دور پیچھے رہ گئی
اور تجھ آسماں کی آنکھ
جس سے آگ کا چشمہ اُبل کر
ایک ہی جانب رواں !
آسماں !
گردش کا محور گھومتی گولائیاں
ایک دیوارِ شکستہ اور تو !!

○

نقشِ ناتمام

چاندنی رات میں پیڑ لو
پیڑوں کے بیچ
دھڑ سے الگ
ایک چہرہ دیکھتا ہوں
اور جگہ جگہ خون کے دھبے !
مے آئی آسک یو ؟
مسٹر ....
مے آئی آسک یو ؟
مگر کون سنتا ہے ؟
راستے میں یا اسٹیشن پر
نہ مسٹر ہے
نہ آدمی ہے !
میں ہوں
اور دھڑ سے الگ ایک چہرہ ہے
گدھ کی خوراک !

○

فردوس گیاوی

قتل

میں تو ہر روز قتل ہوتا ہوں
زندگی قتل گاہ ہے
جس میں
وقت جلاد بن کے رہتا ہے
روز بڑھتا ہے ایک خونی ہاتھ
میری گردن دبوچ لیتا ہے
اور جب قتل ہونے لگتا ہوں
وہ مسرت سے جھوم جاتا ہے
وہ جو اپنا ہے
اور جس کے لئے
زندگی کی ہے آرزو مجھکو
جانے کیا بات ہے کہ وہ ہر روز
قتل پر میرے گنگناتا ہے !!

○

کرشن لال کو اپنی بیٹی کا بے حد خیال ہے...
تبھی تو انھوں نے لڑکے والوں کو
دو سال ٹھہرنے کے لئے تیار کرلیا!



کرشن لال کے سبھی دوست اقارب حیران ہیں کہ آخر انھوں نے اپنی بیٹی کی شادی دو سال تک کے لئے کیوں ملتوی کردی؟ لیکن کرشن لال کا یہ قدم اپنی لاڈلی بیٹی کی بھلائی میں ہی ہے۔ ان کی بیٹی ابھی صرف ۱۵ سال کی ہے اور وہ شادی اور ماں بننے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لائق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کرشن لال بیٹی کو پڑھنے لکھنے اور بڑھنے کا پورا موقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک سمجھ دار [illegible] کا ثبوت دیا کرشن لال نے۔ وہ جانتے ہیں کہ لڑکی کی شادی اٹھارہ سال اور لڑکے کی شادی اکیس سال سے قبل کرنا ان پر بہت بڑا بوجھ ڈالنا ہے۔ بچوں کو سمجھ دار اور بالغ ہونے دیں تاکہ وہ ایک صحت مند اور خوشحال مستقبل کے مالک بن سکیں۔

ڈاکٹر کی صلاح مانئے!

1. ماہرین کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشوونما ۱۸ برس کی عمر تک ہوتی رہتی ہے۔ وہ ۱۵-۱۶ سال میں جوان [illegible] دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور [illegible] ۱۸ برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اگر لڑکی ۱۸ برس سے کم عمر میں ماں بنے تو مشکلات پیش آتی ہیں:
   - لڑکی کے بدن کی نشوونما رک جاتی ہے۔
2. ۱۸ برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔
3. ایسی کمزور، کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے۔
4. کیونکہ ۱۸ برس کی کم عمر میں رحم اور [illegible] جیسے بچہ جننے کے کچھ اعضا کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی، اس لئے حمل اکثر گر جاتا ہے۔ ماں بننے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں۔
5. پیڑو کی نشوونما ۱۸ سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے بچے کا سر پھنس سکتا ہے۔ بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضا کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے مثانے یا انتڑی میں کمزوری آجاتی ہے۔
6. کم عمر میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ بیماری عورتوں میں کینسر کی بڑی وجہ ہے۔

یاد رکھئے: بچی کے بچہ ہونا اُس پر بھاری ظلم ہے

اٹھارہ برس سے پہلے لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے

مزید معلومات اور بلاقیمت کتابچے کے لئے اس پتے پر لکھئے: پوسٹ بکس نمبر 5420 ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

غزلیں

حسیب سوز

یرا اک اک خواب خدا
کھنا تو شاداب خدا
رے اسم کی برکت سے
شت ہوئے سیراب خدا
یرہ بختی دیر سے ہے
مکا دے مہتاب خدا
ند فلک سے بھیج کوئی
وکھ گیا تالاب خدا
یک ہدایت دے انکو
طن میں احباب خدا

حمید خان حمید

دل میں جب بس گئے تم ذہن پر کیا چھا گئے
پھول سے چہرے بھی مجھکو دیکھ کر شرما گئے
رت سے بھی زندگی کیواسطے ٹکرا گئے
زندگی جب سامنے آئی تو پھر گھبرا گئے
جب کبھی ان کے سائے ذہن پہ لہرا گئے
تب مری آنکھوں کے آگے دن سہانے آ گئے
اس طرح بارش کا موسم تو کبھی دیکھا نہ تھا
کتنے ہی معصوم غنچے بھی یہاں مرجھا گئے
تم تو دعویٰ کرتے تھے کس شان سے لیکن حمید
موت کو جب سامنے پایا تو کیوں تھرا گئے

راشد صدیقی

کم ظرف تھا وہ ایک بھی قطرہ نہ دے سکا
پیاسا کئی دنوں سے میں دریا کے پاس تھا
امن والوں کے شہر کا عالم عجیب تھا
کوئی تھا مضمحل تو کوئی بدحواس تھا
شاید بہت اداس تھا میں بزم شوق میں
جو شخص بھی شریک تھا وہ محوِ یاس تھا
وہ لمحہ آج بھی ہے نگاہوں کے سامنے
میں گھر سے جب چلا تھا مرا گھر اداس تھا
آخر وہ بت پگھل ہی گیا موم کی طرح
راشد مجھے تو اس کا ہمیشہ قیاس تھا

شہناز کانپوری

بن ہے نہ ویرانہ گلشن ہے نہ صحرا ہے
لتے ہیں نفس جس کو مجبوریوں کی دنیا ہے
دورِ خرد آخر کس موڑ پہ لایا ہے
نوں میں رہ کر بھی ہر آدمی تنہا ہے
ہونٹ پہ جینے کی باتیں ہیں بہت لیکن
نفس کے کاندھوں پہ اپنا ہی جنازہ ہے
اس دورِ ترقی میں اللہ رے مجبوری
انسان سے ملنے کو انسان ترستا ہے
دل کا نہ پوچھ اٹھا غم سے آنکھ بھی ترس گیا
تنہا نہ کو جب ہم نے نزدیک سے دیکھا ہے

صفدر امام قادری

کہ میں تو ٹوٹ چکا مجھ میں حوصلہ بھی نہیں
شکست و فتح کے بارے میں سوچا بھی نہیں
زمیں کی کوکھ میں سہمی ہوئی صدائیں ہیں
فضا کے ہاتھ میں پتھر کوئی آئینہ بھی نہیں
خزاں کی ساری اذیت ہی جانفزا ہو گئی
یہ شخص وہ ہے کہ ہمزاد دوسرا بھی نہیں
وہ میں لوٹ کے پھر تیرے پاس آ نہ سکا
عذابِ ہجر کے موسم کو بھولتا بھی نہیں
تمہاری قربتِ اوّل کا دلنشیں موسم
بھر تی موج تھے کہ سوچتا ہم رہیں

ایم۔ اے۔ شمسی

حلقۂ احباب میں رفعت نظر آتی نہیں
دوستی میں اس لئے الفت نظر آتی نہیں
اس قدر ہے دل گرفتہ زندگانی دوستو
مہ رخوں میں بھی کوئی لذت نظر آتی نہیں
ہر بشر اک خول میں لپٹا ہوا ہے آجکل
اب کسی انسان کی صورت نظر آتی نہیں
کربلا کی یاد ذہنوں سے کھرچ دیجئے سبھی
شہر میں اب خون کی قلت نظر آتی نہیں
توڑ دو وہ آئینہ شمسی اٹھا کر پھینک دو
جس میں تم کو اپنی ہی صورت نظر آتی نہیں

نعمان شوق

...ئے گی اور کہاں تک یہ گرد ہونٹوں پر
...ہر نچوڑ لوں موسم کا زرد ہونٹوں پر
...ہت محال ہے جھیلوں عذابِ خاموشی
...ٹ چکا ہے زمانے کا درد ہونٹوں پر
...ن میں تیرتے شعلوں کو تیز ہونے دو
...ہیں نہ برف ہی جم جائے سرد ہونٹوں پر
...سو ایک بات ہی پہ شہر جل کے راکھ ہوا
...ئے تھا آگ کی لپٹیں وہ فرد ہونٹوں پر
... انتظار میں کب سے تھا اس کی رُت کے
...ئے گی فصل ہری لاکھ زرد ہونٹوں پر

شمیم یوسفی

...ئی نقاب رخ زندگی ہٹا دیتا
...دیکھنا ہے بہ یک چشم وہ دکھا دیتا
...اپنے جسم کے صحرا سے کیوں نکل آیا
...ہی تو ابر برس کر اسے بہا دیتا
...شب سیاہ کے اس خوفناک اندھیرے میں
...را جو تیز نہ ہوتی دیا جلا دیتا
...ہی نہ دی مجھے فرصت ہی میرے زخموں نے
...مدانے ہر گھڑی سے اک انقلاب لا دیتا
...و دشمنی کے فرائض سے بھی نہیں آگاہ
...آرزو تھی کہ مرنے کی بد دعا دیتا

نعیم شاہی

خزاں کی مار سے سہما ہوا چمن دیکھا
فسادیوں کو جلاتے ہوئے چمن دیکھا
لپکتے شعلے، برستے ہوئے لہو دیکھے
ستم کی آگ میں جلتا ہوا چمن دیکھا
ستم ستم کے فقط چند روٹیوں کے لئے
ہوس کے ہاتھ میں بکتا ہوا بدن دیکھا
تری گلی سے [illegible] گزر ہوا میرا
نہ آنکھ بھر کے ابھی تک ترا بدن دیکھا
قدم قدم پہ تھی چھائی فساد کی دہشت
ہر ایک چوک پہ لاشوں کو بے کفن دیکھا

نور جمالی

مفلسی کی دھوپ میں بے رنگ چہرے ہو گئے
بھیگ کر موسم کے ہاتھوں زرد پتے ہو گئے
شہر میں جو لوگ پہنے تھے شرافت کا لباس
آئینہ خانہ میں جب پہونچے تو ننگے ہو گئے
دفعتاً پھر آج حرفِ حق زباں پر آ گیا
دوستو کی انجمن میں ہم اکیلے رہ گئے
رات کی ظلمت میں گم تھیں صبح کی رعنائیاں
روشنی پھیلی تو بام و در سنہرے ہو گئے
نور بہکاتے کسے یہ چند شیطانِ لعیں
آدمی دورِ ترقی میں فرشتے ہو گئے

اشفاق عادل

بے خواب نگاہوں میں اتر جائیگا موسم
اندر شفق زار بکھر جائے گا موسم
ٹھہرے گا نہ اک پل بھی کسی موڑ پہ ایسے
چپ چاپ دبے پاؤں گزر جائے گا موسم
پھیلی ہوئی ہر سمت ہیں زہریلی ہوائیں
گھبرا کے نشیبوں میں اتر جائے گا موسم
احساسِ غمِ زیست سے چہرہ ہے منور
بے نام اداسی سے نکھر جائے گا موسم
ضدی ہے نہ مانے گا مری بات وہ عادل
تپتے ہوئے صحرا میں ٹھہر جائیگا موسم

سید ظفر حسین ظفر

میرا ذوقِ طلب تھا جو کہ لے آیا ہے منزل تک
وفا کے راستے میں یوں تو خطرے بے شمار آئے
کٹے کس طرح سے یہ زندگی اب انکی یادوں میں
ستم کی دھوپ ڈھل جائے تو شامِ انتظار آئے
جو فرصت ہو کبھی آ جائے غم خانۂ دل میں
اسی صورت دلِ بیمار کو شاید قرار آئے
شب وعدہ گزارا کس طرح مت پوچھئے ہم سے
کبھی آہٹ نے دستک دی کبھی انکو پکار آئے
ظفر اس طرح سے ہم نے گزاریں ہجر کی راتیں
کٹھن راہیں مسافر جس طرح ہنس کر گزار آئے

میں نے ابھی تو صرف دسویں کا امتحان پاس کیا ہے
میں ٹیچر (معلمہ) بننا چاہتی ہوں، آگے پڑھنا چاہتی ہوں
لیکن والد صاحب جلد ہی میرا رشتہ کر دینا چاہتے ہیں
کیا کوئی انھیں سمجھا نہیں سکتا کہ میں ابھی چھوٹی ہوں ؟



شاید دیپا خود بھی نہیں جانتی کہ وہ کیوں منع کر رہی ہے۔ مگر اس کے دل میں زندگی کی بلندی کی طرف گامزن کرنے کے خواب امنڈ رہے ہیں جنہیں وہ سچ کر دکھانا چاہتی ہے۔

دیپا کے والدین یقیناً اس کی بھلائی کے خواہاں ہیں، لیکن انھیں یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ دیپا ابھی [illegible] ہے۔ 15 سال کی عمر میں [illegible] ہونے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی اور اس کی صحت پر اس کا بہت غلط اثر پڑے گا۔

دھیان رکھئے: آپ کی جلد بازی سے بچے جسمانی و دماغی پریشانیوں کا شکار ہو جائیں۔ یہ سچ ہے کہ دیپا آپ کی بچی ہے، مگر اس کے فیصلے آپ مت کیجئے بلکہ فیصلہ کرنے میں مدد دیجئے۔ اسے اپنے فیصلے خود کرنے دیجئے۔

ڈاکٹر کی صلاح مانئے !

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشو و نما 18 برس کی عمر تک ہوتی رہتی ہے۔ وہ 15-16 سال میں جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور پیڑو وغیرہ کی نشو و نما 18 برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اگر لڑکی 18 برس سے کم عمر میں ماں بنے تو مشکلات پیش آتی ہیں۔

- لڑکی کے بدن کی نشو و نما رک جاتی ہے۔
- 18 برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔
- ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے۔
- کیونکہ 18 برس کی کم عمر میں رحم اور پیڑو وغیرہ جیسے بچہ جننے کے اعضاء کی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی، اس لئے حمل اکثر گر جاتا ہے۔ ماں بننے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں۔
- پیڑو کی نشو و نما 18 سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے بچے کا سر بڑا ہو سکتا ہے۔ بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضاء کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے مثانے یا انتڑی میں کمزوری آ جاتی ہے۔
- کم عمر میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ بھارتی عورتوں میں کینسر کی بڑی وجہ ہے۔

یاد رکھئے: بچی کے بچہ ہونا اس پر بھاری ظلم ہے

اٹھارہ برس سے پہلے لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے

مزید معلومات اور [illegible] کے لئے اس پتے پر لکھئے: پوسٹ بکس نمبر 3420، نئی دہلی 110011

عرفان عارف
۱۱۶۲/۱۱ الصفا روڈ، اسلام پورہ، مالیگاؤں (مہاراشٹر)

"بھوت کون"

ارشاد علی جہاں رہتا تھا وہاں اس سے کچھ لوگ حسد کرتے تھے۔ اس کے جانے کے بعد انہیں افسوس ہوا۔ اور اس کی کمی کا احساس بھی ہونے لگا کیونکہ وہ اسے مذاق کا نشانہ بناتے تھے ایک روز ان لوگوں نے واپس لانے کے لئے سوچا۔

وہ اس کے پاس گئے، ایک نے اس سے کہا

"ہم نہیں چاہتے ہیں کہ آپ ہم سے دور رہیں۔ آپ کے چلے جانے کے بعد اس طرف بہت بہت اجڑا اجڑا سا لگتا ہے"

بدر نے کہا

"آپ برسوں سے ہمیں جانتے ہیں کیا ہم اس قابل بھی نہیں کہ آپ ہمارے درمیان زندگی گذاریں۔"

فخرالدین نے کہا

"ہم سچ کہتے ہیں کہ آپ کو ہم کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیں گے"

ارشاد علی نے ان کی باتوں کو غور سے سنا۔ پہلے تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

"یہ آپ لوگوں کی عزت افزائی ہے۔ قدر دانی ہے تاہم میں نہیں سمجھتا کہ میرے نہ رہنے سے آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

ان میں سے ایک نے سہم کر کہا۔

"ہم سچ کہتے ہیں کہ جب سے آپ گئے ہیں ہم نے اکثر اس طرف بھوتوں کو دیکھا ہے۔"

"بھوتوں کو؟" ارشاد علی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بھوتوں کو یقین جانئے ہم بڑی مشکل میں پھنسے ہیں آپ ہی ہمیں اس مشکل سے نجات دلا سکتے ہیں۔"

"آپ لوگ کیسی باتیں کرتے ہیں، بھلا میرے جانے سے آپ لوگوں کی مشکل کیسے حل ہوگی؟"

جمشید نے کہا۔

"دراصل بات یہ ہے ارشاد علی کہ آپ کی نیکیاں بہت ہیں اور جہاں آپ جیسے لوگ رہتے ہیں وہاں سے بھوت بھاگ جاتے ہیں۔"

ارشاد علی سوچنے لگا کہ ان کی باتوں کو سچ سمجھے کہ نہیں اگر یہ لوگ سچ کہتے ہیں تو واقعی یہ مشکل میں ہیں۔ پھر یہ بھی سوچنے لگا کہ اس کے جانے سے ان لوگوں کی مشکل کیسے حل ہوگی اس نے جواب دیا۔

"آپ لوگوں کی خوشی کے لئے میں وہاں رہنے کے لئے تیار ہوں۔"

ارشاد علی دوبارہ اس کی پرانی رہائش گاہ پر پہنچا وہاں اسے کوئی بھی ایسی بات نظر نہیں آئی جیسا کہ اس طرف کے لوگوں نے اس سے ذکر کیا تھا۔ اس نے جمشید کی

سے پوچھا ۔

"آپ لوگ تو کہتے تھے کہ اس طرف بھوت نظر آتے ہیں مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آیا ۔"

جمشید جی نے جواب دیا ۔

"آپ جب سے آئے ہیں یقین جانئے اب کچھ نظر نہیں آیا۔"

کچھ عرصہ ارشاد علی کو برداشت کیا گیا اس کے بعد اس کی شرافت کو بھول کر اس کا تمسخر اڑایا جانے لگا۔

اس نے دوبارہ فلیٹ پر جانے کا ارادہ کیا ۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے ان لوگوں کی باتوں پر یقین کر کے غلطی کی تھی ۔ آخر ایک دن نئے مکان پر منتقل ہو گیا۔

جمشید جی، فخر الدین، قاسم بھائی، چاول والا اور دوسرے بہت سارے اس کے جانے کے بعد پریشان ہو گئے ایک روز ارشاد علی کا ذکر چلا تو انہیں بہت افسوس ہوا ۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس سے معذرت کر کے اسے دوبارہ واپس لانا چاہئے ۔ وہ دوبارہ اس کے فلیٹ پر گئے ۔

فخر الدین نے کہا ۔

"آپ کے چلے آنے کے بعد ہم لوگ بہت پریشان ہیں ہم سب کو بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کو پہچان نہ سکے ۔"

ارشاد علی نے جواب دیا ۔

"یہ آپ کیا کہتے ہیں ۔ آپ میرے بزرگ ہیں ، میں نے آپ لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے ۔"

"آپ ہمارے ساتھ چلئے اور اسی طرف رہئے ۔"

جمشید جی نے کہا ۔

"کیوں ؟" اس نے سوال کیا ۔

"آپ کے جانے کے بعد وہاں دوبارہ بھوت نظر آنے لگے ہیں ۔ ہم بھوتوں سے بہت خوفزدہ ہیں آپ اس طرف رہیں گے تو بھوت بھاگ جائیں گے ۔"

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے ۔ میں وہ نہیں ہوں جس کی وجہ سے بھوت بھاگ جاتے ہیں ۔ آپ لوگ مجھے معاف ہی رکھئے اور کسی ایسے آدمی کو تلاش کیجئے جو بھوتوں کو بھگا دیتا ہے مجھے تو خود ہی اس طرف خوف معلوم ہوتا ہے ۔ آپ کو ایک بات بتاؤں ؟"

"کیا ؟" چاول والے نے پوچھا ۔

"مجھے بھی اس طرف بھوت نظر آنے لگے ۔"

جمشید جی کو حیرت ہوئی یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔

"آئیں ! آپ کو بھی بھوت نظر آنے لگے تھے ؟"

جمشید جی نے حیرت سے پوچھا ۔

"اگر ایسی بات ہے تو آپ نے ہم سے کہا کیوں نہیں ؟"

دوسرے نے پوچھا ۔

"میں کیا کہتا ، میرے پہنچنے سے تو آپ کو بھوت ہی نظر نہیں آتے تھے ۔ لیکن مجھے تو نظر آتے تھے ۔"

سب خاموش ہو گئے کیا کرنا چاہئے ، اس آدمی کو کس طرح اپنے علاقے میں رہنے کے لئے تیار کرنا چاہئے ۔

فخر الدین نے کہا ۔

"تم رہنے کے لئے چلو ، جس روز تم کو بھوت نظر آئیگا تم زور سے چلانا اور ہم سب دوڑ پڑیں گے ۔"

"تم نے بھی تو اسے دیکھ کر چلایا ہوگا ؟"

"ہائے چلائے تو تھے اور جب بھوتوں کو پکڑنے کے لئے دوڑتے تھے تو وہ بھاگ جاتے تھے ۔" جمشید جی نے کہا ۔

"آپ ضرور ہمارے ساتھ رہئے ۔" چاول والے کی آواز بھرا گئی ۔

"میں وہاں جا کر کیا کروں گا ؟ آپ لوگوں کی خاطر ایک بار جا کر دیکھ چکا ہوں ۔"

"آپ ایک بار چلئے تو سہی ۔" (بقیہ صفحہ پر)

منی کہانیاں

ستیش راج پشکرنا
: قاسم خورشید

احتجاج

دھادیوی کے ہاتھ سے دودھ بھرا گلاس چھوٹ گیا اور تھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ تب ہی مادھادیوی لڑکراتی ـــــ" حرام زادی، کہیں اتنا گرم دودھ دیا جاتا ہے اور گلاس چکنا چور ہو جائے "

لیکن دودھ تو اتنا گرم نہیں تھا کہ گلاس .....

اپ ! ایک تو گلاس توڑ دیا اوپر سے زبان لڑاتی ری ہے کانچ کے ٹکڑوں کو اٹھا کر باہر پھینک دے سے صاف کر اس جگہ کو۔

رمیش نے اندر داخل ہوتے ہی بیوی کو لڑکراتی پر برستے سوچے سمجھے وہ بھی اچھل پڑا ـــــ" سالی کھڑی منہ کیا کانچ کے ٹکڑوں کو اٹھا کر پھینک باہر"

دونوں کی ڈانٹ سن کر بیچاری سکتے میں آ گئی تب ہی آنکھوں سے رواں ہونے لگے۔ بہت ہی بے بسی کے عالم فرش پر سے کانچ کے ٹکڑوں کو اٹھانا شروع کیا اسی بیچ کا کوئی ٹکڑا اس کی ہتھیلی میں دھنس کر چبھ گیا اور دیکھتے فرش پر خون کے دھبے نظر آنے لگے اس نے اسی حالت ٹکڑوں کو اٹھایا لیکن اسی دوران پھر مالک گرجنے لگا۔

کتنا ! کام یہاں کرتی ہے اور دھیان کہیں اور ہے صاف کیا تو سارا فرش گندا کر دیا۔ ایک کام بنا گئی تو دیگی۔ جاؤ بیٹا لہو صاف کرو۔ اور سن جلدی سے ایک کپ چائے بنا کر لا۔

چائے بناتے وقت وہ درد اور خوف سے کانپ ہی رہی تھی کہ حسب معمول مالکن گرجتی ہوئی باورچی خانے کی طرف آنے لگی۔ تب ہی اس نے نہ جانے کہاں سے خود میں ڈھیر ساری قوت بھر لی۔ اور جیوں ہی مالکن قریب آئیں اس نے شیشے کے کچھ گلاس کو فرش پر دے مارا۔ مالکن نے بچنے کی کوشش کی لیکن کرچیاں اس کے جسم سے لہو نکالنے میں کامیاب ہو گئیں۔

اس بار لڑکراتی بے بسی میں، اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلی۔

بوجھ

جمال الدین ساحل، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ

میری ماں میرے بارے میں اب بھی کچھ نہ کچھ ضرور سوچتی ہوگی۔ شاید یہی کہ اس نے کیسے لاڈلے کو جنم دیا ہے وہ دوسری عورت کی محبت کا شکار ہو گیا۔

میں سوچتا ہوں میری شادی سے پہلے ماں مجھے کتنا پیار کرتی تھی اور آج ! میں سپنوں میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ میری ماں مجھ سے اس طرح نفرت بھی کر سکتی ہے میں یہ سوچ کر بے حد افسردہ ہوں لیکن دوسرے لمحے یہ بھی سوچنے لگتا ہوں۔

میری ماں ضرور رحم کے قابل ہے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی زندگی میں کسی دوسرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آج بھی نہیں سمجھ پایا ہوں کہ مجرم کون ہے ؟..... میں یا میری ماں.. ...... کہ وہ انجان عورت۔ ●●

سیف الدین انصاف
E10/3 گودریج اسٹاف کوارٹر،
ہل سائڈ دکھرولی بمبئی۔

کل جو ملاح بھی پتوار بھی کشتی بھی تھا
آج ہر ایک سے کہتا ہے بچالو مجھ کو!

مفاد پرستوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والی

چھٹی عالمی داؤدی بوہرہ کانفرنس (اندور)

۶ سے ۸ فروری کو اندور میں اصلاح پسند بوہروں کی چھٹی عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح جمعیۃ العلماء ہند کے ممتاز رہنما اور عالم دین عالی جناب مولانا اسحاق سنبھلی کے دست مبارک سے ہوا۔ مولانا صاحب تینوں دن کانفرنس میں شریک رہے۔ آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ:

"میں دارالعلوم دیوبند کا فارغ التحصیل ہوں۔ اور حافظ قرآن ہوں۔ اور یہ بات دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بوہرہ مذہبی پیشوا سیدنا محمد برہان الدین غیر اسلامی اور غیر شرعی کام کر رہے ہیں۔ سیدنا جس شان و شوکت سے رہتے ہیں جس طرح کی شاہانہ فضول خرچیاں کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی پوری قوم کو غلام بنا کر جس طرح کے انسانیت سوز مظالم ڈھا رہے ہیں یہ سب کام اسلام کے خلاف ہیں۔ آپ نے قرآنی آیتوں کے حوالہ سے کہا کہ براءت یعنی سماجی بائیکاٹ کی وجہ سے آج بوہرہ فرقہ بدترین مظالم کا شکار ہے۔ اور ظلم کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

آپ نے کہا کہ میں بوہرہ اصلاح پسندوں کی تحریک اور ان کے لٹریچر کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے۔ اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بوہرہ اصلاح پسند اسلام کے سچے پیرو ہیں۔ اور ظلم و استحصال سے پاک حق و انصاف پر مبنی ایک سچا اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی جد و جہد میں لگے ہوتے ہیں۔ سیدنا صاحب کے مظالم سے اور جس طرح اسلامی تعلیمات کو وہ مسخ کر رہے ہیں اس سے بڑی تعداد میں آج بوہرہ برادری

[illegible]

وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر قرآن مجید کی اور اسلام کی جس روشن خیالی سے تفسیر کر رہے ہیں اس نے لاکھوں انسانوں کو اسلام کا گرویدہ بنایا ہے۔ آپ نے کہا کہ اصغر علی انجینیر اس کام کے لئے مبارک باد کے قابل ہیں "

مولانا اسحاق سنبھلی نے ہمیشہ اصلاح پسندوں کی حمایت کرنے اور ظلم کے خلاف ان کی اس جد و جہد میں ہر ممکن تعاون دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

مشہور صحافی و ادیب اور قلم کار خواجہ احمد عباس یہاں خصوصی تھے آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حق و انصاف اور سماجی اصلاح کی اس تحریک کی میں نے ہمیشہ حمایت کی ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ اور جو شخص انسانوں پر ظلم کرتا ہے۔ اور انسانی عظمت کو پائمال کرتا ہے وہ شخص مذہبی ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر وہ چاہے جیسا نقاب اپنے چہرے پر لگا لے۔

اس عالمی کانفرنس میں ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے بمبئی، ادے پور، اجین، سورت، بڑودہ بھاؤ نگر، حیدرآباد، اورنگ آباد، پونہ، ناسک اور اندور سے اور امریکہ، لندن، کویت اور پاکستان جیسے بیرون ممالک سے تقریباً ۷۰۰ مندوبین نے شرکت کی۔ یاد رہے کہ اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے سیدنا نے کروڑوں روپے خرچ کئے۔ اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ محرم کے دس دنوں میں وعظ کے بہانے سیدنا نے اندور کے سرکاری حکمرانوں، کرمچاریوں، پولس والوں اور اخباری نمائندوں میں پانی کی طرح روپیہ بہایا تھا۔ اور اپنی ۷۵ ویں سالگرہ کے نام پر ذاتی پبلسٹی کے اشتہارات اور ضمیموں پر کروڑوں روپے خرچ کئے تھے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود اصلاح پسندوں کو اندور کے عوام بوہروں اور مسلمانوں کا زبردست تعاون ملا۔ سیدنا صاحب بذات خود برہان پور تک آئے۔ بوہروں کو جمع کر کے اندور گھسنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر انہیں نہ بوہروں نے ساتھ دیا۔ اور نہ ہی وہ حکومت پر کانفرنس بند کروانے کا دباؤ ڈال سکے۔ سیدنا کے لئے یہ پہلی زبردست ہار ہے جس سے وہ بری طرح سے بوکھلائے ہوئے ہیں۔

کانفرنس میں چوٹی کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، اور سماجی اور سیاسی رہنماؤں نے حصہ لیا۔ پروفیسر قمر رئیس اجمل اجملی، حسن کمال، عزیز قیسی، حسن نعیم، سینیر جنتا پارٹی لیڈر اور سابق ایم پی کرشنا کانت، دہلی موہن نگم۔ مدھیہ پردیش کے سابق وزیر تعلیم اوم پرکاش راول، اور جسٹس وی ایم تار کنڈے کے علاوہ لوک دل کے لیڈر منظور احمد امروہہ کی سماجی لیڈر محترمہ شمیم بانو رضوی بیگم شرافت علی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر نعیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس عالمی کانفرنس میں اتفاق رائے یا کثرت رائے سے کل ۹ قراردادیں منظور کی گئیں۔ جن میں ۳ قراردادیں بہت اہم تھیں۔ ایک قرارداد فرقہ وارانہ فسادات اور فرقہ واریت پر منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ:

آج ہمارے ملک کی سیاست میں تیزی سے فرقہ واریت کا زہر پھیل رہا ہے اس لئے عوام کو در پیش

اہم مسائل مثلاً غریبی، بے روزگاری، مہنگائی اور رشوت خوری وغیرہ دب کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ پرسنل لاء اور بابری مسجد جیسے ثانوی مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔ اور یہاں جمہوریت اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک سیکولرزم پروان چڑھے سیکولرزم کا مطلب ہے سیاست کو مذہب سے الگ رکھا جائے۔ اور مذہب کا سیاسی استحصال نہ کیا جائے آج مذہب کا جس طرح سیاسی استحصال ہورہا ہے اس سے سیکولرزم ہی نہیں ملک کی سالمیت بھی خطرے میں پڑگئی ہے۔ اصلاح پسند بوہرے سیکولرزم اور جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔ اور ان کی اصلاحی تحریک کا ایک مشن ملک سے فرقہ واریت کو ختم کرنا بھی ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات، مذہب کے سیاسی استحصال سے رونما ہوتے ہیں۔ جس سے عوام اور خاص طور سے اقلیتوں کے جان و مال کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ یہ فسادات ہندوستان جیسے سیکولر ملک کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔ لہٰذا عالمی کانفرنس نے بار بار ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی کڑی مذمت کرتے ہوئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان کی روک تھام کے لئے موثر قدم اٹھائیں۔ اور عوام کے جان و مال کی حفاظت کریں۔ کانفرنس نے ساری جماعتوں سے تقاضہ کیا ہے کہ وہ جذباتی مسائل کو چھیڑ کر فرقہ واریت کو ہوا دینے کی بجائے عوام کو درپیش اصل مسائل کی طرف توجہ دیں۔ اور یہ فرقہ پرست اور احیاء پرست طاقتوں سے سیاسی مفاد کی خاطر گٹھ جوڑ کرنے سے باز آئیں۔ عالمی کانفرنس نے عوام سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ تمام مذاہب کے لئے مساوی احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ اور مفاد پرست سیاست والوں کے ہاتھوں شکار ہو کر جان و مال کا خطرہ مول نہ لیں"۔

سیدنا صاحب کی طرف سے کی جانے والی برأت (سماجی بائیکاٹ)، کی قرارداد میں کہا گیا ہے اصلاح پسند کانفرنس میں برأت کے خلاف قانون بنانے کا مطالبہ حکومت سے کرتے ہیں۔ وزیر اعظم اور دیگر سرکاری حکام سے بھی بار ہا اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ برأت غیر اسلامی حرکت ہے بلکہ اس سے ملک کے دستور میں دیئے گئے بنیادی حق چھین جاتے ہیں۔ اور انسانی عظمت کی پامالی ہوتی ہے۔ اب سماجی بائیکاٹ کی وبا مسلمانوں کے دیگر فرقوں اور دیگر قوموں میں بھی پھیل رہی ہے۔ پہلے وزیر داخلہ بوٹا سنگھ اور اب پنجاب کے وزیر اعلیٰ برنالا کا سکھ مذہبی قوت نے سیاست کی بنا پر سماجی بائیکاٹ کیا ہے۔ اس لئے سماجی بائیکاٹ کے خلاف قانون بنانا اشد ضروری ہو گیا ہے۔

آئندہ دو سالوں میں عملی کارروائیوں کا مندرجہ ذیل پروگرام طے پایا۔

(۱) یکم مارچ ۱۹۸۲ء کو ادے پور سے گلیاکوٹ تک مارچ کیا جائے گا۔ اور گلیاکوٹ میں یوم سیاہ منایا جائے گلیاکوٹ میں بوہرہ بزرگ سیدی فخر الدین شہید کا مزار ہے جہاں سنہ ۱۹۷۳ء یکم مارچ کو سیدنا محمد برہان الدین کی موجودگی میں بوہرہ خواتین پر خونیں حملہ کیا گیا تھا۔ اور ان پر شرمناک مظالم ڈھائے گئے تھے۔

(۲) ان تمام جگہوں پر جہاں اصلاح پسند آباد ہیں یکم مارچ کو یوم سیاہ منایا جائے۔

(۳) پارلیامنٹ کی بیٹھکوں کے دوران دہلی میں پارلیامنٹ کے سامنے دھرنا دیا جائے گا اور بہت (سماجی بائیکاٹ) کے خلاف قانون بنانے کا اصرار کیا جائے گا۔

(۴) اصلاح پسند بوہرہ خواتین جب وزیر اعظم شری راجیو گاندھی سے ملی تھیں تو انہوں نے چھ مہینے کے اندر سماجی بائیکاٹ کے خلاف قانون بنانے کا وعدہ کیا تھا اگر یہ وعدہ مقررہ وقت پر پورا نہیں ہوتا تو بوہرہ خواتین وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر دھرنا دیں گی۔

(۵) بوہرہ خواتین گھر گھر جا کر دیگر بوہرہ خواتین کو صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ کریں گی اور انہیں اصلاحی تحریک کا ہمدرد بنائیں گی۔

(۶) بوہرہ خواتین دیگر خواتین کی انجمنوں اور تنظیموں میں شامل ہو کر عورتوں کے مساوی حقوق کے لئے جد و جہد کریں گی۔

(۷) بوہرہ نوجوان دیگر فرقوں کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر یوتھ کیمپ کریں گے اور نوجوانوں میں بیداری اور قومی یک جہتی کے لئے کام کریں گے۔

(۸) نماز، نکاح، نماز جنازہ وغیرہ کے فرائض دینے کے لئے ایسے لوگ تیار کریں گے جو دینیاوی تعلیمات سے بھی آراستہ ہوں اور مذہب کو ذریعہ معاش نہ بنا کر یہ کام فی سبیل اللہ انجام دیں۔

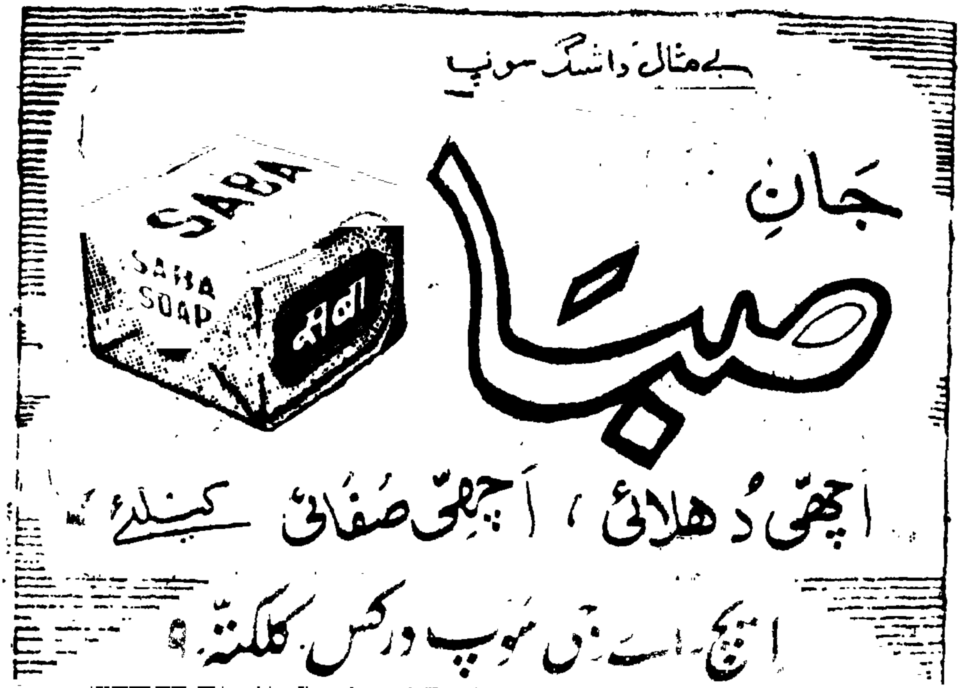
(۹) ممتاز شہریوں، دانشوروں، اور سیاسی رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد وزیر اعظم سے مل کر ان پر بہت (سماجی بائیکاٹ) کے خلاف قانون بنانے پر زور ڈالے گا۔ مولانا اسحاق سنبھلی اور جناب [illegible] اس کی تیاریاں کریں گے۔

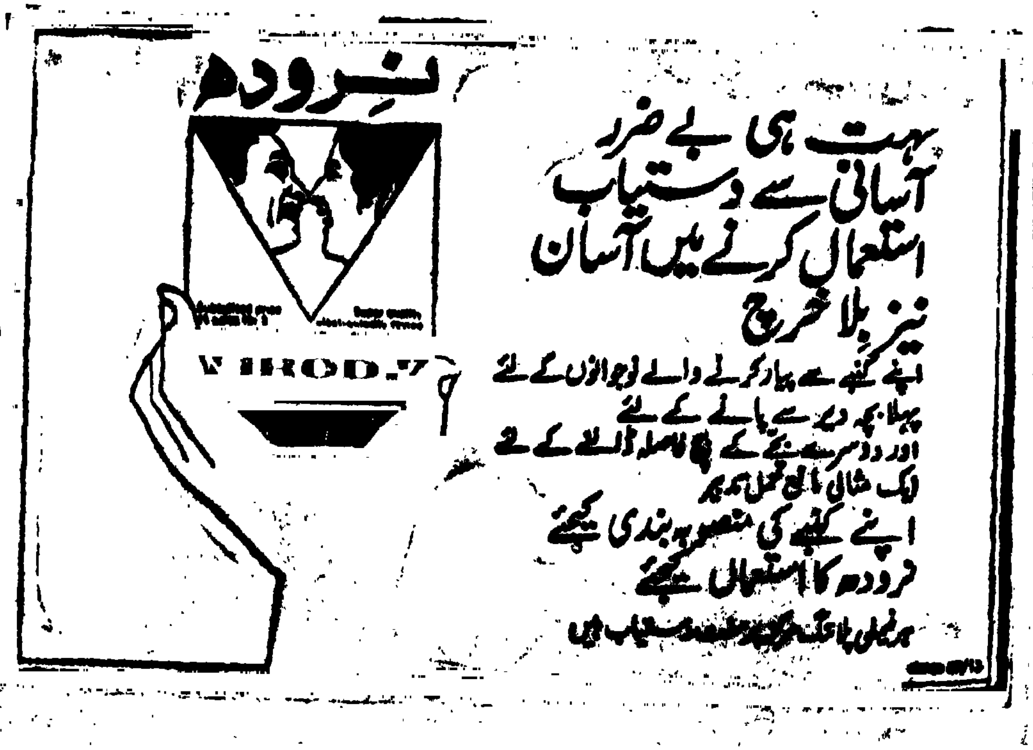
کانفرنس میں ۶ فروری کی رات میں ایک مشاعرہ اور ۷ فروری کی شام میں شام غزل کا پروگرام بھی رکھا گیا جس میں مقامی شعراء، راحت اندوروی، عزیز اندوروی، محبوب اندوروی، سروج کمار اور خیام کمار نے بھی حصہ لیا۔ اور شام غزل میں مشہور غزل گو شہر یار نے حسن نعیم صاحب کا کلام پیش کئے۔ حسن نعیم کی سرپرستی میں بمبئی کی ایک فلم یونٹ نے پوری کانفرنس کو فلمایا ہے جس کے کیسٹ بہت جلد مارکٹ میں دستیاب ہوں گے۔ اس کانفرنس میں اصلاح پسند تحریک کی مقبولیت میں چار چاند لگے ہیں۔ اور مفاد پرست سیدنا کی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ اور ان کے خیمے میں زبردست گھبراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ اور بقول فیض احمد فیض کے۔

اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔

بقیہ صفحہ کا۔ ۱۹۲۷ء میں پھانسی کے تختہ پر چڑھ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی آتم کتھا کے مطالعہ کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ آخر دم تک اس غزل سے واقف نہ تھے۔ مگر یہ غزل انھیں سے منسوب ہے۔

یہ ہے ہماری اردو تحقیق کا معیار، اور یہ ہے عظیم آباد والوں کے "سینہ میں کینہ" کا ثبوت، اور یہ ہے قاضی عبدالودود کی نیگلیٹیو تحقیق کا انداز جس کی کوئی دوسری مثال کہیں پیش کی جا سکتی۔


بے مثال واشنگ سوپ
جانِ صبا
SABA
SABA SOAP
اچھی دُھلائی ، اچھی صفائی کیلئے
ایچ۔ اے۔ جی۔ سوپ ورکس کلکتہ ۹


نرودھ
بہت ہی بے ضرر
آسانی سے دستیاب
استعمال کرنے میں آسان
نیز بلا خرچ
اپنے کنبے سے پیار کرنے والے نوجوانوں کے لئے
پہلا بچہ دیر سے پانے کے لئے
اور دوسرے بچے کے فاصلہ ڈالنے کے لئے
ایک مثالی مانع حمل تدبیر
اپنے کنبے کی منصوبہ بندی کیجئے
نرودھ کا استعمال کیجئے

نئی کتابوں کا تعارف

خواہشمندانِ تبصرہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں۔ (مدیر)

نام کتاب: ریزہ ریزہ خواب

افسانہ نگار: سید احمد قادری

قیمت: ٣٥ روپئے

ناشر: مکتبہ غوثیہ، نیو کریم گنج۔ گیا

مبصر: خورشید حیات

"ریزہ ریزہ خواب" سید احمد قادری کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کا مالی تعاون شامل ہے۔

مجموعے میں کل ٢١ افسانے شامل ہیں۔ فلیپ پر غیاث احمد گدی، رام لعل، کلام حیدری، شوکت حیات تنفق، رضوان احمد کے تاثرات شامل ہیں۔ سید احمد قادری آٹھویں دہائی کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں۔ جنہوں نے فیشنی جدیدیت کے علمبرداروں کی طرح خالص ابہام گھڑنا پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں اترتے وقت کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بقول غیاث احمد گدی:

"جدید تر اردو فکشن کی دنیا میں سید احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظام اظہار کے نام پر ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خام کاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔

اظہار بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا در و بست، تہہ در تہہ زندگی کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سید احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔"

سید احمد قادری کی کہانی جو سیدھے سادے انداز میں مدھم سُروں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ ارتقا کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک ایک لفظ قارئین کے لئے جہانِ معنی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ احمد یوسف نے سید احمد قادری کے افسانوں پر اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا ہے:

"سید احمد قادری کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس قافلے سے ہے جو افسانے میں کہانی کے عنصر کو بیحد اہم قرار دیتا

ہے۔"

غیاث احمد گدی اور احمد یوسف کے بعد کی نسل کے ایک اہم افسانہ نگار شوکت حیات کے مطابق :

"نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں سید احمد قادری نمایاں نظر آتے ہیں۔ انکے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی ہنرمندی انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں واقعات کی پوری تہ داری کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ انکی کہانیوں کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔"

مجموعہ کا پہلا افسانہ "شہر خموشاں" ہے جسمیں عہد حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل، جبر و ظلم اور استحصال کو سید احمد قادری نے فنی لوازم برتتے ہوئے بڑے ہی اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے۔ جو منفرد بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔ یہ اس شہر کی کہانی ہے جہاں ایک طرف تو بلیک مارکیٹنگ اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے ہیں جو غریبوں کا خون چوس کر کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کا قد اونچی عمارتوں کے بیچ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس شہر کی کہانی ہے جہاں آئے دن کوئی نہ کوئی حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں سرمایہ داروں سے مزدوروں کو شکست ہوتی ہے۔ شیطانیت سے انسانیت کو شکست ہوتی ہے لیکن جب ظلم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تب ہوتا یہ ہے کہ فطرت اپنا انتقام لیتی ہے۔

"زندگی کی چہکا چوند شب میں ڈوبے شہر میں زہریلی گیس نے صور اسرافیل پھونک دیا اور پورا شہر راتوں رات شہر خموشاں میں تبدیل ہو گیا۔"

(شہر خموشاں)

"سرخ جوڑے" اس باپ کی کہانی ہے جو گورکن ہے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت قبرستان میں ہی گزارتا ہے۔ تاکہ پیسے کی فراوانی ہو کیونکہ اسے اپنی بیٹی ثریا کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ اس افسانہ کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں :

"اس کی لڑکی ثریا کی شادی دو ہزار روپے میں طے ہو گئی تھی۔ بات تو پانچ ہزار سے شروع ہوئی تھی لیکن دو ہزار تک آتے آتے اسے دو سال لگ گئے اور اس دو سال میں ثریا کی جوانی ڈوبتی ہوئی گلابی شام کی طرح نظر آنے لگی تھی۔"

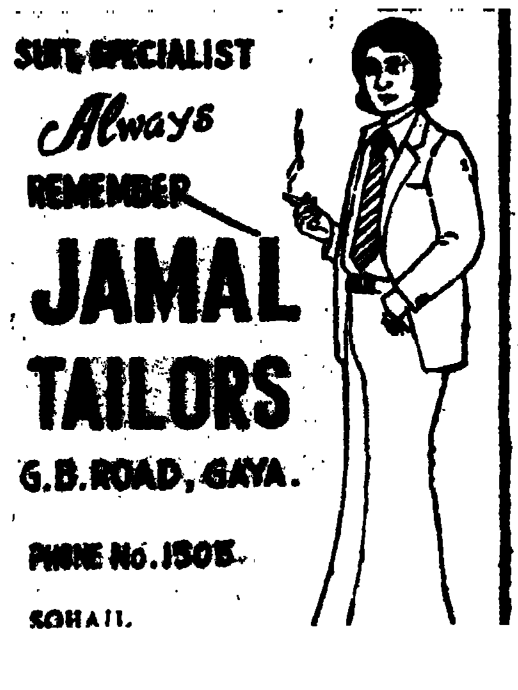
"یا خدا! جلدی جلدی بھیج مردے کو تاکہ میری آمدنی میں اضافہ ہو۔ اور پھر میری بیٹی سہاگن بنے سرخ جوڑے میں اسے رخصت کروں تاکہ اس

کے خواب سچے ہوں۔ اس کے جذبات
وخیالات حقیقت کا روپ دھار لیں۔"
ن سرخ جوڑے میں بیٹی کی رخصتی کے خواب پورے
ے ہوسکے اور آخر کار ایک دن جب وہ
ستان میں بھوکا پیاسا صرف ایک مُردہ کے انتظار
بیٹھا تھا کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔
پھر لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں مردہ کا
دیکھتے ہی اس کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔
"میں تو تجھے سرخ جوڑے میں رخصت
کرنے کے لئے دن رات ایک کرکے دو
ہزار روپے کی رقم فراہم کر دیا تھا،
لیکن تجھے اتنی جلدی کیا پڑی تھی؟
اپنے خوابوں کے شیش محل کو سجانے کے
لئے سرخ جوڑے کے بجائے سفید جوڑے
میں کیوں رخصت ہو رہی ہے۔"

اس طرح "سرخ جوڑے" کی کہانی ایک چونکا دینے والے انجام پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی ذہن پہ دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ "سرخ جوڑے" میں موضوع کا جذباتی اظہار ضرور ہے لیکن یہ جذباتی اظہار بھی فن کے پردے میں حقیقت کا عکاس ہی نظر آتا ہے۔

"آنگن کی بات"، "لمحوں کی بازگشت"، "یادوں کا المیہ"، وغیرہ افسانوں کا تعلق اس زندگی سے ہے جو حسین بھی ہے اور بدنما بھی، جہاں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی۔ شکست و ریخت دونوں ہی یہاں موجود ہیں۔

خوبصورت گٹ اپ اور آفسیٹ کی طباعت سے آراستہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں مقبول ہوگا ایسی مجھے امید ہے۔ ●●



قارئین کے خطوط

شہرِ خیال

محترم جمیل صاحب ! آداب

سہیل باقاعدگی سے مل رہا ہے تازہ شمارہ میں ڈاکٹر ر۔ج پریمی کا سہری نگر سے متعلق تحقیقی مضمون خوب ہے کافی محنت کی ہے موصوف نے۔

کہانی "ایک سوال" بھی اچھی ہے ۔ بدی کے بیچ نیکی کو جگہ ملاتی ہے! باقی کا مواد بھی قابل توجہ و ستائش ہے ۔ مجموعی طور پر چھوٹا ہونے کے باوجود یہ شمارہ "بڑا" ہے کاغذ سفید ہوتا تو بہتر تھا ۔

مشرون کمار ورما، امرتسر ۔

سہیل کے دو شمارے (فروری مارچ) ایک ساتھ ملے ایسا لگتا ہے ادھر آپ لوگ اسے بہتر سے بہتر بنانے پر آمادہ ہو چکے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے ۔

قیصر عثمانی ، بمبئی ۔

مارچ کا شمارہ ملا ہے ۔ آپ نے اسے اب وقت کا پابند بنا دیا ہے اچھا ہے ۔ مضامین آپ اچھے لکھنے والوں سے حاصل کر لیتے ہیں یہ بڑی بات ہے ۔ گیان چند جین کے مضمون پر لوگ خوب بحث کر رہے ہیں ۔ چلئے ہم جیسے اسے دلچسپی سے پڑھتے تو ہیں ۔

مشتاق احمد نوری ، سمستی پور ۔

برادر محترم ! سلام و خلوص

"سہیل" جنوری ۸۶ء کا شمارہ مطالعہ کی زینت بنا افسانوی حصہ میں حسین الحق کا افسانہ "ایک شعری کا مرثیہ" نئی تکنیک پر کامیاب تجربہ ہے ۔

حصہ نظم میں فضل امام ملک نے متاثر کیا ۔ تبصرے کا حصہ کافی وسیع ہے ۔ خاص طور پر علیم اللہ حالی کا "فصیل" پر تبصرہ بھرپور ہے ۔ جو روایتی تکنیک سے ہٹ کر لکھا گیا ہے ۔ اور تسکین زیدی کے افسانوی کا تجزیہ جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے ان کی افسانوں پر گہری بصیرت اور گرفت کا پتہ چلتا ہے فصیل پر جتنے بھی تبصرے رسائل میں شائع ہوئے ہیں علیم اللہ حالی کا تبصرہ زیادہ موثر اور متوازن ہے ۔ امید کہ آپ آئندہ بھی ایسی ہی تخلیقات "سہیل" میں شائع کرتے رہیں گے ۔

ظفر اقبال ، فتح پور (یو پی) ۔

صد احترام ! سلام و نیاز

خیریت سے ہوں ، پہلی بار سہیل ماہ مارچ کا دیکھنے کو ملا جہاں ڈاکٹر ر۔ج پریمی کا مقالہ "شہر لا یہ گل" بہت پسند آیا اس قدر گرانی میں اتنا بہترین پرچہ شائع کرنے کیلئے مبارکباد ۔

فریدی مونگیری

محترم جمیل بھائی : تسلیم ، خدا کرے بخیر ہوں

اپنے دامن میں تمام تر معیاری تخلیقات سمیٹے "سہیل" جنوری کا شمارہ موصول ہوا اس عنایت کا شکریہ : یہ بات خوش کن ہے کہ سہیل کامیابی کی طرف رواں دواں ہے ۔ اس شمارہ کی کتابت ، طباعت ، ٹائٹل اپیج وغیرہ بھی خوب ہے ۔ مضامین ، نظم و نثر

Regd. . . & 1. Gay-4
R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
48 years of Publication
Phone : 21573

July 1987

Rs. 2.5


TRADE JRI MARK
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اور مضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
66/H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL-700 046

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی ـــــــ بیادگار :- زین العابدین انجم و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

فون نمبر ۲۱۵۷۳

جولائی سنہ ۱۹۸۷ء

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر	مجلس مشاورت	شمارہ ۷	جلد ۱۹
ایڈیٹر :- جمیل منظر	ڈاکٹر تاراچرن رستوگی	بدل اشتراک فی شمارہ	۲/۵۰ روپے
معاونین :- شکیل احمد ابدالی	ڈاکٹر قمر رئیس	زر سالانہ	۳۰ روپے
عبدالقیوم ابدالی	اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر برج پریمی	لائف ممبری	۵۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا

نمود

اکیسویں صدی اور کمپیوٹر کا یہ ملک کیا کر رہا ہے اُن کے لئے

——— اس اخبار ہاکر کے لئے جو روز ۲۰۰ سے زائد اخبار و رسائل بانٹنے کے لئے سائکل پر ۴۵ کیلو میٹر سے بھی زیادہ دوڑتا ہے ؟

——— اس غریب حاملہ مزدور عورتوں کے لئے جو ۲۰ کیلو سے بھی زیادہ وزن اٹھاتی ہے ؟

——— ۴۵ سال سے زیادہ عمر کے ان ریلوے قلیوں کے لئے جو ۵۰ کیلو سے بھی زیادہ کا وزن اپنے سر پر اٹھا کر دس سے بھی زیادہ پھیرے لگاتے ہیں ؟

——— اُن ننھے بچوں کے لئے جو صبح ۴ بجے سے دیر رات تک ہوٹلوں میں جی توڑ محنت کرنے کے باوجود بھی کم سے کم مزدوری کے حصہ دار ہیں ؟

——— اُن سبزی بیچنے والی عورتوں کے لئے جو سر پر ۲۰ کیلو سے بھی زیادہ کا وزن اُٹھا کر دن بھر میں ۱۵ کیلو میٹر سے زیادہ دوری طے کرتی ہے ؟

——— اُن دیویوں کے لئے جو اپنے سے کئی گنا زیادہ وزن اناج پیدا کر کے ایک وقت بھوکی سوتی ہیں ؟

——— اُن پرائمری اسکول کے دور دراز کے گاؤں کے ٹیچر کے ہونہار بچوں کے مستقبل کے لئے ؟

——— اُن غیر تعلیم یافتہ کسانوں کے لئے جو اپنا قیمتی وقت بے کار کی کاغذی کارروائی اور عدالت میں گنواتا ہے ؟

——— اُن ردّی اکٹھا کرنے والوں کے لئے جو دن بھر میں کم سے کم ۲۰ کیلو ردّی اکٹھا کرنے کے لئے ۳۰ کیلو میٹر سے بھی زیادہ دوری طے کرتا ہے ؟

——— اُن معصوم بچوں کے لئے جن کی ماں روزی روٹی کے لئے گھر میں گائے بھینس سے ملا دودھ دوسروں کے یہاں بیچ دیتی ہیں اور وہ بھوکا رہ جاتا ہے ؟

——— اُن قسمت کی ماری بہنوں کے لئے جنہیں اپنی زندگی بچائے رکھنے کے لئے اپنا جسم تک نیلام کرنا پڑتا ہے ؟

جمیل منظر سنسہاروی

ابو محمد شبلی
داستان محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ (یوپی)

قاضی عبدالودود اور تحقیق

ایک غزل کی تحقیق کے پس منظر میں

روزنامہ عزائم کی دسمبر ۱۹۸۶ء کی کسی اشاعت میں یہ خبر چھپی تھی کہ قاضی عبدالودود صاحب مرحوم نے PH. D کے چند مقالوں پر تحقیقی نقطۂ نظر سے تنقید کی تھی۔ اور اس کی تائید میں جناب عبدالاحد صاحب (شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی مظفرپور) کا ایک مضمون "عزائم" کی دو اشاعتوں ۲۰ و ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ء میں چھپا تھا۔ قارئین عزائم کو یہ خوشخبری بھی دی گئی تھی کہ جناب عابد رضا بیدار (سابق ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ) قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں اس سلسلہ کو پھر شروع کرنا چاہتے ہیں۔ قاضی صاحب کے زمانہ میں ایسی تحقیق و تنقید کی اہمیت نہ تھی کہ لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ لیکن اس دورِ جاہلیت میں اس کی افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اردو تعلیم کا معیار تو پست ہوا ہی ہے اردو کے نام نہاد پروفیسروں نے اس کی مٹی اور بھی پلید کی ہے۔ یہ سب اپنے فرائض منصبی کو پورا نہیں کرتے۔ جنھیں ہر منزل میں کام چلاؤ استفادہ سے سابقہ پڑتا رہا ہے کمزور ہوتے ہی ہیں۔ ریسرچ کی منزل میں پہونچ کر اور بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور ان "پروفیسروں" کے ذریعہ پریشان کئے جاتے ہیں۔ جو علم کی بنیاد نہیں بلکہ ملازمت کی مدت کی بنا پر پروفیسر بنا دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آج پی ایچ۔ ڈی کے تھیسس میں تحقیق کی غلطی تو درکنار املا کی غلطیاں بھی راہ پا جاتی ہیں۔ اور ان پر ڈگری بھی مل جاتی ہے۔

اطلاع ملی تھی کہ قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں اس سلسلہ کی پہلی مجلس کا انعقاد جنوری کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ میں ہونے والا ہے۔ اسی مناسبت سے جناب عبدالاحد صاحب کے مذکورہ مضمون کی روشنی میں قاضی صاحب مرحوم کی تحقیقی خامیوں کی نشاندہی کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہی قاضی صاحب کو میرا خراجِ عقیدت بھی ہے۔ اور قاضی صاحب کی راہ اپنانے والوں کو اس راہ کی ٹھوکروں سے باخبر کرنے کی غرض و غایت بھی۔

قاضی صاحب کی تحقیق کی بنیاد قانونی موشگافیوں پر تھی۔ اس لئے کہ وہ اپنے دور کے پٹنوی سماج کی روایت کے بموجب انگلینڈ سے بیرسٹری کی ڈگری لائے تھے۔ تحقیق کی نہیں لیکن اردو سے والہانہ دلچسپی کے باعث اردو ہی سے وابستہ رہے انگلینڈ میں رہ کر بھی انہیں انجمن ترقی اردو بہار کی کارکردگی ستاتی رہی تھی۔ اور خطوط کے ذریعہ رہنمائی کے فرائض ادا کرتے

تھے۔ لیکن انگلینڈ سے واپسی کے بعد انہوں نے اردو زبان کی تحریک سے خود کو یکسر علاحدہ (علیحدہ) کر لیا۔ اور اردو ادب کی خدمت میں انگریزی زبان کے دکھلائے ہوئے بالخصوص قانونی راستے پر چل پڑے۔ اور تحقیق کو اپنی جولانیٔ طبع کا مرکز بنا لیا۔ چونکہ وہ قانون کی راہ سے تحقیق کے دشت جنوں میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید اور نقطہ تک کو اپنا تحقیق کا مرکز بنا لیتے تھے۔ گذشتہ (زبر) اور گذشتہ (زیر) کاتب کی غلطی کے احتمال کے باوجود ان کے لئے محل نظر ہوا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا اردو ادب پر ایک احسان ہے کہ انہوں نے آئندہ نسلوں کو فن تحقیق کے وہ گوشے بھی دکھلائے جو قانونی استدلال کی زد میں آ سکتے تھے۔ اس طرح انہوں نے فن تحقیق میں قانونی تحقیق کے شعبہ کی بنیاد بھی ڈالی۔ جناب عبدالاحد لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر ممتاز احمد نے راسخ کی مثنویات پر اپنے تحقیقی مقالے میں اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھ دیا۔ اس زمانہ میں سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر شخص کا سینہ کینہ سے بھرا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے ایک تحقیقی مقالہ میں اس جملہ کا وجود برداشت نہ کیا۔ اور واضح طور پر لکھا کہ عظیم آباد میں کوئی دور ایسا نہ گذرا جس پر یہ قول صادق آ سکے۔" (عزائم ۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء)

اگر یہ جملہ قاضی صاحب ہی کا ہے تو میں انہیں کے اصول تحقیق کو اپناتے ہوئے "کوئی دور" کو غلط کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ عظیم آباد کی سماجی زندگی کے ہر شعبہ کا ہر دور اسی کینہ پروری کا مارا ہوا جس کی نشاندہی ڈاکٹر ممتاز احمد نے کی ہے۔ یہ عین انسانی فطرت بھی ہے علم کے وارثوں سے بھی یہ عیب چھپتا نہیں۔ انسانی کردار پر اس کے داغ دھبے، اور شکن رہ جاتے ہیں۔ دانشوروں نے اس عیب کو علم و ادب کے شعبہ میں خوشگوار بنانے کے لئے "معاصرانہ چشمک" کا نام دیا ہے مگر اس کی اصل وہی کینہ اور حسد ہے۔ قاضی صاحب کے دور کی صرف ایک شہادت ایک غزل کی تحقیقی بحث کے سلسلہ میں دی جا سکتی ہے۔ جو ہفتہ وار عزائم ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء کی اشاعتوں میں چھپی تھی۔ اس غزل کی بحث میں قاضی صاحب خود بالواسطہ ملوث رہا کرتے تھے، ہفتہ وار عزائم کے صفحات پر وہ غزل جس کا مطلع ہے؎

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

زیر بحث تھی۔ یہ غزل سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی ہے۔ مگر لندہ ولان عظیم آباد نے اسے سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی سے منسوب کیا۔ اور جب بسمل الہ آبادی نے اس کی ملکیت سے انکار کیا تو اسے شہید آزادی پنڈت رام پرشاد بسمل شاہجہاں پوری کی تخلیق قرار دیا۔ وہ حیات تو تھے نہیں اس طرح غزل ان سے منسوب ہو کر رہ گئی لیکن ہفتہ عزائم کی بحث میں مقطع کے شعر؎

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارمانوں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دل بسمل میں ہے

کی بنیاد پر مولانا حسرت موہانی کی غزل کہا جا رہا تھا۔ مدعی نے قاضی عبدالودود صاحب سے بھی رجوع کیا اور قاضی صاحب کا جواب ان لفظوں میں چھپا تھا۔

پٹنہ ۴

۱۴ اگست (۱۹۸۰ء)

مکرمی غازی صاحب۔

آپ کا خط مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء ملا۔ یاد آوری کا شکریہ! شاہ محمد محسن میرے رشتہ دار اور شاد عظیم آبادی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ میں جب پہلے شہر میں رہتا تھا تو ان کا مکان قریب تھا۔ اور کثرت سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان کا دیوان آج تک نہیں چھپا۔ میں مارچ ۱۹۲۳ء میں انگلستان گیا تھا۔ تو اس سے قبل دو برس کے اندر انہوں نے زیر بحث غزل ایک اخبار میں اپنے نام سے چھپی ہوئی دکھائی۔ اور بعد کو کہا کہ اس کی اشاعت کے لئے اخبار سے باز پرس بھی ہوئی تھی۔

گوپال متل نے مجھ سے اس غزل کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اس کو عجب نہیں کہ ایک سال گذرا ہے۔ میں نے بسمل صاحب کو اس مضمون کا خط لکھا کہ آپ غزل زیر بحث اور اپنی دوسری غزلوں کے کچھ اشعار منتخب اپنی تصویر اور حالات زندگی کے ساتھ بھیجیں۔ یہ چیزیں "تحریک" میں شائع ہو جائیں گی وہ خاموش ہوئے تو میں نے اسی مضمون کا دوسرا خط لکھا اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے آئے۔ اور وعدہ کیا کہ مطلوبہ غزل اور اشعار وغیرہ جلد بھیجوں گا۔ لیکن آج تک ایفائے وعدہ نہ ہوا۔ ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ میں نے یہ بھی انہیں لکھا کہ یہ غزل کس اخبار میں اور کب شائع ہوئی تھی۔

اب آپ اس سے جو نتیجہ چاہیں نکالیں۔ مگر یہ غزل کسی شاعر کی اسی وقت ہو سکتی ہے جب مارچ ۱۹۲۳ء سے قبل اس کے نام شائع ہو چکی ہو

قاضی عبدالودود

(ہفتہ وار عزائم ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

قاضی صاحب کے مراسلہ کا دوسرا پیراگراف حقائق کی نشاندہی کے لئے نہیں بلکہ اس پر پردہ ڈالنے اور شک و شبہ پیدا کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا۔ اس کے وہی اثرات مرتب بھی ہوئے۔ پہلے اور تیسرے پیرا کو لوگوں نے نظر انداز کر دیا چنانچہ مدیر الیہ نے برجستہ لکھا۔

قاضی محترم کا مندرجہ بالا مکتوب پڑھ کر غازی اس نتیجہ پر پہونچا کہ بسمل عظیم آبادی اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں اور ویسے بھی جب قاضی عبدالودود صاحب ۱۹۲۳ء میں انگلستان گئے تھے تو اس زمانہ میں بسمل کا عہد جاہلیت رہا ہوگا۔ (ایضاً)

(دستکر صاحب پنڈت گوبند اس خموش سرحدی نے "عہد جاہلیت" کو جمالی کی خطا قرار دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے کہ:-

قاضی عبدالودود صاحب جیسے محقق کے مکتوب کی ان سطور کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
میں نے بسمل عظیم آبادی کو لکھا ..... اب آپ اس سے جو نتیجہ چاہیں نکالیں ـــــ کوئی قاضی عبدالودود

صاحب سے پوچھے کہ آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے اگرچہ آپ نے اس کے اظہار کی جرأت وہمت نہیں فرمائی۔ لیکن آپ کے انداز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایفائے وعدہ سے مایوس نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف عظیم آبادی صاحب ہیں کہ آپ کے خطوط کا جواب خود آپ کے پاس تشریف لاکر تو دیتے ہیں لیکن کسی قسم کی تحریر دینے سے بچنا چاہتے ہیں۔ آخر یہ بچاؤ، کیوں؟..... قاضی عبدالودود صاحب محتاط مفکر و محقق بھلے ہی لیکن انصاف کے تقاضوں کو احتیاط پر قربان کر دینا کوئی پسندیدہ منطق نہیں ہے"

(عزائم ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۴ء)

قاضی صاحب کے خط میں اہل نظر کے لیے "باز پرس" محل نظر تھا۔ اس کی کاٹ جناب یحییٰ حنفی نے قاضی صاحب کی شبہ پاکر اس طرح کی تھی:

"قاضی عبدالودود صاحب بھی لکھ چکے ہیں کہ میں نے بسمل صاحب سے زبانی کہا کہ اپنے منتخب اشعار اور یہ غزل دیں۔ مگر وہ اپنی تحریر دیتے ہوئے کترا گئے۔ اور تحریری طور پر لکھنے کی جرأت نہ ہوئی کہ وہی اس متنازعہ غزل کے خالق ہیں...... کیا باز پرس؟ اور کیوں باز پرس ہوئی؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ غالباً ودود صاحب نے اس کے جاننے ہی کمتملت سے کام لیا...... (جوگیش چند رچٹرجی کی کتاب "تلاش آزادی" کے پڑھنے والے بیشتر بہار میں موجود ہیں انہیں اس غزل کو "فرضی شاعر" کے نام سے دیکھ کر دکھ ہوا۔ اور انہیں میں سے کسی نے اخبار سے باز پرس کی (عزائم ۲۸ مئی ۱۹۷۵ء)

اور یہ ساری تحریریں قاضی صاحب مرحوم کے خط کے حوالہ سے چھپتی رہیں۔ مگر وہ خاموش رہے۔ اس طرح انہوں نے اس غزل کو متنازعہ فیہ بنانے میں بالواسطہ اہم کردار ادا کیا تھا۔ مندرجہ بالا امر اسلسلے سے یہ بات بھی مترشح ہو جاتی ہے کہ قاضی صاحب کی تحقیق کا انداز خالص لیگل تھا۔

بلاشبہ قانون ملزم کو شک کا فائدہ دینے کے حق میں رہا ہے۔ لیکن اس "قدر" کو تحقیق میں جگہ نہیں دی جاسکتی جہاں تو ہاں اور نہیں میں ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ مگر قاضی صاحب کے سینہ میں کینہ تھا اس لیے محرم راز ہوتے ہوئے بھی کوئی دو ٹوک بات کہنے سے کترا گئے۔ صرف کترا ہی نہیں گئے بلکہ ایسی باتیں لکھ دیں کہ غزل کی تحقیق غلط بحث کا شکار ہو کر بے نتیجہ ختم ہو گئی۔

میں خود مطمئن نہیں تھا کہ شاعر کی زندگی میں غزل متنازعہ فیہ کیوں ہوئی۔ اس لیے میں نے بسمل کے خاندان والوں سے مختلف مواقع میں اس غزل کے متنازعہ بن جانے کے اسباب معلوم کئے اور اسی سلسلہ میں بسمل مرحوم کی سوانح حیات سے بھی غیر متوقع طور پر بہت ہی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ انہیں کی بنیاد پر میں نے بسمل مرحوم سے بہت سے سوالات کیے تو انہوں نے بتایا کہ یہ غزل قاضی صاحب مرحوم کے بنگلے پر لکھی گئی تھی[1]۔ قاضی صاحب بسمل کے ساتھ کانگریس اور کنگ کمیٹی کے ہنگامہ خیز

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب نے بسمل عظیم آبادی کو انگلینڈ سے ۱۹۲۳ء میں ایک مکتوب میں لکھا تھا: (بقیہ صفحہ پر)

ماہنامہ سہیل گیا۔

اجلاس ستمبر ۱۹۲۱ء کے تماشائی کی حیثیت سے مولانا مظہر الحق (بیرسٹر) کی معیت میں کلکتہ گئے تھے۔ یہ غزل اسی جوش و خروش کے تحت وجود میں آئی تھی۔ اور سب سے پہلے وحشت کلکتوی کے دولت کدے پر قاضی صاحب کی موجودگی میں پڑھی گئی۔ وحشت نے اسی زمین میں برجستہ ایک غزل کہی (شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب نے اس کی تصدیق کی ہے کہ وحشت کی یہ غزل ان کے ۱۹۱۰ء تک کے مجموعۂ کلام میں نہیں ہے) وحشت کی غزل کا مقطع ہے

چھوڑ جائے خوں میں غلطاں بیدل قاتل میں ہے
وائے وہ اک آرزو جو دل بسمل میں ہے

اشارہ کناں ہے کہ یہ غزل بسمل کے غزل سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد کلکتہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ وہیں بسمل عظیم آبادی کی غزل پڑھی گئی۔ اور قاضی عبدالغفار نے اپنے اخبار "صباح" (دہلی) میں شائع کرنے کی غرض سے لے لیا۔

احساس کمتری کے باعث ہم خود اپنی اور اپنی تحقیقات کی قدر و قیمت صحیح طور پر متعین نہیں کر پائے یہ ہمارا قومی مرض ہے جو ہماری صلاحیتوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اور ہم مختلف قسم کے تعصبات سے اس کی تلافی کرتے ہیں محمد حسن بسمل بھی اس کے مریض تھے اسی لئے وہ خاطر خواہ شہرت نہ پا سکے۔ قاضی عبدالودود بھی اسی نفسیاتی مرض کی مرضیت سے متاثر تھے۔ اور اس کا اظہار اس کی دوسری شکل "برتری" میں کیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اس کمزوری کے دونوں پہلوؤں کا احساس رہا ہے۔ اور محمد حسن بسمل کے تعلق سے یہ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی کہ یہ غزل قاضی عبدالغفار کے "صباح" (دہلی) تک کیسے پہونچی۔؟ اس شبہ کو قاضی عبدالودود صاحب کے درج بالا خط کے دوسرے پیراگراف سے بھی تقویت پہنچتی تھی کہ جو شخص "تحریک" دہلی میں ۲۷، ۲۸ سال کی عمر میں اپنا بیان اور اپنی غزل چھپوانے سے کترا گیا وہ بیس اکیس سال کی عمر میں "صباح" (دہلی) میں کیسے چھپ گیا؟ چنانچہ ایک ملاقات میں میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ نے "تحریک" کو مضمون کیوں نہیں بھیجا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے کسی نے تو دریافت کیا نہیں تھا، قاضی صاحب سے پوچھا گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ (ک ا) "آپ کی والدہ صاحبہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں، انہیں مفت میں بعض اشخاص کی غلط فہمی یا غلط بیانی کی وجہ سے رنج ہو گیا۔" (عظیم آباد ایکسپریس ۲۴ اگست [illegible])

بسمل عظیم آبادی کی وجہ سے "صباح" سے انگریزی حکومت نے باز پرس کی اور قاضی عبدالغفار صاحب نے ل عظیم آبادی کو اپنے بچنے کی فکر کے لئے آگاہی دی۔ تو بسمل کے گھر والوں میں افراتفری مچی، اور لڑنے والوں نے بسمل آبادی کی والدہ کو بھڑکایا۔ کہ یہ سب کچھ قاضی عبدالودود کے باعث ہوا۔ انہیں کے ہتھکنڈے یہ غزل تصنیف کی گئی۔ انہوں نے بسمل کو کانگریس سے وابستہ کیا اور انہیں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی ہنگامہ آرائیوں میں شرکت کے بسمل کو ورغلایا وغیرہ وغیرہ ______ اس طرح بسمل کی والدہ کو قاضی صاحب سے شکایت پیدا ہوئی جسے وہ انگلینڈ جو غلطیوں میں بھی فراموش نہ کر سکے تھے۔ مگر جب اس غزل کی ملکیت کی بات چلی تو بقید ہوش و حواس سب کچھ بھول گئے۔

وہ سب کچھ جانتے تھے انہوں نے جان بوجھ کر اخفائے راز سے کام لیا اور بات تجھ پر ڈال دی۔ میں اپنی تعریف میں خود مضمون لکھوں یہ کیا بات ہوئی۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ قاضی عبدالغفار تک آپ کی رسائی کیونکر ہوئی! تو انہوں نے بتایا کہ جس زمانہ میں ہم لوگ کلکتہ میں پڑھتے تھے۔ قاضی عبدالغفار اسی زمانہ میں کلکتہ سے "جمہور" نکالتے تھے۔ اس زمانہ سے میری ان کی ملاقات تھی۔

ایک اور ملاقات میں بسمل عظیم آبادی سے میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ آپ کی زندگی میں یہ غزل متنازعہ کیوں ہو گئی؟ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ بھائی سچی بات یہ ہے کہ اس غزل کی اشاعت کے بعد قاضی عبدالغفار صاحب کا خط آیا کہ آپ کی غزل کی وجہ سے میرے اخبار پر عتاب نازل ہوا ہے آپ بھی اپنے بچنے کی فکر کیجئے۔ میں خوف زدہ ہو کر اس غزل کی ملکیت سے انکاری ہو گیا۔ میرے استاد شاد عظیم آبادی خاں بہادر تھے اور حکومت تک ان کی پہونچ بھی تھی۔ انہوں نے میری مدد کی اور غزل میں اس طرح ترمیم کر دی کہ اس کا آہنگ بھی ختم ہو گیا۔ اور یہ بھی اتفاق کہ میرے ماموں جنکے زیر سایہ میں نے پرورش پائی تھی۔ خان بہادر محمد کمال صاحب کمال عظیم آبادی شاگرد رحید اللہ آبادی بھی حکومت انگلشیہ میں رسوخ رکھتے تھے۔ انہوں نے گورنر بہار کی دعوت کی تھی۔ اس دعوت میں مجھے پیش پیش رکھا گیا کہ سی آئی ڈی اور افسران مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کریں۔ اس طرح میں بچ گیا۔ پھر آزادی کے بعد پہلی بار ۱۹۵۵ء میں "یاران میکدہ" کے صفحات پر اس غزل کو اپنی غزل بتایا تو لوگوں نے ایران، طوران کی اڑا دی۔ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے اس غزل کا خالق ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس سلسلے میں ارباب علم وفن سے خط وکتابت کی تھی۔ سردار جعفری صاحب کا جواب بھی ملا تھا انہوں نے لکھا تھا کہ میری کتاب۔ "ترقی پسند ادب" جب شائع ہوئی تھی تو ایک صاحب جنہوں نے اپنا تخلص بسمل عظیم آبادی لکھا تھا خط آیا تھا کہ انہوں نے لکھا تھا کہ "سرفروشی کی تمنا" والی غزل میری ہے۔ میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ میں نے آپ کا کوئی کلام دیکھا نہیں۔ نیز اس غزل کو رام پرساد بسمل کی پھانسی کے بعد ہی شہرت ملی اور انہیں کے نام سے منسوب ہو گئی اب ہم کس طرح یقین کرلیں کہ یہ غزل آپ کی ہے۔

اس حوالے میں بسمل سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ قاضی عبدالغفار کا خط ملنے کے بعد میں نے "صباح" کا تمام شمارہ ضائع کر دیا۔ وہ خط بھی اب نہیں رہا تو میں انہیں کیا ثبوت پیش کرتا۔ اس لئے خاموشی اختیار کرلی۔

اس پس منظر میں قاضی عبدالودود صاحب کے مذکورہ بالا مراسلہ کا ایک بار پھر تجزیہ کیجئے، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ قاضی صاحب نے معاصرانہ چشمک یا خاندانی رقابت کے باعث فن تحقیق کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر دو ٹوک بات کہنے سے گریز کیا۔ اور مراسلہ کا دوسرا پیراگراف لکھ کر "ملزموں" کو شک کا فائدہ پہونچانے کی کوشش کی۔ میرا گمان ہے کہ محمد حسن بسمل کو غزل کی تصنیف سے انکار کا مشورہ بھی قاضی صاحب نے اسی وقت دیا ہوگا۔ جب بسمل نے زیر بحث غزل ایک اخبار میں اپنے نام سے چھپی ہوئی (انہیں) دکھائی اور بعد کو کہا کہ اس کی اشاعت کے لئے اخبار سے باز پرس بھی ہوئی تھی۔ مگر بسمل عظیم آبادی سے اس کی تصدیق کا موقع نہیں ملا۔

نتیجہ میں آج تک یہ غزل ٹی وی، اور ریڈیو پر، اور مضامین میں بسمل کی مناسبت اور آزادی کے لئے جام شہادت پینے کے باعث رام پرشاد بسمل شاہ جہاں پوری سے منسوب ہوتی چلی آرہی ہے۔ جبکہ رام پرشاد بسمل کا شاعر ہونا ہی ثابت نہیں۔

شہید آزادی پنڈت رام پرشاد بسمل اردو میں اتنے کمزور تھے کہ دوبار مڈل میں فیل ہوئے۔ پھر اردو چھوڑ کر ہندی لے کر آگے بڑھے، انگریزی حکومت کے خلاف اپنی دہشت پسندی کے باعث میٹرک بھی پاس نہ کر سکے اور تیس سال کی عمر میں (۱۹ اگست

علیم اللہ حالیؔ کی تنقید نگاری

"اعتبار" کی روشنی میں

ڈاکٹر فریدہ کول سری نگر، کشمیر

"(اعتبار" ڈاکٹر علیم اللہ حالیؔ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں انہوں نے فکر و احساس کے بنیادی نقوش کو سمیٹنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔

کتاب میں کل بارہ مضامین شامل ہیں۔ جناب حالی نے دو مضامین میں لسانی امور کو بنیاد بنا کر زبان و ادب کے بنیادی سوالات سے بحث کی ہے۔ سات مضامین میں جدید اور نئے شعراء کی شعری تخلیقات پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے ان کی فنی و فکری صلاحیتوں کا گراں قدر مطالعہ پیش کیا ہے۔ ایک مضمون میں انگریزی شاعری اور موسیقی کے ناگزیر رشتے پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک اور مضمون میں پریم چند کے سماجی شعور کو زیر بحث لایا ہے۔ اور ایک دوسرے مضمون میں شفیع مشہدی کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

مجموعی طور پر کتاب میں شامل تنقیدی مقالات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ کتاب حالی کی ژرف نگاہی، دیدہ وری، عرق ریزی اور نکتہ وری کا نادر نمونہ قرار دی جاسکتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے مختلف اور منفرد فنکاروں کے محسوسات اور تجربات کا محاکمہ جس انداز اور ڈھنگ سے کیا ہے اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ نتائج اخذ کرنے میں دوسروں کے حوالہ جات بے چون و چرا تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں اپنے مطالعے اور مشاہدے کی کسوٹی پر تجزیہ کرتے ہیں اور ایک غیر جانب دار منصف کی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نقاد کا کام اقدار حیات کا تعین کرنا ہے" اعتبار" کے بیشتر مضامین میں جناب حالیؔ نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ اور منفرد تخلیق کاروں کی شخصیت اور نفسیات میں چھلک کر ایسے حیات آفریں گہر ڈھونڈ نکالے ہیں جو آنے والی نسل کو سدا کے لئے شبنم افشانی کرتے رہیں گے۔ اور زندگی کی ایک نئی راہ اور نیا وژن دکھلاتے رہیں گے۔ دراصل محترم علیم صاحب نظر کے ساتھ ساتھ معتبر نظریہ بھی رکھتے ہیں اور بیان کے ساتھ ساتھ بات کہنے اور سمجھانے کا نہایت ہی سلجھا ہوا انداز بھی رکھتے ہیں۔ جناب حالی کے تنقیدی طریقۂ کار کے یہ تینوں عناصر اس قدر متوازن

مثبت اور صحت مند ہیں کہ ان کی تنقید خود بخود معیار اور وقار کی حدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

فنی اعتبار سے حالی کی یہ تنقیدی تحریریں توارکی، اکتشافی اور خود ساختائی نظریات کے زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں بیشتر تخلیق کاروں کا مطالعہ ان کے ماحول اور پس منظر کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے منفرد و ممتاز شعراء کے پرپیچ "طلسم کدوں" کی جانکاری دیتے ہوئے قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لبعض مضامین میں حالی نے فکر و نظر کی عام راہوں سے ہٹ کر اپنے منفرد افکار کا بے باک اظہار کیا ہے۔ اور ایسی تنقیدی آرائشیں کی ہیں جو قاری کے غور و فکر کو تحریک دیتی ہیں۔ بہ اعتبار ایک قدر ساز تصنیف ہے، جو ادبی حلقوں میں قبولیت اور پذیرائی کی مستحق ہے۔

پیش نظر کتاب کا پہلا مضمون "اردو املا۔ مسائل اور مباحث" لسانی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ یہ مضمون فکر انگیز اور بحث طلب بھی ہے۔ جس بات کا اعتراف خود علیم صاحب نے بھی کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اردو املا سے متعلق تمام دستیاب مواد پر محققانہ فکر و نظر سے جائزہ لیا ہے اور اردو املا کے ان مسائل کی نشاندہی کری ہے۔ جو اردو زبان کے تحریر و تقریر میں حائل ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس مضمون میں انہوں نے ڈاکٹر تحر کی تصنیف" اردو املا اور اس کی اصلاح" کے بارے میں اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حالی کی اختلاف رائے کی مثالیں مذکورہ مضمون میں جا بجا ملتی ہیں۔ میرے خیال میں ان کے تنقیدی طریقہ کار کی یہی اہم خوبی ہے۔

زبان و بیان ـــــ ایک اور مضمون حالی کے لسانی اجتہاد کا عکاس ہے۔ اس میں انہوں نے زبان و بیان کے بنیادی رموز کو سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہاں زبان اور بیان کی اہمیت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان کی درجہ بندی کرتے کرتے انہوں نے عملی اور ادبی زبانوں کے منصب خاص پر بھی اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے انگریزی نقادوں کے حوالہ جات سے بھی کام لیا ہے۔ کہ آج کل شعر و ادب میں اظہار پر موضوع کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور اظہار کے پیکر کو محاسن کلام سے سجا کر پیش کر کے اس کو شعر و ادب قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ضمناً ایک سوال علیم صاحب سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر زبان خواہ نثر یا نظم کی ہو۔ محاسن طرز کلام سے قطعی محروم ہو۔ تو تخلیقی زبان کیونکر پیدا ہوسکتی ہے؟ کہیں پھر شعر و ادب کی زبان روزمرہ کی بولی جانے والی بولی کا روپ اختیار تو نہیں کرے گی۔

..... دراصل جو مفہوم مذکورہ مضمون میں علیم صاحب سمجھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ شعر و ادب میں موضوع اور بیان دو ایسے دھارے ہیں جن کا بیک وقت پہلو بہ پہلو چلنا ناگزیر ہے۔ علیم صاحب طرز تحریر یا اظہار کو الفاظ کے گورکھ دھندوں میں ملبوس نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس سے تحریر کا بنیادی مفہوم گھٹ گھٹ کے

. میرے خیال میں علیم صاحب کو محاسن کلام
ندی کا مخالف ہونا چاہئے تھا۔ محاسن کلام
کا نہیں۔ پھر بھی ان بحث طلب رموز کے باوجود
ن میں علیم صاحب کے اصلاح پسند شعور کی
تی ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ حالی زبان و بیان
میں Discussive mind رکھتے
اصلاح پسند شعور کو منوانے کے لئے ایسی منطق،
ن اور متوازن دلائل پیش کرتے ہیں کہ ان کی ہر
یال خواہ کتنا ہی بحث طلب کیوں نہ ہو۔
عترف حاصل کرتا ہے۔ بلا شبہ علیم صاحب
آرا زبان و بیان کے بارے میں منفرد اور قدر

ر نظر کتاب میں بیشتر ایسے مضامین شامل ہیں
کار و رموز کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں "کالی
ہما کے فنی کارنامے" "اجتبیٰ رضوی کے
لام بسمل ۔ ایک جائزہ" "قیصر عثمانی کی شاعری"
ری میں فارسی و ریختہ کی مماثلت" "مثیل
بحیثیت شاعر" "انگریزی شاعری میں ثنائے
طالعہ شہباز" قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین میں
ردں کے فکر و احساس پر حالی نے اپنے
ر مفکرانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیز ان
ری کاوشوں اور رویوں کی افہام و تفہیم کرکے
ت اور لفسیات کی محرکات کا کھوج لگانے
کی ہے۔ اور قاری کو ان کے فکر و فن کو سمجھنے

میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

مجموعی طور پر اعتبار جناب حالی کی منفرد تنقیدی اور تحقیقی صداقتوں کا آئینہ سامنے لاتی ہے۔ اور اس آئینے میں ہم علیم صاحب کی نازک حسیت، گہرے ادراک، فلسفیانہ شعور، وسعت مطالعہ، منطقی استدلال، ذہن رسا اور لسانی شعور کی تابناک جھلکیاں دیکھتے ہیں۔ جو ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ اس لئے کہ فن تنقید میں ڈاکٹر علیم صاحب کے انوکھے اور منفرد نظریات اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ کرے۔ کہ ان کے معتبر تنقیدی اصول و نظریات سے نئے نئے نقادان ادب کو اکتساب، فیض حاصل کرنے کا موقع ملے۔ اور ان کی یہ گراں قدر تصنیف قبول عام حاصل کرے جس کی یہ حقدار ہے۔

★ (نقد:۔ قاضی عبدالودود.....)

۱۹۲۷ء میں پھانسی کے تخت پر چڑھ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی آتم کتھا کے مطالعہ کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ آخر دم تک اس غزل سے واقف ہی نہ تھے مگر یہ غزل انھیں سے منسوب ہے۔

یہ ہے ہماری اردو تحقیق کا معیار۔ اور یہ ہے عظیم آباد والوں کے "سینہ میں کینہ" کا ثبوت اور یہ ہے قاضی عبدالودود کی بیکل تحقیق کا انداز جس کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

(نقد:۔ میرے ہونٹوں.....) شور دنیا کے ہر حصے میں سنائی دے رہا ہے۔ جیلر کے محاسن جواب دینے لگے وہ جیل چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا کہ

- اس نے شاعر کی مت پر الیا احتجاج ہوا ہے کہ احتجاجیوں کے لئے تمام جیلیں چھوٹی پڑ گئی ہیں۔

ماہنامہ سہیل گیا ــــ کی ایک اور عظیم پیشکش ــــ اُردو کی معتبر آواز
شہپر رسول کی ادبی خدمات کا اعتراف

ایک شمارہ ــــ شہپر رسول کے نام

مضامین

* شہپر رسول ایک معتبر شعری آواز ــ ڈاکٹر اسلم حنیف
* نئی غزل کا منفرد شاعر شہپر رسول ــ شمس بدایونی
* شہپر رسول مستقبل کی معتبر آواز ــ عادل صدیقی
* شہپر رسول کی غزل اور معنوی ترسیلی رابطہ ــ محمد نور الاسلام
* اپنی دھرتی کا سپوت (خاکہ) نعیم الحسن
* شہپر رسول ایک دوست ایک پیکر خلوص (خاکہ) زکی طارق

ــ اسکے علاوہ شہپر رسول سے ادبی موضوعات پر ڈاکٹر ہلال نقوی کا اچھوتا انٹرویو
ــــ شہپر رسول کی شعری تخلیقات کا انتخاب

صفحات ۸۰ ــ اکتوبر ۸۷ء میں منظر عام پر آرہا ہے قیمت ۴/=

آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرالیں ــــ سالانہ خریداروں کو یہ شمارہ مفت دیا جائے گا۔ آج ہی سالانہ چندہ مبلغ ۴۰/= روپے ارسال کرکے یہ نمبر مفت حاصل کریں۔

منیجر ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۔۔ ۸۲۳۰۰۱

کوھر امروہوی

کرب

سرد آہوں کا
اک جلوس اُٹھا
اور شہرِ نگاہ تک پہونچا

یہ گناہِ عظیم
میرے لئے
غم کے ناگوں کو پالتا ہی رہا
میرے خون کو اچھالتا ہی رہا

ربط

زمزمہ خواں تھا
را بربطِ ہستی
یک دن
یں نے بھی
وش میں
منگ کی سسکتی ہوئی
زلیں پڑھ دیں

تقدیس

موت کے وقت
جیسے
نیک عمل
آدمی کو سہارا
سکون دیتے ہیں !
بس اسی طرح
آپ کی یادیں
شامِ فرقت میں کام آتی ہیں !

جواب

میں نے
آپ کے خط کو
اک فریم میں جڑ کر
اس جگہ لگایا ہے
جس جگہ مرے آنسو
دل کی بات کہتے ہیں
میرے چھوٹے کمرے میں
صرف آپ کا فوٹو
اور آپ کی تحریر
میرے راز کہتی ہے
اس نے
آج کے خط میں
صرف اتنا لکھا ہے !

بیتاب کیفی

فصیلِ کرب

نشاط افروز ساعت
جواں تر آرزوئیں
سرود و کیف و مستی
بہاروں کی چھٹکتی دودھیا
سمندر چاندنی کا
گلاب و یاسمن کی
مہکتی میٹھیوں سے
فصیلِ شہرِ دل
بنائی میں نے

ہزاروں بار
حوادث، کرب و سوزش
سرابِ غم کی یورش
حسیں شام و سحر کی تیز گردش
قیامت خیز آندھی
رفاقت کی فصیلیں
مگر ہر بار
گرائی جا رہی ہیں !

نقیب اکبر

ہاتھوں سے اپنے ہم نے جو خوں سے بنائے تھے
سیلاب کی لپیٹ میں وہ بھی تو آ گئے تھے
یہ ہاتھ کھوکھلا ٹوٹ کے کسی نے بد دل سے پوچھ
ہم نے تو اپنی راہ میں کانٹے بچھائے تھے
جگنو کی روشنی بھی نہ ہم کو ہوئی نصیب
شب کے پجاریوں نے وہ پیکر سجائے تھے
یوں چھین لیا تھا ہم نے بہاروں کا احترام
اپنے لہو سے پھول چمن میں کھلائے تھے
قوسِ قزح کا وہم سا ہر شخص کو ہوا
پانی پہ کچھ لکیریں جو ہم کھینچ آئے تھے

انور لطیف

بجلیاں لاکھ گریں اپنا نشیمن نہ جلے
اس طرح سینہ سپر ہو ترا گلشن نہ جلے
ڈر ہے جب بادِ بہاری ہی بنے بادِ سموم
روشِ گل کی طرح باغ میں سوسن نہ جلے
اب کے اس طرح اس انداز سے آئی ہے بہار
آتشِ گل ہی سے ایسے میں نشیمن نہ جلے
دردِ انساں سے ہے معمور مرا دل انور
دوست تو دوست ہیں میں چاہوں کہ دشمن نہ جلے
ہر طرف آگ زمانے میں لگی ہے انور
رکھ بچا کر کہیں ایسے میں ترا فن نہ جلے

عطا عابدی

کیا خبر تھی جذبۂ عیش و طرب لے جائیگا
زندگی کا غم مرا ذوقِ ادب لے جائیگا
سر چھپائیگی کہاں اہلِ ہوس کی بے بسی
وقت کا طوفان جب نام و نسب لے جائیگا
چند ساعت کے لئے وہ بخش کر جامِ نشاط
جانتا ہوں مجھ سے وہ جینے کا ڈھب لے جائیگا
ساقیا تو ہی بتا دے خواہشِ مے کے سوا
میکدہ میں اور کیا یہ تشنہ لب لے جائیگا
رازِ دل اپنا عطا ہرگز نہ کھولے گا کبھی
ساتھ اپنے وہ اُداسی کا سبب لے جائیگا

بدر الحسن بدر

دیکھتے کیا ہو تم آسماں کی طرف
اٹھ رہا ہے زمیں سے دھواں کچھ کرو
میرے پیروں تلے ہے سلگتی زمیں
سر پہ شعلوں کا ہے سائباں کچھ کرو
سرخ پھولوں سے اڑتی ہیں چنگاریاں
جل نہ جائے کہیں گلستاں کچھ کرو
زندگی چند سانسوں کی جاگیر ہے
اس کو ہونے نہ دو رائیگاں کچھ کرو
لیجئے بدر تم آزمائش مری
اب تمہارا ابھی ہے امتحاں کچھ کرو

امتیاز نظر

کسی فن کار کا گھٹ گھٹ کے مرنا
نیا یہ المیہ کوئی نہیں ہے
درختوں پر اداسی ناچتی ہے
پرندہ خوشنما کوئی نہیں ہے
مہکتی ہے ہمیشہ یاد جس کی
وہ چہرہ پھول سا کوئی نہیں ہے
چمکتے چہروں پہ سب کی نظر ہے
دلوں کو دیکھتا کوئی نہیں ہے
میں گم ہوں اب بے یقینی کی فضا میں
نہیں تو آسرا کوئی نہیں ہے

اختر سعیدی

ویران راستوں پہ کیسے ڈر ہے سانپ کا
تیرے ہی گھر کے پاس تو اک گھر ہے سانپ کا
مدت کے بعد راہ میں وہ کل ملا مجھے
لیکن ابھی تلک وہی تیور ہے سانپ کا
لڑکی میں ایسی دیکھوں ہر اک رات خواب میں
انسان کا ہی جسم مگر سر ہے سانپ کا
خاموش خوف سے ہیں مگر وہ نہ ڈس لے
مسکن ہر ایک جسم کے اندر ہے سانپ کا
سطحی تھا اس کا ذہن چھپا کر نہ رکھ سکا
اب بھی کبھی اسکے جسم سے باہر تھا کا

منوہر لال نے اپنی بیٹی کے ہاتھ تو پیلے کر دیئے...
لیکن اُن کی پھول جیسی بچی مُرجھا گئی



منوہر لال نے اپنی بیٹی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ ابھی وہ سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ فوراً اس کی شادی کر دی۔ برا تو ہوا ہی، لیکن منوہر لال نے یہ نہیں سوچا کہ شانتا خود ابھی بچی ہی تو ہے، وہ خانہ داری اور حاملہ ہونے کا بوجھ کیسے سہہ سکے گی۔ کچھ ہی مہینوں میں شانتا حاملہ ہو گئی، لیکن وہ ماں نہ بن پائی۔ کچی عمر ہونے کے باعث بچہ نہ ٹھہر سکا۔ ڈاکٹروں نے شانتا کی جان تو بچا لی، لیکن اس کی صحت بحال نہ ہو سکی۔

منوہر لال کو اپنی جلد بازی پر رونا آ رہا ہے۔ کاش! وہ دو تین سال تک رک جاتے اور اپنی بیٹی کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے۔

یاد رکھئے، لڑکی کی شادی اٹھارہ برس اور لڑکے کی شادی اکیس برس سے پہلے کرنا ان پر ظلم کرنا ہے۔ انھیں زندگی کی ذمے داریوں کا سامنا کرنے کے قابل بننے کا وقت دیں۔

ڈاکٹر کی صلاح مانئے :

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ لڑکی کے بدن کی نشو و نما 18 برس کی عمر تک ہوتی رہتی ہے۔ وہ 15۔16 سال تک جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور جنسی اعضاء کی نشو و نما 18 برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اگر لڑکی 18 برس سے کم عمر میں ماں بنے تو یہ مشکلات پیش آتی ہیں :

1. لڑکی کے بدن کی نشو و نما رک جاتی ہے۔
2. 18 برس سے کم عمر ماں کی اولاد کمزور اور کم وزن پیدا ہوتی ہے۔
3. ایسی کمزور اور کم وزن اولاد کی اکثر موت ہو جاتی ہے۔
4. کیونکہ 18 برس کی کم عمر میں رحم اور بچہ دانی جیسے بچہ جننے کے کچھ اعضاء کی نشو و نما مکمل نہیں ہوتی، اس لئے حمل اکثر گر جاتا ہے۔ ماں بننے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں۔
5. پیڑو کی نشو و نما 18 سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی۔ اس لئے بچے کا سر بڑا ہو سکتا ہے۔ بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضاء کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے پیشاب یا اوجھڑی میں کمزوری آ جاتی ہے۔
6. کم عمر میں مباشرت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ بھارتی عورتوں میں کینسر کی بڑی وجہ ہے۔

یاد رکھئے : بچی کے بچہ ہونا اس پر بھاری ظلم ہے

اٹھارہ برس سے پہلے لڑکی اور اکیس برس سے کم لڑکے کی شادی قانوناً جرم ہے

مزید معلومات اور بات چیت کا نچے کے لئے اس پتے پر لکھئے : پوسٹ بکس نمبر 2420 ، نئی دہلی 110011

عجاز احمد

انجان مسافر ہوں انجان سا رستہ ہوں
خود ہی میں نہ کھو جاؤں یہ سوچ کے ڈرتا ہوں
پتھر ہوں نہ شیشہ ہوں سورج ہوں نہ سایا ہوں
دنیا کی طرح میں بھی رنگین تماشا ہوں
ہر شاخِ تمنا پہ خاموش اداسی ہے
ہر پھول یہ کہتا ہے کانٹا ہوں میں کانٹا ہوں
معلوم نہیں مجھکو منزل ہے کہاں میری
ہر سمت اندھیرا ہے گرتا ہوں سنبھلتا ہوں
دریا ہوں سمندر ہوں گھنگھور گھٹا ہوں میں
عجاز مگر اب تک صدیوں سے میں پیاسا ہوں

حمید خان حمید

وقت کے ہاتھ میں خنجر کیوں ہے
خون ہی خون سمندر کیوں ہے
پوچھتا پھرتا ہے سب سے مجنوں
آپ کے ہاتھ میں پتھر کیوں ہے
بس یہی فکر ستاتی ہے کہ اب
میرے ہاتھوں میں مرا سر کیوں ہے
ڈوبتے شمس بتا دے مجھکو
قد سے سایہ مرا بڑھ کر کیوں ہے
ایک نعمت ہے مگر پھر بھی حمید
زندگی موت سے بدتر کیوں ہے

عاقل مراد آبادی

آپ کی مرضی یہ ہے اچھا برا کہیے مجھے
سوچ کر لیکن وفا نا آشنا کہیے مجھے
میں نے ہر طوفاں سے پہلے دی ہے طوفاں کی خبر
نا خدا کہیے مجھے یا ناخدا کہیے مجھے
ابتدائے دو جہاں ہے دوستو میرا وجود
رونقِ کون و مکاں کی انتہا کہیے مجھے
بڑھ گئی ہیں اس قدر اب کفر کی تاریکیاں
ماہ کا پتھر بھی کہتا ہے خدا کہیے مجھے
میری فطرت ہے جھکاؤں سر خدا کے سامنے
الغرض عاقل نہیں کہ پارسا کہیے مجھے

۱۰۶

جبار عنبر — انچوی

کیا بر سر ہوں کیوں سخت جاں نظر آؤں
سایہ رہ کے بھی کیوں آسماں نظر آؤں
نہ میں تو کبھی سرپھروں کی صحبت میں
کیوں کسی کو یہاں سرگراں نظر آؤں
کہے کہ وہ جب آئیں سیرِ گلشن کو
نو بہاروں کا خشک سا سائباں نظر آؤں
ان کے سامنے جاؤں تو اے دلِ مضطر
سے بات کروں بے زباں نظر آؤں
ساحر لعینوں کو اپنے ہمیشہ میداں میں
تا تیز کر کے کشتی کماں نظر آؤں

انصار الحق مشتاق ڈھنگوی

کچھ ادھر لٹ گیا کچھ ادھر لٹ گیا
جادۂ غم میں زادِ سفر لٹ گیا
اپنے کنبہ کے ہمراہ کل رات کو
اک مسافر سرِ رہگزر لٹ گیا
عید کا دن بھی تھا کتنا منحوس دن
عید کے دن ہی شہرِ جگر لٹ گیا
ایک ڈائن کی جادوگری دیکھیے
اک اشارہ کیا اور نگر لٹ گیا
تیرا مشتاق کوئی غزل کیا کہے
جب گلستانِ فکر و نظر لٹ گیا

سر آکن اعظمی

کس طرح حافظے میں ترے میں سماؤنگا
جس حال میں رہوں گا تجھے یاد آؤنگا
کم تیرے حوصلے سے مرا حوصلہ نہیں
تو آزما وفا میں جفا آزماؤنگا
فطرت ہے میری موجِ حوادث سے کھیلنا
بجلی جہاں گرے گی نشیمن بناؤنگا
طوفان میں چلاؤں گا کشتی خلوص کی
تاریکیوں میں شمعِ محبت جلاؤں گا
میری نظر بلند ہے فطرت ہے صلح جو
ہر مدعی کو راز میں نیچا دکھاؤنگا

میکسٹون

ہر موسم میں گھر بھر کے لئے یکساں
طور پر مفید جنرل ٹانک

بالک جیون

بچوں کی صحیح نشو نما اور
تندرستی کے لئے

جربول

اگر آپ خارش سے پریشان ہیں اور راتوں میں نیند حرام ہے
تو صرف دو تین بار کی مالش سے آرام
ہو جاتا ہے

موتی منجن

دانتوں کو صاف اور چمکدار بناتا
ہے۔ پائیریا کا دشمن ہے

اکسیر صدر

نزلہ، زکام اور کھانسی
کی بہترین دوا

نیشنل دواخانہ ۱۶۱ رابندر سرانی۔ کلکتہ ۱۳

پاکستان سے

بابر ایاز

"ترے ہونٹوں کی سرخی کی چاہ میں ہم"

"کھٹ" کی آواز کے ساتھ زندگی اور موت کے درمیان نازک رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس کی زندگی بجلی کی لہر کی طرح جغرافیائی سرحدوں کو توڑتی ہوئی دنیا بھر میں پھیل گئی اور موت کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کا جسم جس کو قید کر کے وہ خوش تھے اب دار کی رسی سے جھول رہا تھا۔ اس کا کالا رنگ جس سے ان کو نفرت تھی اور کالا ہو گیا تھا جیسے ان کا مذاق اڑا رہا ہو، اور سفید چمکدار آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی تھیں جیسے وہ نسل پرست جیلر کو گھور رہا ہو۔ بھاری بھرکم جیلر جو اس کی پھانسی کے آرڈر سے پرجوش ہو اٹھا تھا، اب یوں محسوس کر رہا تھا جیسے مرحوم سیاہ فام شاعر کی آنکھوں سے شعاعیں سی نکل رہی ہوں جو اسے تھوڑی دیر میں جلا کر راکھ کر دیں گی۔ جیسے ہی ڈاکٹر نے شاعر کی موت کی تصدیق کر دی، جیلر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کی لاش کو جیل کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے اور تیزی سے اپنے دفتر کی طرف چل دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، ان افریقیوں کو ان کے ہیروؤں کی لاشیں دینا بیکار ہے۔ کمبخت مرنے والے کو دیوتا سمجھتے ہیں اس کی لاش کا سیاسی جلوس بنا ڈالتے ہیں اور بجائے مرنے والے کے غم سے ڈوبنے کے مزید ہنگامے شروع کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی شاعر کے بلیک وارنٹ کے ساتھ اس کو یہ حکم ملا تھا کہ اس کی موت کے بعد لاش لواحقین کے حوالے نہ کی جائے کیونکہ انتظامیہ سمجھتی ہے کہ یہ شخص زندگی میں تو خطرناک تھا ہی مر کر بھی چین نہ لے گا۔

شاعر اور اس کے ساتھیوں کے پھانسی کا حکم نامہ ملتے ہی جیلر نے اپنے ماتحت ولسن سے کہا تھا، چلو اچھا ہوا، اس طرح جیل میں کچھ لوگوں کی کمی تو ہو جائے گی۔ دراصل گذشتہ کچھ دنوں سے ملک میں نسل پرست حکومت سے آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا لیا تھا جس کی وجہ سے جیلیں اتنی تیزی سے بھر رہی تھیں کہ اس میں چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا تھا اور کبھی آزادی کہاں قید ہو سکتی ہے منہ چلتے اندر نہ باہر، یہی وجہ تھی کہ جیلر کو اس جیل میں اب اور قیدی رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب بھی کوئی قیدی کم ہوتا تھا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا۔ جیل نسل پرست حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والے کم عمر لڑکوں سے لے کر انتہائی بوڑھے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ جو بوڑھے تھے تو ایسے تھے جو اپنی نوجوانی میں کالونی نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کر چکے تھے اور اس میں یہ بڑے ہو گئے تھے اور جیل ہی میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ انسانی حقوق کے علمبردار ان لوگوں کو بھول چکے تھے مگر ایسے لوگوں کو یاد رکھنے کی ضرورت

بھی کیا تھی۔ جو اس قدر سادہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال اس ملک کو چلانا جنگلی افریقیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس ملک کی معیشت کوئی بچوں کا کھیل تو تھی نہیں کہ جسے ان افریقی قوم پرستوں کے حوالے کر دیا جاتا جو اشتراکیوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو سزا دی جائے کم ہے جو احسان فراموش ہیں۔ جن کو یہ احساس نہیں کہ بیچارے برطانوی سرمایہ داروں نے ان کے ملک میں ۱۴ ارب پونڈ کی سرمایہ کاری کی ہے، آخر اس سرمائے کا کیا ہوگا۔ ایسے لوگ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہوتے جو غریبوں کی بات تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ نسل پرست حکومت کے خاتمے سے انسانی حقوق کی علمبردار امریکہ کے ساٹھ لاکھ مزدور بیروزگار ہو جائیں گے اور بیچارے صنعت کار جو سستے داموں خام مال خرید کر امریکہ میں اپنی صنعت چلا رہے ہیں۔ دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ نسل پرست حکومت ان لوگوں کو جیلوں سے چھوڑ کر اپنی مصیبتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے شرپسند کالے لوگوں نے کم مصیبت نہیں اٹھا رکھی تھی۔ آئے دن جلوس نکالتے، سفید فام شرفاء کی بستی میں گھس آتے، اس کے علاوہ اب تو یہ لوگ دہشت پسندی پر اتر آئے تھے۔ سفید فام جیلر کچھ دنوں سے سوچنے لگا تھا کہ کاش ہوا پوکے ان دہشت گردوں کو امریکی جہاز ہائی جیک کر لیں۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ جب پوری قوم اپنی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھالے تو پھر کوئی مائی کا لال اسے ہائی جیک نہیں کر سکتا۔ اس سچائی کا علم نوجوان شاعر کو اپنی جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔ اس نے سونے کی کان میں کام کرنے والے ایک مزدور کے تاریک اور سیلے ہوئے گھر میں جنم لیا تھا جب وہ دو سال کا تھا اس کا باپ مزدوروں کے جلسے میں شرکت کیلئے گھر سے گیا تھا مگر پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا تھا اس کی ماں نے ایک فیکٹری میں کام کر کے اس کو تھوڑی بہت تعلیم دلوائی تھی مگر اس کی اصل درسگاہ شہر کی وہ سڑکیں تھیں جہاں اور نوجوانوں کے خون سے ایک نئی تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ اس کے حساس دل و ذہن میں ہر وقت طوفان سا اٹھتا تھا۔ اس کا شعور افریقہ کی زرخیز مٹی میں اگنے والے اونچے درختوں کی طرح اس سے بہت پہلے ہی جوان ہو گیا تھا۔ اسے ایسے لوگوں سے بے پناہ محبت تھی جب کوئی ہم وطن سڑکوں پر مظاہرہ کرتے ہوئے نسل پرست فوجیوں کی گولی سے مارا جاتا۔ تو اس کو ایسا لگتا کہ وہ خود مارا گیا ہو۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی اور اس کی شاعری میں نرمی کے ساتھ عزم کے بارود کی بو بھی تیز ہو جاتی۔ اور جب بھی اسے خبر ملتی کہ آزادی کے لئے لڑنے والوں نے نسل پرست فوج کو بھاری نقصان پہنچایا ہے تو وہ خوشی سے بدمست ہو جاتا اور اونچی آواز میں آزادی کے نغمے گانے لگتا۔ اپنے دوستوں میں وہ اپنی شاعری کے لئے مشہور تھا۔ وہ رات دیر تک اس کی شاعری سنتے اور یاد کرتے، پھر اسی دوران اس کے بچپن کے دوست نے جو کچھ دنوں سے روپوشی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا تھا۔ اور بہت مطمئن اور مسرور نظر آتا تھا اس سے کہا تھا اگر تم ملک کی آزادی چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ مل کر کام کرو۔ یوں تنہا تم نسل پرست حکومت، اس کے حواریوں اور پشت پناہ سامراجیوں سے نہ لڑ سکو گے۔ نوجوان شاعر جس کا واحد ہتھیار اس کی شاعری تھا یہ نہ سمجھ سکا کہ آخر وہ ان لوگوں کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے اس نے اپنے سے کہا تھا "میں شاعر ہوں، میرا کام لوگوں میں آزادی اور انسانوں کے لئے محبت پیدا کرنا ہے۔ میں نفرت کی یہ جنگ کیسے لڑ سکوں گا" تب اس کے دوست نے اسے سمجھایا تھا۔

"ہمیں سفید فام نسل سے نہیں لڑنا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے کہ وہ سفید فام مزدور جو دنیا بھر کے ممالک میں ہماری جدوجہد کی حمایت کر رہے ہیں ہمارے ساتھی ہیں۔ ہماری لڑائی تو ان نسل پرستوں اور ان کے آقاؤں سے ہے جو ہمیں اپنے کتوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں اور دن رات جونک کی طرح ہم سب کا خون چوس رہے

ہیں۔ زندگی اور زندگی کی خوبصورتی کے قاتلوں سے لڑائی، محبت لڑائی ہے اس کا دوست جب یہ کہتے کہتے رک گیا تو اسے یوں تھا جیسے زندگی اور محبت سے بھرپور نظم سناتے سناتے وہ بیان میں رک گیا ہو۔ اس نے کہا تھا "تم چپ کیوں ہو گئے، یوں لگ رہا ہے تم میرے نغموں کو معنی دے رہے ہو" اس کے ست نے کہا تھا۔ یہ لوگ ہمیں حقیر سمجھتے ہیں اور خود کو عظیم، مگر ب ہم حکومت حاصل کر لیں گے، تو ان کو برابری کے حقوق دیں ے پھر معلوم ہوگا کہ انسانی حقوق کے علمبردار یہ سرمایہ دار ہوتے یا ہم مزدور۔ اپنے دوست کی باتیں سننے کے بعد اس کی سمجھ میں یا تھا کہ اس کا کام چند اشعار لکھنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ جس ادی کا وہ طلبگار ہے وہ اس سے عمل کی قیمت مانگتی ہے اور تب اس نے اپنا قلم جیب میں رکھ کر بندوق اٹھالی تھی، اس دن کے ے وہ دن کی روشنی میں شعر لکھتا اور رات کے اندھیرے میں ے عمل کی روشنی حاصل کرتا۔ پھر ایک دن وہ اور اسکے ساتھی ندی کے پہلے پہر ایک پل پار کر رہے تھے تو اچانک انہیں نسل ست فوج کا ایک سپاہی آتا دکھائی دیا، وہ اور اس کے ساتھی ر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جب بھی وہ جنگلوں میں کہیں چھپ ر لڑتے تو یہ جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔ وہ سوچتا تھا یہ وطن پر جنگل آزادی کے متوالے بیٹوں کو کس طرح اپنی گود میں سمیٹ لیں۔ اس نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تھا ان کی طرف والا نسل پرست فوج کا سپاہی بھی افریقی تھا، اس کے دل میں آیا تھا میں اپنے ہم وطن کو نہیں مار سکتا مگر دوسرے ہی لمحے میں اسکے احساس کو دبا کر اس نے سوچا تھا کہ غداروں سے ہمدردی ہاں جا سکتی، جیسے جھاڑیوں کی طرف ہونا چاہئے تھا اسے اس طرف لا سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور پل کے اس پار جانے کیلئے ہزاروں ں کی بہتر زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ راستے میں حائل والوں کو ہٹا لیا جائے، اتنے میں اس کا ساتھی سنتری پر فائر کھول چکا تھا۔ رات کے سناٹے میں کلاشنکوف کی آواز گونجی اور چند پونڈ کے عوض بکنے والا ڈھیر ہو گیا۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے مگر جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ نسل پرست فوجی انہیں چاروں طرف سے گھیر چکے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ افریقی سپاہی کو تو انھوں نے قربانی کے بکرے کی جگہ استعمال کیا تھا۔ جیسے مچان پر بیٹھا شکاری شیر کے شکار کیلئے درخت سے باندھ دیتا ہے۔

گرفتار ہوتے ہی انھیں اذیت خانے لے جایا گیا جہاں پولس کے اعلیٰ افسران دوسرے مجاہدوں کے بارے میں پوچھتے رہے مگر جب بہت دنوں کی کوشش کے بعد بھی ان کی ہمتوں کے زرہ بکتر میں شگاف نہ ڈال سکے تو انہیں جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جب عدالت میں مقدمہ شروع ہوا تو اس نے کہا:۔

"اس سنتری کو میں نے نہیں مارا.....
ہاں مگر میں اس کو مار سکتا تھا، کیوں کہ وہ
اندھیروں کا محافظ تھا اور میں آزادی کی
صبح کا۔"

نسل پرست جج کے لئے یہ اعتراف ہی کافی تھا لہٰذا اس نے نوجوان شاعر اور اس کے ساتھی کو فوراً موت کی سزا سنا دی۔

سزا سن کر شاعر اور اس کے ساتھی کو کچھ دکھ نہ ہوا تھا، بلکہ ان دونوں نے نسل پرست حکومت کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان کے چہرے کی سیاہی کچھ اس طرح دمک اٹھی تھی جیسے ان کے من میں بہت سی قندیلیں ایک ساتھ روشن ہو گئی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں وہ چمک آ گئی کہ ان سے آنکھ ملانا اب ہر ایک کے لئے ممکن نہ تھا۔ اور پھر جیل میں اس کی دوستی ایک گورے کلرک سے ہو گئی۔ کلرک کی عمر اس سے بھی کم تھی اور وہ ہر وقت بیزار سا رہتا تھا۔ اس نوجوان کلرک نے اسے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی اپنے ملک آسٹریلیا واپس چلا جائے گا۔

شاعر نے اس سے پوچھا تھا جب واپس ہی جانا تھا تو نسل پرستوں کی نوکری کیوں کی۔ اسمتھ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اور اس کے ایک دوست نے بیروزگاری سے تنگ آ کر نسل پرستوں کی نوکری کر لی تھی۔ ہمیں کالے لوگوں سے کوئی نفرت نہ تھی۔ بہت سے کالے لوگ تو ہمارے دوست تھے، ہمارے ساتھ ایک کرکٹ ٹیم میں کھیلتے تھے۔ ہم تو بس پیسے بنانے کے لئے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف چلے آئے تھے۔ مگر یہاں آ کر ہر روز احساس ہونے لگا کہ ہم ایک غلط لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اور پھر ہنری میرا دوست، میرے بچپن کا ساتھی میری محبتوں کا رازدار اس لڑائی میں مارا گیا۔ اسمتھ یہ کہتے کہتے رک گیا تھا اور پھر اس نے جیب سے ایک کاغذ جس میں لفظوں کے ساتھ ساتھ ہنری کی یاد میں بہائے ہوئے آنسو بھی تھے شاعر کو دے دیا تھا۔ اس کاغذ پر اسمتھ کی وہ نظم لکھی تھی، شاعر نے پڑھنا شروع کیا۔

گورے لڑکے مر رہے ہیں
جنوبی افریقہ کے سرحدوں پر
ایسی جنگ میں جو اُن کی نہیں ہے
گورے لڑکے مر رہے ہیں
جوانی کی بہاروں میں
اور ان کو لڑوانے والے بون، لندن اور
واشنگٹن میں
ان کے خون کے جام پی رہے ہیں
ان کے جوان بے داغ جسموں پر ناچ
رہے ہیں۔
گورے لڑکوں کی مائیں ماتم کر رہی ہیں
اپنے بیٹوں کی جوان موت پر
ان بیٹوں کی ناگہانی موت پر
جن کی لاشوں کو کفن نہیں ملے ہیں۔
جن کے جسم کے اعضاء بکھرے پڑے ہیں
افریقہ کے جنگلوں میں
گلیوں اور کوچوں میں
پرائی دھرتی پر
پرائی جنگ میں
اس جنگ میں جو اُن کی نہیں ہے
اس جنگ میں جو موت کو زندہ رکھنے کے
لئے ہے۔

شاعر کی آنکھیں پہلی بار یہ نظم پڑھ کر اپنے دشمنوں کی [illegible] پر بھر آئی تھیں۔ آخر تو وہ شاعر تھا۔ شاعر تو نازک احساسات خوبصورتی اور محبتوں کی مالا پروتے ہیں۔ تب اس نے اپنی آخری نظم لکھی تھی اور اسمتھ کو دے کر کہا تھا جب اپنے ملک واپس جاؤ گے تو اپنے دوستوں کو یہ سنانا۔

اگر تم نے ہمارے بچے دیکھے ہوتے
گولیوں سے چھلنی، گیس سے دم گھٹتے اور
زخم خوردہ
پتھروں اور لاٹھیوں سے لیس
اپنے ہی شہر کی سڑکوں پر جان دیتے
اپنے لہو سے دھرتی کو زرخیز کرتے
تاکہ آزادی کے سرخ گلاب کھل اٹھیں
زندگی کے گیت سب گنگنا اٹھیں
تو جان جاتے، ہم کیوں لڑتے ہیں۔

اور پھر جب شاعر کو پھانسی ہوئی تو رات کا پچھلا پہر تھا، ہلکی ہلکی روشنی دبے قدموں پھیل رہی تھی، جیسے اپنے محبوب شاعر کی نیند میں خلل نہ ڈالنا چاہتی ہو۔ چاروں طرف سکوت، ایسا سکوت کہ جیل کا دم گھٹنے لگا۔ وہ صبح ہونا تھا یہ سکوت باغی شاعر کے نغموں سے بھی خطرناک ہے لیکن سکوت ٹوٹا

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

اسٹامپ کلکشن

مانک ٹالا

کسی زمانے میں ہمارے داداجان کا ساہوکارا کافی دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا ہم نے انہیں عسرت کی زندگی ہی بسر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بہت سی اسامیاں ڈوب چکی تھیں اور بہت سی ڈوب رہی تھیں۔ ویسے تو کچھ کھیت بھی ان کی ملکیت تھے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ کھیت ان کے اپنے تھے یا نادہند قرض داروں سے اپنے نام کرالئے تھے۔ ہمیں تو بس اسی قدر یاد ہے کہ مرچوں کی فصل میں دھوپ میں سکھانے کے لئے ہمارے، ہمارے تاؤ اور چچا کے مکانوں کے کوٹھوں پر مرچیں پھیلادی جاتی تھیں۔ جب مرچیں دھوپ میں سوکھ کر سرخ ہو جاتیں تو داداجان کے کارندے انہیں اکٹھا کر کے بوریاں بھر کر لے جاتے۔ بہرحال ان مرچوں کے کارن ہمارے بچپن کے معمولات میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی تھی۔ آنکھ مچولی اور بچپن کے دیگر کھیل ہم ان ہی مرچوں کو روند کر کھیلتے رہتے۔

کبھی کبھار اس مقصد کے لئے کپاس بھی آجاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ مرچوں اور کپاس کی فصلیں غائب ہونا شروع ہو گئیں۔ فصلوں کے بجائے نادہند قرض داروں کی کھیپ لگنا شروع ہو گئی تھی۔ آخر آخر میں کافی خستہ حالت میں دل کا دورہ پڑنے کے باعث داداجان رحلت فرما گئے۔

میرے والد چونکہ وکیل تھے اس لئے داداجان کی وفات کے بعد سارے پرونوٹ ہمارے گھر میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ بہی کھاتوں کا تو ہمیں علم نہیں لیکن پرونوٹ چار پانچ بوریوں میں بھر کر آئے تھے اور یہ سب پرونوٹ ہمارے گھر کی پرچھتی پر پڑی رہتی تھیں۔

والد صاحب کی وکالت بھی نئی نئی تھی۔ ان پرنوٹوں کی مہربانی سے انہیں تجربہ کاری اور پختہ کاری کے ساتھ ساتھ مصروفیت کا بہانہ بھی ہاتھ آگیا تھا ورنہ انہیں موکلوں پر رعب جمانے کے لئے خواہ مخواہ کی اداکاری کرنا پڑتی۔

حسب توفیق انہوں نے چند ایک اسامیوں پر مقدمے بھی دائر کئے۔ حسب توفیق اس لئے کہ مقدمہ دائر کرنے کے لئے کورٹ فیس وغیرہ قسم کے اخراجات تو پیشگی ہی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ان مقدمات کے نتیجے میں ان کے پلے کیا پڑا اس کا تو ہمیں علم نہیں ہے۔ البتہ والد صاحب

مجھے چند ایک قرض داروں کے ہاں مہینے میں دو چار مرتبہ باری باری اپنی ڈوبی ہوئی رقوم کی اگراہی کے لئے ارسال فرما دیا کرتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر مجھے بیرنگ ہی واپس آنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ جب نیتوں میں فتور آجائے تو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اس نیک کام کے لئے اکثر و بیشتر میری ہی آنریری خدمات کا استحصال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ہمارے باقی بھائی کان لپیٹ کر ادھر اُدھر کھسک جاتے تھے۔ ان قرض داروں میں سے چند ایک کی یاد اب بھی ذہن کے نہاں خانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

ایک صاحب مشہور کانگریسی اور ترقی پسند لیڈر اور بہت بڑے زمیندار میاں افتخار الدین عرف میاں کھارا کے کارندے تھے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرنے اور لمبے چوڑے وعدے فرمانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ لیکن لینے دینے کے سر میں خاک ڈالتے رہتے تھے تاکہ محبّت کی پاکیزگی میں میل نہ آجائے۔

دوسرے حضرت ہمیں انجیروں اور شہتوتوں کے موسم میں تازہ بہ تازہ انجیریں اور شہتوت توڑ کر گھر لے جانے کی دعوت دے جایا کرتے تھے۔ یہ انجیریں اور شہتوت ہمیں مول کے کھاتے میں ملتی تھیں یا بیاج کے حساب میں، اس کا تو ہمیں علم نہیں ہے۔ بہرحال واپسی پر آدھی سے زیادہ انجیریں اور شہتوت ہماری توند کی نغار میں پہنچ جاتے تھے۔ اس ضیافت کے انتظار میں ہم سال بھر آتشِ شوق بھڑکاتے رہتے تھے۔

ایک محترمہ تھیں، مائی مریم۔ ان کے کھیت ہمارے قصبے سے کافی دور تھے۔ اور ان کے حریمِ ناز تک پہنچنے کے لئے ایک کھٹارا سی جاپانی سائیکل ہمارے ہاتھوں میں تھما دی جاتی۔ راستے میں عموماً اس کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ورنہ چین (CHAIN) تو ضرور دغا دے جاتی۔ کبھی کبھی طبیعت موڈ میں نہ ہوتی تو ہم خود ہی ٹائر پنکچر کر لیتے

بہرحال مائی مریم کے کھیتوں پر جانے کے سوا مفر نہیں تھا۔ لیکن وہ بھی ہمیشہ محبوب کے وعدے ہی ہاتھ میں تھماتی رہیں۔ کبھی نقدی یا فصل میں حصّے کا وصال نصیب نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ انجیروں یا شہتوتوں کے دیدار سے بھی فیض یاب نہ فرماتی تھیں۔

مائی مریم بیوہ تھیں۔ اپنے میاں کی رحلت کے بعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے چولہا چوکا چھوڑ کر ہل اور بیل سنبھال کر اپنے مرحوم میاں کے کھیتوں کو ہرا بھرا رکھنے کا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ مردوں کی طرح لمبی تڑنگی چھے فٹی عورت تھیں۔ عمر ڈھل چلی تھی پھر بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کھنڈر عظیم الشان رہا ہوگا۔

پس جب بھی ان کے کھیتوں میں پہنچتا وہ آم کے درخت کے نیچے اپنے چار چھ کارندوں کے ساتھ نصف دائرہ بنائے حقّے کے کش لیتی نظر آتیں۔ حقّے کی گڑگڑ اور تمباکو کے دھوئیں کے درمیان باتوں ہی باتوں میں اگلی پیشی کی تاریخ سنا کر ہمیں ٹرخا کر واپس ارسال فرما دیا جاتا۔

ایک مرتبہ والد صاحب بھی ایک نادہندہ آسامی سے قرض وصولنے گئے تھے۔ فاصلہ طویل تھا اس لئے تانگے میں بیٹھ کر اپنے ایک کارندے کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر سر کے دو ٹکڑے کرا آئے تھے۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سر تربوز کی طرح دو پھاڑ نہیں ہوا تھا ورنہ بچپن ہی میں ہمارے چہرے پر "یتامت" کا داغ لگ جاتا۔ دس پندرہ ٹانکے لگانے کے بعد پھر سے نادہند آسامیوں کے خلاف مقدمے دائر کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ ورنہ ہماری انجیروں اور شہتوتوں کی سالانہ ضیافت بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

اس اثنا میں کلکتہ سے ہمارے پھوپھی زاد بھائی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے ہمارے ہاں تشریف لے آئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اس لئے تحفے کے طور پر ہمارے لئے اسٹامپ البم اور مختلف ممالک کی استعمال شدہ ٹکٹیں بھی لائے تھے۔ تصویروں کے البم کے بارے میں تو ہم نے سنا ہوا تھا لیکن ٹکٹوں کے البم والی بات بالکل نئی تھی۔ ہمارا قصبہ شہر لاہور سے صرف پانچ میل کی دوری پر تھا۔ شہر میں کئی رشتہ داریاں بھی تھیں لیکن کسی پھوپھی، ماسی یا مامی کے لڑکوں میں اسٹامپ کلکشن کی ہابی (HOBBY) نہیں تھی۔ یہ ہابی ہمیں واقعی دلچسپ لگی۔ دور دراز کے ملکوں کی جتنی ٹکٹیں اس نے ہمیں تحفے کے طور پر دی تھیں ہم نے ساری کی ساری البم میں چسپاں کر دیں۔ اس کے باوجود البم آدھی سے زیادہ خالی پڑی رہ گئی ہم نے دیسی ڈاک میں آئی چٹھیوں سے ٹکٹ اتار اتار کر البم میں لگانا شروع کر دیا۔ لیکن ہمیں اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ اپنے ملک کی ٹکٹوں کی وہ قدر و قیمت نہیں ہوتی جو غیر ممالک کی ٹکٹوں کی ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح پاکستان کا ادیب اور شاعر جب تک ایک مرتبہ بھارت کی زیارت نہ کر لے اور بھارت کا ادیب واہگا کی سرحد کو سلام نہ کر آئے تو اُسے اپنے ہم عصروں میں مستند تسلیم نہیں کیا جاتا۔

البم ابھی بھی بہت خالی پڑی تھی۔ ہماری متعدد یاد دہانیوں کے باوجود ہماری پھوپھی کے لڑکے نے ہمیں غیر ممالک کی ٹکٹوں کا نیا اسٹاک ارسال نہیں کیا تھا۔ ادھر ہمارے سمند شوق کو مہمیز لگ چکی تھی اور ہم بحر ظلمات میں کود پڑنے کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔

ہم نے پرچھتی پر چڑھ کر دادا جان کی بوریوں میں تانک جھانک شروع کر دی ان میں اسٹاموں پر قرار داد کے نیچے روپے کی وصولی کی شہادت کے طور پر ٹکٹوں پہ دستخط یا نشان انگوٹھا لگا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں رسیدی ٹکٹیں الگ سے نہیں ہوتی تھیں بلکہ پوسٹیج کی ٹکٹوں کو ہی رسیدی ٹکٹوں کے طور پر استعمال کر لیا جاتا تھا۔ ان اسٹامپ کے کاغذوں پر ہمیں گنجے جارج بلکہ ملکہ وکٹوریہ کی بھی ٹکٹیں نظر آئیں تو ہم جامے میں پھولے نہ سمائے۔ کچھ ٹکٹیں تو آسانی سے اکھڑ گئیں اور کچھ ایسی اکھڑ ثابت ہوئیں کہ اکھڑنے کو تیار نہ ہوئیں چنانچہ وہ پھٹ پھٹا گئیں۔ ہمارے اسٹامپ کلکشن کے جنون کا یہ عالم تھا کہ ہم نے پرونوٹ پر چھپے ہوئے مستطیل ٹکٹ بھی کاٹ لئے۔ اور البم میں چسپاں کر لئے۔

کافی عرصہ بعد ہمیں اپنی اس حماقت کا احساس ہوا تو ہم اپنی البم ادھر ادھر چھپاتے پھرتے کہ یہ کہیں والد صاحب کے ہتھے نہ چڑھ جائے اور نوبت ہماری تاجپوشی تک نہ پہنچ جائے۔

کچھ عرصہ بعد اخباروں میں یہ خبریں آنے لگیں کہ سر سکندر حیات خاں کی منسٹری ایک قانون پاس کرنے جا رہی ہے جس کے تحت جن زمینداروں، کسانوں وغیرہ کی زراعتی زمینیں سیٹھ ساہوکاروں کے پاس گروی پڑی ہیں وہ زمینیں انہیں بلا معاوضہ واپس مل جائیں گی اور قرضوں کی وصولی کی داد فریاد عدالتوں میں بھی نہیں ہو سکے گی۔

سارے پنجاب میں ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ جگہ جگہ سیٹھ ساہوکاروں کے جلسے ہونے لگے۔ ہمارے مقامی آریہ سماج مندر میں بھی ایک زوردار جلسہ ہوا۔ آریہ سماجی اور سناتن دھرمی سبھی اپنے مذہبی اختلافات مٹا کر ایک منچ پر اکٹھے ہو گئے

اس "کالے" بل کے خلاف ہمارے والد صاحب نے بھی ایک زوردار نظم سنائی تھی۔ اس روز ہمیں پتہ چلا کہ ہم بے پتوار کی ناؤ نہیں ہیں۔ نہ ہی بے جڑ کے پودے ہیں۔ ہمارے ذہن میں جو ادب اور شاعری کا کیڑا رینگ رہا ہے وہ ہمارے ادبی پس منظر اور ماحول کی دین ہے۔ ہمارا ادب اور ادبیات سے یہ لگاؤ ہمیں وراثت میں ملی ہے جیسے ہمارے والد صاحب کو وہ پرونوٹوں کی بوریاں وراثت میں ملی تھیں۔ چنانچہ اب ہم کھل کر سامنے آ گئے اور بے تکی شاعری اور بے مہار افسانوں کی بھرمار کر دی۔ قبلہ والد صاحب نے ہمیں بہت سمجھایا کہ یہ کوئی شریف لوگوں کا پیشہ نہیں ہے لیکن اس جنون کا کیا کیا جائے جس نے رانجھے کو فقیر بنا دیا۔ فرہاد کے ہاتھوں میں تیشہ اور سوہنی کے ہاتھ میں کچا گھڑا تھما دیا تھا۔

لیکن سیٹھ ساہوکاروں کی گھن گرج اور ان تحریکوں کی دھواں دھار کیفیت کے باوجود یہ بل پاس ہو کر رہا۔ اور ساری ساہوکارا برادری میں صف ماتم بچھ گئی ـــ لیکن میں سب سے زیادہ خوش تھا جیسے گم گشتہ جنت ہاتھ لگ گئی ہو۔ کیونکہ اب وہ سب پرونوٹ اور قرضوں کے معاہدے، جن سے میں نے وہ ٹکٹ اکھاڑے اور بگاڑے تھے، اب کالعدم ہو چکے تھے۔ اور مجھے اپنی اسٹامپ البم چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

نئی کتابوں کا تعارف

'ابابیل' (شعری مجموعہ)

تخلیق :- اویس احمد دوراں

تقسیم کار :- جمال اویسی، محلہ فیض اللہ خاں
دربھنگہ (بہار)

" بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۴

قیمت :- ۴۰ روپے (۱۹۸۶ء)

اویس احمد دوراں کا وطن دربھنگہ
ہے۔ لیکن دوراں کی شاعری کو ہندستان گیر شہرت
ہے۔ دوراں ترقی پسند نظریات رکھنے والے شاعر ہیں
انے ترقی پسندوں کے عملی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا
آج جب کہ شعر و ادب خانوں میں تقسیم ہو گئے ہیں لیکن
ں اپنی ہی ڈگر پہ گامزن ہیں، انہوں نے کبھی بھی ذاتی
ت کی خاطر اپنے کو نہیں بیچا، دوسرے ترقی پسند ادیبوں
عروں نے نام و نمود اور ذاتی منافعت کی خاطر اپنے ضمیر
دا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھا۔ دوراں کی اپنی
یت پہاڑ اور سمندر کی علامت بن گئی ہے جس کی بلندی
عت کا اندازہ ان کی شخصیت اور شاعری سے بہ خوبی
لتا ہے۔

" ابابیل" دوراں کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اس سے قبل ان کا مجموعہ کلام "لمحوں کی آواز" کے نام سے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ میں ۲۰ نظمیں (جس میں طویل اور مختصر دونوں ہیں) اور بقیہ غزلیں ہیں۔ مجموعے کی تقریباً سبھی نظمیں اور غزلیں ہندستان کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس مجموعے میں "لمحوں کی آواز کے بعد" کے عنوان سے اویس احمد دوراں نے اپنی شاعری اور زندگی کے کئی گوشوں کو ابھارا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں ان کے نظریات کیا ہیں اور کیوں ہیں اس کی تفصیل بھی درج ہے۔ سہولت کی خاطر اقتباسات نذر قارئین کرتا ہوں۔

" میں تقریباً ۱۹۵۲ء سے شعر کہہ رہا ہوں اور حساب جوڑتا ہوں تو میری شاعری کی عمر ۳۰ سے ۳۴ سال ہو جاتی ہے۔ اس عرصے میں زمانہ پر کئی قیامتیں ٹوٹیں، آفاق گیر سطح پر بے شمار تبدیلیاں ہوئیں ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے جو کبھی خوش آئند نظر آئے، کبھی محیر العقول اور کبھی لرزہ خیز"

" ہمارا پیارا ہندستان اور ہم لوگ گرچہ ۱۹۴۷ء سے آزاد ہیں لیکن ہماری تمام کروٹیں بے چین اور غم آلود ہیں۔"

" میری شاعری میں حزن و یاس کے عنصر کی فراوانی ہے"

دنیا میں پھیل گیا

لیکن جد و جہد کی آواز میری شاعری کی بنیادی آواز ہے"

"میری شاعری تو اس طبقہ کے لئے ہے جس کی خاطر سائنٹیفک سوشلزم کا جدلیاتی اور رجائی فلسفہ معرضِ" میں شعریت "تاثیر اور سوز و گداز کا قائل ہوں، وہ شعر ہی گیا جس کو پڑھ کر روح کی سرشاری کی کیفیت [illegible] مقتل نہ صرف ہندوستان سے باہر سج رہے ہیں بلکہ خود ہندوستان میں قدم قدم پر مقتل کا سماں نظر آتا ہے، ایسے عالم میں ایک حساس شاعر صرف رسیلے اور [illegible] شعر [illegible] کے مطمئن کس طرح ہو سکتا ہے [illegible]

[illegible] متعلق جس سے دوران کی شخصیت اور شاعری [illegible] لیکن ان کی تمام توضیحات [illegible] ہے، اس میں اصطلاحات کی [illegible] ان کی شاعری کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ ان کے نظریے حساسانہ [illegible] نظام [illegible] اس کا عکس ان کی نظموں اور غزلوں [illegible] اس کے علاوہ [illegible] ان کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ [illegible] دوران کی شاعری کو [illegible] واقعات کے [illegible] اور [illegible] چنانچہ ان کی ادبی اور سیاسی [illegible] سیاست کا نہ ختم ہونے والا حصہ ہے۔

دوراں کی شاعری اپنے اندر رجائی پہلو رکھتی ہے گرچہ انھوں نے اپنی شاعری میں چوٹ کھائے اور مظلوم و مقہور انسان کا نوحہ بھی بیان کیا ہے اور یہی ان کی شاعری کا مخصوص حصہ ہے۔

دوراں نڈر، جری اور طبقاتی سیاسی تحریک کے پروردہ ہیں جو ہر انقلاب کی خاطر اپنا خون بھی بہا سکتے ہیں۔ جس شاعر کا عقیدہ اس حد تک پہنچے اور بالیدہ ہو ساتھ میں شاعرانہ اظہار کا ہنر بھی ورثے میں ملا ہو وہ کیسی شاعری کر سکتا ہے اس کا اندازہ لوگ بہ خوبی کر سکتے ہیں ؎

اس طرح شب غم کا تیری یاد کے صدقے کا تق خاتمہ ہوتا
آس ٹوٹتی ہوئی، نبض چھوٹتی ہوئی، چاند ڈوبتا ہوتا

چوٹ کھائے ہوئے انسانو! کہاں ہو آؤ!
میں تمہارے لئے بے چین کھڑا ہوں کب سے
اقلیت [illegible] کی [illegible] منتظر رہتی ہے
[illegible] کے ہزاروں [illegible]
[illegible] خاشاک کی مانند [illegible]
اقلیت جہاں بھی ہے یہی اس کا مقدر ہے
[illegible] بے اماں مخلوق ہر سو [illegible] ہے
[illegible] اے دل یہ غم کی رات [illegible]
(نظم، [illegible])

میرے لبوں پہ نالہ و فریاد کی لے کے عوض [illegible]
[illegible] میں [illegible] / یہ وہ [illegible] ہے جس سے / میرا دشمن [illegible] ہے"
(نظم۔ بھوک مسئلہ کا ترانہ)

میں نے تمام عمر، حیات و کائنات کو/ تمہاری آنکھوں سے دیکھا ہے/ میں نے تمام عمر/ تمہاری زبان میں باتیں کی ہیں/ تمہارے ذہن کی سطح پر آ کر سوچا ہے/ جو شعر تم سمجھ سکو/ وہ شعر کیسے ہیں/ ان میں تمہاری دکھی زندگی کا عکس ہے/ علامتوں/ استعاروں/ اور رمز و کنایہ سے/ دانستہ گریز کیا ہے/ اس لئے کہ تم نہ صرف ملول و غمزدہ ہو/ بلکہ ان پڑھ بھی ہو/ تم رموز و علائم کی زبان سمجھ نہیں سکو گے"

میں نے چکنا چکنا جسم و لہجہ/ کبھی نہیں اپنایا/ اس لئے بلند و قامت نقادوں نے/ میرا ذکر پیلی روشنائی میں کم کیا/ آج کے علامت نگار شاعروں کا/ ڈنکا پیٹنے والے فرماتے ہیں/ میرا لہجہ پرانا ہے/ آج کے نفاست پسند ادیب/ جو بورژوا سماج کے رسیا ہیں/ میری قطعیت سن کر/ اپنے کندھے اچکاتے ہیں/ جانتے ہو غمزدو ؟/ جانتے ہو کیوں ہم اس لئے کہ میں تمہارا شاعر ہوں"

(نظم ، پیلی روشنائی)

مذکورہ نظموں کے حوالے سے دوراں کے شعری [سفر؟] ور کا اندازہ ہوتا ہے، یہ اور اس کے قبیل کی اور بھی [نظ]میں شامل کتاب ہیں مثلاً اکیسویں صدی، ہدایت، [...]ی پود، جستجو، ارتقا، اور کارل مارکس صدی کے [نا]م وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ گلاب کی موت ایک متاثر کن نظم ہے جو دوراں نے اپنے تین سالہ بچے کی موت پر کہی تھی۔

" تین جون چوہتر داغ دے گیا دوراں/ کھو گیا [و]ہ پیکر جو محور تمنا تھا/ اب تو صرف یاد اس کی، بچ گئی ہے سرمایہ/ اب تو ایسا لگتا ہے کوئی خواب دیکھا تھا/ اک مٹی سی قبر اس کی آخری نشانی ہے/ زندگی بتا تیری کیا یہی کہانی ہے "

جو فنکار عصری مسائل اور تقاضوں کو اپنے فن پارے میں ہنرمندانہ طریقے سے برتتا ہے وہ اس قدر کامیاب کہلاتا ہے۔ لیکن آنے والا وقت کن لوگوں کو یاد رکھے گا یہ ایک اہم سوال ہے، دراصل شعر و ادب ایک ایسی وادی ہے جہاں سے گذر کر فنا کے دوام کی منزل پا لیتا ہے۔ اور کبھی کسی پر پیچ راہ میں ہی زندگی ختم ہو جاتی ہے اس لئے قطعی طور پر ان کی شاعری کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے ؟۔ دوراں کی غزلوں سے چند اشعار سے

سب کے ہاتھوں میں جہاں لبریز ساغر آئے گا
تم اس وادی میں ٹھہرو انتظار اس کا کرو

ڈھل چکی دوراں جوانی کی چمکتی دوپہر
اب بھلا پہلو میں میرے کون دلبر آئے گا

پیدا کیا ہے جھوٹے مسیحاؤں نے جسے
اس دور کے شکار ہیں میرے یہاں کے لوگ

حسین رضؓ پیاس سے بے چین ہو رہے ہوں گے
فرات شان رعونت سے بہہ رہا ہوگا

اے غمزدو کی بھیڑ کدھر جا رہے ہو تم
آ جسم انبساط ہے دوراں کی گود میں

ترقی پسند نظریۂ حیات رکھنے کے باوجود دوراں

کی شاعری اردو شعر و ادب کا ایک اہم سرمایہ ہے غزلوں میں الفاظ کے دروبست اور ماورائی سطح پر لفظوں کے تخلیقی استعمال نے ایک حسن پیدا کر دیا ہے۔ دوراں مخصوص لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ترقی پسند نظریۂ حیات میں شعر و ادب کے اس اہم شاعر کو ترقی پسندوں نے وہ مقام نہیں دیا جس کے یہ مستحق ہیں، خواہ ترقی پسندوں نے ان کے ساتھ جو بھی سلوک روا رکھا ہو لیکن ان کے اندر جینیس (G E N I U S) فنکار ہے جو اپنے آپ کو ایک دن منوا ہی لے گا۔

(ماہنامہ سہیل، بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایک ایسا مجموعۂ کلام صنفی شہود پہ آیا ہے جسے پڑھ کر ذہنی بشاشت کا احساس ہوتا ہے۔ قیمت مناسب اور کتابت وطباعت بھی بہتر ہے، یقین ہے شعر و ادب کے قارئین اور شائقین خرید کر مطالعہ کریں گے۔

تبصرہ نگار (قیصر زماں قیس)

سورج مکھی (افسانوی مجموعہ)

تخلیق کار:۔ شام بارک پوری
تقسیم کار:۔ کلچرل اکاڈمی (مرکز) ۱/۲ اقبال روڈ، محمد پور، ڈھاکہ (بنگلہ دیش)
ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ، گیا (بہار)
قیمت:۔ ۳۰ روپے (۱۹۸۶ء)

دنیا کی کسی بھی زندہ زبان کا احساس اور بیدار ادیب اپنے وقت کے سماجی مسائل اور عصری تقا سے ناآشنا نہیں رہ سکتا، چنانچہ اس کلیہ سے شا بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مجموعہ "سورج مکھی" کے تمام عصری مسائل اور تقاضوں کے گرد گھومتے نظر آتے عصری مسائل سے الگ تو نہیں رہ سکتا لیکن ان مسا تقاضوں کو احاطہ کرنے میں وہ کس قدر وسیع نظ ہے اس کا اندازہ بھی فن پارے کے مطالعے سے ا سکتا ہے۔ اس تناظر میں شام کے افسانوں کا کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قرب کے مسائل اور تقاضوں سے نبرد آزما تو ضرور ہ کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر جن حالات وکوائ آج کے انسان دوچار ہیں اس کا بھی احساس ا نگار کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے بین الا منظر کا احاطہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مجمو پہلا افسانہ "تازہ سانسوں کا موسم" جسے پڑھ ک ذہن میں وہاب دانش کا یہ شعر گونجنے لگتا ہے۔

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم

مذکورہ افسانے کا اقتباسات دیکھتے چلیں

"میرے ساتھ چلتے چلتے اچانک وہ ٹھٹھک
تم ان درختوں، پہاڑوں اور جھیلوں میں کیا آئے ہو؟

"میں ایک ادیب ہوں، قدرت کی نیرنگیوں اندوز ہونے نکلا ہوں، گویا زندگی کی ہماہمی اور

فرار ہوکر اس سنسان جگہ پر نروان حاصل کرنے
آئے ہو؟"

آج کا معاشرہ بے یقینی کے دوراہے پر کھڑا
ہے، انسان اتنا مصروف ہوگیا ہے کہ وقت کا پرندہ اس
کے ہاتھوں سے اڑ چکا ہے۔ ہمارے پاس دوسروں کے احساسات و
جذبات سمجھنے کے لئے وقت نہیں، ہم فکر اور تردد سے نڈھال
ہوکر جب سکون کا لحاف اوڑھتے ہیں تو سورج کی پہلی کرن
دیکھنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا۔"

" ہر دور میں ظلم اور ناانصافی کی تاریکی چھاتی ہے
تو کوئی پیغمبر یا رشی منی اپنے ہاتھوں میں نیکی کی شمع جلائے
نمودار ہوتا ہے، ان پیغام باطل کے لئے زہر ہلاہل ثابت
ہوتا ہے، ان کی آدرشش کا نزا ہر سو پھیل جاتا ہے،
جلتی ہوئی آگ میں کود جاؤ تاکہ وہ گلزار بن جائے، یہی
انسان کا امتحان ہے، مصائب، مسائل اور محرومیوں سے
گھبرا کر کہاں کہاں بھاگتے پھروگے، آج یہ علاقہ قدرتی
مناظر کی حسین تصویر پیش کرتا ہے، کل یہاں معدنیات ہوں گی،
کارخانے بنائے جائیں گے، مشینی زندگی یہاں بھی در آئے گی۔
شہروں کی تمام غلاظتیں سمٹ کر یہاں چلی آئے گی
اس کے بعد کیا ہوگا؟"

" آپ کی باتوں سے جیسے میرے چہرے پر بشاشت
پھیل گیا۔ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ میرے
دل میں ایک عجیب سی سرور و انبساط کی کیفیت طاری
تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آسمان کی پرواز سے
میرے پاؤں زمین پر آگئے ہوں۔"

اس افسانے کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔
"جدید انسان کا المیہ صرف یہی نہیں کہ انسان تخریب کے وہ طریقے دریافت
کر لیتے ہیں جو بنی نوع انسان کو آن واحد میں ختم کر سکتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ انسان
انہیں بھوک مٹانے زمین سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور
جلد جلد حاصل کرنے کے خودغرضانہ کھیل میں، اس قدر منہمک
ہے کہ وہ زمین کے وسائل کا ہی خاتم کرنے میں لگ گیا ہے اور
اس کو خبر نہیں کہ جس شاخ پہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو وہ
کاٹ رہا ہے۔"

شام بارک پوری کے اس افسانے میں فطرت کے
المیہ کا دردمند اظہار ہوا ہے۔ یہ افسانہ امید کی ہلکی سی
کرن پر ختم ہوا ہے لہذا افسانہ نگار ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا
بلکہ ہمارے جذبۂ تعمیر کو برانگیخت کرتا ہے۔"
مجموعے میں اٹھارہ افسانے ہیں اور تقریباً سبھی افسانے
اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن چند
افسانے جو قاری کی توجہ کے مرکز ہوسکتے ہیں وہ یہ ہیں: "تازہ
سانسوں کا موسم، روبوٹ، نقطے کا سفر، آواز کا ماتم، ناحل
کا کھیل، ادھوری کہانی کا المیہ، مصلوب روشنی کا نوحہ اور
سورج مکھی وغیرہ۔ افسانہ "روبوٹ" میں انسان کے خیر و شر
کے کشمکش کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ روبوٹ میں
انسانی فطرت کا عکس دیکھ سکتے ہیں، اس افسانے میں علامت
کو شام بارک پوری نے ہنرمندانہ انداز میں برتا ہے۔ صنعتی
اور مشینی دور میں جذبات پر نگاہ رکھنے والے افسانہ نگار
تو ہیں لیکن علامت کو تخلیقی سطح پر برتنے کا ہنر کم کو آتا
ہے اس میں شام کا ایک مخصوص رویہ ہے۔ نقطے کا سفر،
عالمی صورت حال کا رمزیہ اظہار ہے، افریقہ کے سیاہ فام

باشندے مدتوں سے تہذیب یافتہ اقوام کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ لیکن افریقہ کے باشندے آزادی اور عزت کی خاطر سعیٔ پیہم کر رہے ہیں۔ افسانہ "ناول کا کفن" ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا STRACTURE آخر ایسا کیوں ہے؟ افسانے میں یہی ایسا سوالیہ نشان ہے جو قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ "ادھوری کہانی کا المیہ" ایسا افسانہ ہے جو ابتدا سے آج تک لکھا جا رہا ہے اور نہ جانے کب تک لکھا جاتا رہے گا۔ تفصیل سے قطع نظر اقتباس پیش کرتا ہوں۔

" برادر میں بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے، پہلے ہندو مسلم فسادات پر کہانیاں لکھی جاتی رہی تھی اب بہاری بنگالی کے موضوع پر لکھی جا رہی ہیں۔ پہلے مذہب کی بنیاد پہ کہانیاں تخلیق کی گئی تھیں، اب زبان کی بنیاد پر، ان دنوں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان وہی پہلے جیسی سیاسی وحشیانہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ کہانی وہی ہیں، صرف کردار بدل گئے ہیں"

اور آخری افسانہ جس عنوان پر مجموعے کا نام رکھا گیا ہے یعنی "سورج مکھی" افسانے سمندری طوفان کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس قدرتی عذاب پر انسان دوستی کو جس بھرپور انداز میں شام بارک پوری نے پیش کیا ہے وہ قابل ستائش امر ہے۔ میں اپنے خیال سے قطع نظر افسانے کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کا تاثر پیش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

"سورج مکھی" کہانی میں سمندری طوفان ایک علامت بن جاتا ہے۔ نفرت، عداوت، تعصب اور تنگ نظری کا حقیر اور گھناؤنے جذبات کو بہالے جاتا ہے۔ ماریا کے ساتھ بچے بھی اس کہانی میں معصومیت اور دوستی کا اشاریہ بن جاتے ہیں، دراصل اس کی تعبیر و تجسیم ہی کہانی کو ایسا تمثیلی پیکر بخشتی ہے کا آئینہ دار ہے اور اس میں کہانی کار کی کامیابی ہے۔"

شام بارک پوری کے افسانے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عام منظر اور ماحول، کردار کے تو استعمال بہ خوبی طور پر کر سکتے ہیں۔ اور سامنے نئے آدراک پیدا کر کے قاری کے شعور کو برانگیختہ کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خشک سے خشک پر لکھے گئے افسانے بھی ندرت اور بوقلمونی لئے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں ... تر رف ہیں افسانہ نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔

مجموعے میں سبھی افسانوں کے تجزیے بھی میرے خیال میں یہ تجزیہ نہیں بلکہ تاثر ہے اور تاثرات سے قاری کو بصیرت ملتی ہے۔ گیٹ اپ، طباعت اور کاغذ انتہائی نفیس ہے۔ کتاب کا ... شام بارکپوری کی تصویر ہے۔ ۳۰ روپے ہے۔ ہندوستان میں کتاب ادارہ "سہیل" ... کر سکتے ہیں۔

تبصرہ نگار، (قیصر زمان)

تیشے کا سفر (شعری ...)

شاعر:- رضا اشک

تقسیم کار :- سمی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ، سمستی پور
قیمت ۔ ۱۵ روپے (۱۹۸۶ء)

زیر تبصرہ کتاب رضا اشک کا شعری مجموعہ
ہے ۔ رضا اشک سمستی پور (بہار) کے رہنے والے
ہیں ۔ رضا اشک ۱۹۵۸ء سے شاعری کر رہے ہیں ۔
ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے ۔ ان کی نظمیں اور غزلیں
ہندو پاک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں
اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ رضا اشک
نے جس طرح زندگی کو جیا ہے، ان کی من و عن تصویریں
ان کی نظموں اور غزلوں میں نظر آتی ہیں ۔ میرے خیال میں
اشک نظموں کے مخصوص شاعر ہیں اس لئے ان کی غزلیں
بھی غزل مسلسل اور compact نظر آتی ہیں ۔
"شیشے کا سفر" میں کل ۳۶ نظمیں اور باقی غزل ہیں ۔
چند نظموں کے عنوان یہ ہیں : "ایک مانگ کٹی عورت"،
"جمّن میاں کی گھوڑی"، "بازار عورت"، "عورت"، "تم"، "وہ لڑکی"،
"دیوداس کی واپسی" یہ نظمیں عورت کے جبر و استحصال
سے متعلق لکھی گئی ہیں ۔ شاعر نے صنف نازک کو اپنے
مخصوص تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ جہاں
انہوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں وہیں "قتل بہاراں"
"باغی"، "رنگ منچ"، "بچہ اور چاند" کے علاوہ "بہار
اردو اکادمی" جیسی نظمیں لکھی ہیں ۔ ان کی نظم بہار
اردو اکادمی دیکھئے

اگر دولت بھی بٹتی ہے تو کچھ خرچ گدائی ہے /
سنا ہے کہ یہاں ایسے ہی لوگوں کی رسائی ہے / خوشامد
مقدر تا ورثے میں جن کو ہاتھ آئی ہے / کبھی ایک شاعر
خود دار کی غیرت نہیں بٹتی / اور
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا اردو کی خدمت ہے
کہ یہ گہوارۂ دانشوراں بچوں کا مکتب ہے
سیاست کی طرح اس دور میں فن بھی تجارت ہے
لیاقت کی سند اس جا بہر صورت نہیں بٹتی

بھوکی سیتا، ننگی مریم، مردہ گوتم / پارہ پارہ
شیشۂ حرمت / ریزہ ریزہ قصر تمدن / دیکھی دیکھی ان
کا پرچم / "بول کے لب آزاد ہیں تیرے"
(نظم "قتل بہاراں")

یہ بے بس و بیکس و نادار عورت
یہ مجبور و محکوم و لاچار عورت
یہ مردوں کی اک ناز بردار عورت
یہ عصمت کی منڈی یہ بازار عورت
کہاں ہو، کہاں ہو، خریدار عورت
خریدو گے کیسے گنہگار عورت
(بازار عورت)

اس کے علاوہ شاعر نے دعا، وادیٔ کشمیر،
پندرہ اگست، عید اور دیوالی کے عنوانات پر بھی
نظمیں کہی ہیں ۔ یہ نظمیں نظیر اکبر آبادی کی یاد دلاتی ہے
جس طرح نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ہندوستانیت رچ
بس گئی تھی، ٹھیک اسی طرح رضا اشک بھی یہاں کے
آب و ہوا، یہاں کی مٹی، قومی تہوار، اور میلے ٹھیلے

جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن نظیر اکبرآبادی کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ وہ اردو شاعری کے ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جسے اردو شاعری کا ضمیمہ کہا جاتا ہے۔ اور اردو شاعری میں ان کے لئے ایک الگ باب ہی ہے لیکن یہ بات اشک کی شاعری کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ ترقی پسندوں نے اپنے دور اوّل میں جس گھن گرج اور خطیبانہ انداز کی شاعری کی تھی رضا اشک نے اپنی شاعری کے لئے وہی انداز اور رویّہ اپنایا اور یہ فغاں کا اپنا ذہنی رویّہ ہے۔

ان کی غزلوں سے چند اشعار :-

جانے شاعر گمنام کے کل گھر کا پتہ
پوچھتی پھرتی تھی اک شاہد گلفام غزل

کھلے بھی اشک کیا میری حقیقت
خدا کی طرح جھٹلایا گیا ہوں

نفس میں جیسے کوئی باسی گلاب کی خوشبو
اُجڑ گئی سبھی کیاری کیسے سنائیں غزل
ابھی تو اشک ہوا ہے کسی مزار سے کی
فضا میں جنگ ہے جاری کیسے سنائیں غزل

مجھ کو سمجھا گیا دھواں بن کر
غم ہستی کا فلسفہ سگریٹ
کل بصد شوق ہم بھی پیتے تھے
آج خود ہم کو پی گیا سگریٹ

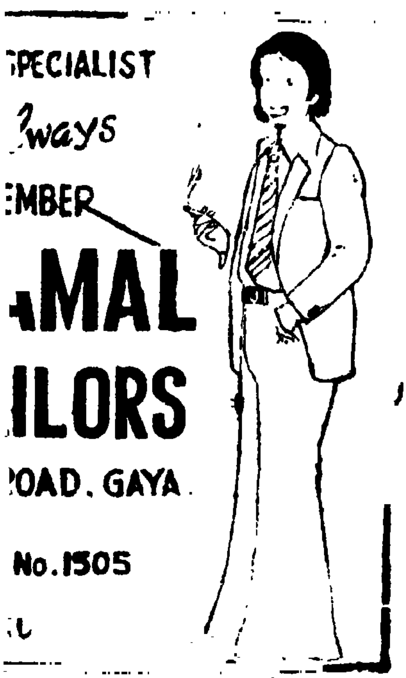
زیست جلتی ہوئی سلائی ہے + موت جیسے بجھا ہوا سگریٹ

اشک کی شاعری ان کے تجربات، مش... کے علاوہ فنی سطح پر بھی کامیاب ہیں۔ "تیشے... فنکار کے مشاہدات اور بدقلمونی جا بجا نظر... اردو شعراء کے مجموعے جس کی کثرت سے ا... پذیر ہو رہے ہیں ان میں رضا اشک کے مجمو... ایک الگ پہچان ہے۔

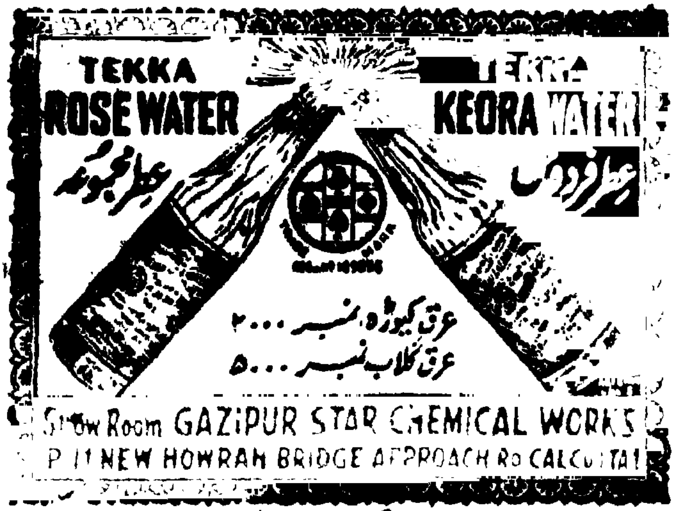
کوہ در کوہ نئی منزل کی تیاری ہے
سالہا سال سے تیشے کا سفر جاری ہے

رضا اشک نے اپنے مجموعے کو دو... اقوال و آرار سے بوجھل نہیں بنایا اور بالکل... ہے۔ ۱۵ روپے قیمت مناسب ہے۔ اردو... کے شائقین کے لئے مطالعے کی چیز بھی۔

(تبصرہ نگار قیصر زما...

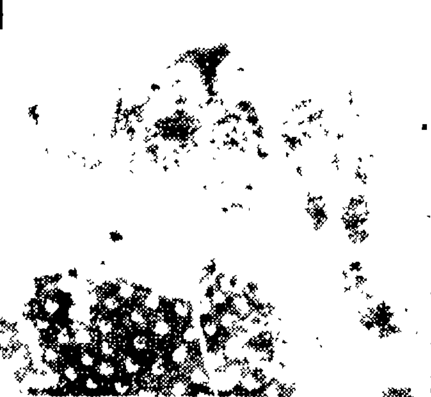



مئو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان
ایس پی مینو فیکچرنگ لائسنس نمبر U18/77 ضرور دیکھیں
کیپسول پر مارکہ دیکھیں
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰
Show Room GAZIPUR STAR CHEMICAL WORKS
P 11 NEW HOWRAH BRIDGE APPROACH Rd CALCUTTA 1


بے مثال واشنگ سوپ
جانِ
صبا
SABA
اچھی دُھلائی، اچھی صفائی کیلئے
ایچ۔ اے۔ بی سوپ ورکس کلکتہ ۹


گھر گھر میں استعمال کیجا رہی
حکیم تلسی پرساد اگروال کی
بال جیون گھٹی
بال جیون گھٹی — بچوں کا میٹھا ٹانک
بچوں کو تندرست بنائے
ہر روز جو انھیں پلائے
ملی لیٹر والے پیک میں
ایک اسپیشل چمچہ







R. N. I. Regd. No.
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
48 years of Publication
Phone : 215

گیا

ماہنامہ

AUG, SEPT '87

Rs. 2.50/-



RADE JRI MARK
ANTA
FOAM
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL-700 046

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ● بیادگار :- زین العابدین احمد وادریس سنسہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

اگست و ستمبر ۱۹۸۷ء

فون نمبر

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر — مجلس مشاورت — شمارہ ۸، ۹ - جلد ۴۹

ایڈیٹر :- جمیل منظر — ڈاکٹر تارا چرن رستوگی — بدل اشتراک فی شمارہ ۲/۵۰

معاونین :- شکیل احمد جمالی — ڈاکٹر قمر رئیس — زرسالانہ ۳۰/=

عبدالقیوم ابدالی — اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر برج پریمی — لائف ممبری ۵۰۱/=

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ سہیل ریورسائیڈ روڈ گیا

کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

آزاد بھارت کے چالیس سال

آزاد بھارت نے گذشتہ چالیس برسوں میں تمام شعبوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔ ہم سب متحد ہو کر [illegible] نصب العین کے حصول کے لئے کام کرتے [illegible] سے بھارت کو ترقی کی بلندیوں پر پہنچائیں گے۔

- ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی سہولیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔
- فولاد کی پیداوار میں نو گنا سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ اور المونیم کی پیداوار تقریباً ستر گنی ہو گئی ہے۔
- خام تیل کی پیداوار [illegible] گنی ہو گئی ہے۔
- کوئلے کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔
- بھارت واحد ترقی پذیر ملک ہے جو اُن سات یا آٹھ ملکوں میں شامل ہے جنہیں نیوکلیائی ایندھن کی مکمل ٹکنالوجی میں مہارت حاصل ہے۔
- بھارت دنیا کا ساتواں ملک ہے جس نے اپنا مصنوعی سیارہ خود اپنے راکٹ سے چھوڑا ہے۔
- آج بھارت کا شمار دنیا کے چوٹی کے دس صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔

ہماری کامیابیاں ایک نظر میں

- ہم اپنی غذا کی ضروریات میں خود کفیل ہو گئے ہیں اناج کی پیداوار تین گنی ہو گئی ہے۔
- ستر فیصد گاؤں میں بجلی لگائی جا چکی ہے۔
- آبپاشی کی سہولیات میں شاندار اضافہ ہوا ہے۔
- کمزور طبقات، بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے خصوصی پروگرام زیر عمل لائے گئے ہیں۔
- صرف گذشتہ چند برسوں میں ہی لگ بھگ دس کروڑ افراد کو خط غربت سے اوپر اٹھایا جا چکا ہے۔
- چیچک اور طاعون کی بیخ کنی کی جا چکی ہے۔ صحت کی سہولیات میں وسیع پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔
- پیدائش پر متوقع اوسط عمر [illegible] سال سے بڑھ کر [illegible] سال ہو گئی ہے۔
- خواندگی کی شرح دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور اسکولوں اور داخلوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن ابھی ہمیں مہاتما گاندھی کا خواب پورا کرنا ہے۔ [illegible] درحقیقت ابھی ہمیں بہت مسافت طے کرنی ہے۔ پھر بھی اس وقت تک ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں [illegible] فخر کر سکتے ہیں

ترقی جو ہمارے لئے قابل فخر ہے

غزل

آسی رام نگری مرحوم

منزل پہ لے کے پہنچے گا عزمِ جواں مجھے
کہہ دو نہ ساتھ لے کے چلے کارواں مجھے

سنتا ہوں پھر چمن میں ہوئی خیمہ زن بہار
آئے نہ کیوں قفس میں بھی یاد آشیاں مجھے

کھویا ہوا ہوں ان کے تصور میں اس طرح
جیسے سنا رہا ہو کوئی داستاں مجھے

یہ جب بھی آئی لائی نوید بہار بھی
پھر کیوں بہار سے نہ ہو پیاری خزاں مجھے

میں ہو گیا ہوں کب سے نشیمن سے بے نیاز
کہہ دے کوئی ڈرائے نہ برقِ تپاں مجھے

اِک وقت تھا چمن کے لئے مر مٹے تھے ہم
رہنے اسی چمن میں نہ دے باغباں مجھے

بہار میں جنگل

● پچھلے سال ۱۱ء۲۷ کروڑ پودے لگائے گئے۔ اس سال ۰۵ء۳۹ کروڑ پودے لگانے کا نشانہ ہے۔

● فیوزمین والے لوگ، چھوٹے کسان اور انوسوچیت ذات اور انوسوچیت جن ذات کے فائدے کے لئے درکھیا پیٹ کا پروگرام لاگو۔ ● ۱۹۸۰ء سے سماجک چھپی پورتی کی رقم کو ۴۰ پیسے سے بڑھا کر ایک روپے ۵۰ پیسے فی پودا کرنے کا فیصلہ

● جنگل کارپوریشن کے ذریعے کیندوپتی کا سرکاری تجارت پورے صوبہ میں ۱۹۸۷ء سے لاگو ● پورے صوبہ میں جنگل سامانوں کا سرکاری دیاپار کا پروگرام شروع ہوا۔

● جنگلی سامانوں پر مشتمل صنعت: لاتے ہار میں جنگل وکاس نگم کے ذریعہ سالونٹ پلانٹ اور ٹینن ایکسٹریکشن پلانٹ، کھونٹی میں آئل ایکسپیلر کا قیام — ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے ۲۲ آرا مشین، ۳ ٹمبر ٹریٹمنٹ پلانٹ کا قیام۔

● بیتلا (پلاموں) دیادھر لوجا نیشنل پارک کا اعلان۔ ● رانچی میں بوٹانیکل گارڈن کے قیام کا کام چالو (رانچی، پٹنہ روڈ پر وکاس ودیالیہ کے نزدیک) میں شروع ● دوسرے ممالک کے نایاب پرندوں کی حفاظت کے لئے کانور جھیل (بیگوسرائے) پروہبیٹڈ ایریا کا اعلان ● جنگلوں کی حفاظت کے لئے اڑن دستہ کا قیام ● ۸۷-۱۹۸۶ء میں جنگل ڈیپارٹمنٹ اور جنگلی سامانوں پر مشتمل صنعت میں کل ملا کر ۹ کروڑ مانو دیوس کے روزگار کا سرجن۔

محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ بہار

کے جاری کردہ

सू० ज० स० पि०-143- ज (सू-75) /87-88

محمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو، اندور

اخترالایمان
سے
ایک طویل انٹرویو

خالد :- اختر صاحب، آپ کا سلسلۂ نسب کیا ہے؟

اخترالایمان :- میرا کوئی سلسلۂ نسب نہیں ہے۔ میرے بزرگ اپنے کو راجپوت کہتے تھے۔ والد مولوی تھے۔ میرے دادا تجارت پیشہ تھے۔ گڑھوال میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ میرے بہت سے عزیز محنت مزدوری بھی کرتے ہیں۔

خالد :- آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

اخترالایمان :- جمعہ ۲ محرم ۱۳۳۴ھ (۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء) قصبہ نجیب آباد (یو۔پی) سے ملا ہوا ایک گاؤں میں۔

خالد :- کیا آپ کا اصلی اور قلمی نام، اخترالایمان ہی ہے؟

اخترالایمان :- اخترالایمان ہی میرا اصلی نام ہے۔ تاریخی نام ہے ۱۳۳۴ھ نام کے اعداد جمع کرنے سے نکل آئے گا

خالد :- آپ کی ایک نظم "میرا نام" بھی تو آپ کے نام کے متعلق ہے اس کی وجۂ تخلیق کیا ہے؟

اخترالایمان :- "میرا نام" مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مجھے بھی نہیں معلوم۔ آل احمد سرور صاحب نے جتنی بتائی وہ یہ ہے کہ مولانا کی نگرانی میں جدید شاعری کی ایک ۱۹۴۱-۴۲ء جلد چھپ رہی تھی۔ بورڈ میں سرور صاحب قادری زور اور احتشام وغیرہ تھے۔ جب میرا نام اس جلد میں شمولیت کے لئے تجویز کیا گیا تو مولانا نے کہا جس شاعر کا نام غلط ہے وہ اچھا شاعر کیسے ہو سکتا ہے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ مولانا عربی کے عالم تھے۔ اخترالایمان کی جگہ نجم الایمان ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ "ال" عربی اور فارسی ناموں کو جوڑنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ سب نے بہت سمجھایا کہ صاحب یہ تو نام ہے، جو اخترالایمان غریب نے خود نہیں رکھا۔ یہ قلمی نام نہیں اس کا اصل نام ہے۔ مگر مولانا اڑ گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتھولوجی نہیں چھپی۔ میں نے یہ نظم کہی اور مولانا کو بھجوانے ہی والا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بھی یہ ان کے نام معنون نہیں کی۔

خالد :- آپ کا سنہ ۱۹۲۲ء-۱۹۳۰ء کا زمانہ دلی کے ایک یتیم خانہ میں گزرا ایسا کیوں ہوا تھا؟

اخترالایمان :- سنہ ۲۲ء سے سنہ ۳۰ء تک میرے چچا نے مجھے وہاں داخل کر دیا تھا۔ اس لیے کہ میں بے انتہا خود سر اور آزاد منش تھا۔

خالد :- آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟

اخترالایمان :- میری ادبی زندگی کا آغاز سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں ہوا تھا۔ ابتدا، غزل سے ہوئی۔ اب اس کا کوئی نمونہ میرے پاس نہیں ہے۔ پہلی کتاب "گرداب" تھی۔ یہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ پہلی تخلیقات تو غزلیں تھیں۔ چھپی نظم تھی "گورغریباں" فتح مسلم ہائی اسکول کے میگزین میں جس کا میں ایڈیٹر بھی تھا۔

خالد :- جب آپ کی پہلی تخلیق شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی تو اس وقت آپ کے احباب، شناسا، اقارب، مدیران اور خود آپ کے کیا تاثرات تھے؟

اخترالایمان :- اسکول کے احباب کی رائے کیا، مگر سب نے تعریف کی تھی یہ سنہ ۳۶ء کا زمانہ تھا۔

خالد :- طالب علمی کے زمانے میں آپ کی ادارت میں میگزین نکلتا ہی تھا اور کن جرائد کے آپ مدیر رہے؟

اخترالایمان :- اینگلو عربک کالج میگزین کا ایک یا دو سال اس کا مدیر رہا۔ ساغر نظامی کے "ایشیا" کی بھی ایک سال ادارت کی ہے۔ بمبئی سے "خیال" نکالا تھا۔ ادارت تو میں نے اور بھی بہت سے پرچوں کی کی تھی

خالد :- کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق کی شانِ نزول پر کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گے؟

اخترالایمان :- نظم "ایک لڑکا" میں پہلی بار موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی، تصویر کی شکل میں دیکھی تھی۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے اس وقت میری عمر تین یا چار سال ہو گی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی پر لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پہ کرب اور بے بسی تھی۔ اس لئے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھا تھا، اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑوں میں نیلوفر اور کنول کھلتے تھے وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں وہاں وہ سب تھا جو مجھے ذہنی طور پر پسند تھا مگر وہ معصوم لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد اس لڑکے کو میں نے اکثر اپنے گرد و پیش میں پایا۔ یہ لڑکا جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا مگر جو آزاد تھا یا آزاد رہنا چاہتا تھا جس کی فطرت اور نیچر دونوں ایک دوسرے سے قریب تھیں جو معصومیت سچائی اور ستھرے پن کا علامیہ تھا جو ملوث نہیں تھا کسی کدورت سے بھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ میں دنیا کی کشمکش میں کھو گیا اور شاعر ہو گیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن [illegible]

استعمال کیوں؟ بظاہر یہ لڑکا اور اپنے نام کے
استعمال والا احساس دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں
مگر دراصل ایک ہیں۔ وہ لڑکا جس کی تصویر میرے ذہن میں
تھی اس کا نام اخترالایمان ہے۔ احساس کی اس دوسری
منزل کے بعد مجھے اس لڑکے کا جگہ جگہ کا سفر یاد آیا۔ یہ
لڑکا خانہ بدوش تھا۔ کوئی اس کا مستقل گھر نہیں تھا۔
اس کے پاس مناسب اسباب معیشت نہیں تھے۔ اس کا
کوئی مستقبل نہیں تھا۔ مجھے اس لڑکے سے ہمدردی ہو گئی۔ یہ
ہمدردی دراصل مجھے اپنے سے تھی مگر چونکہ میں نے اپنے کو
اس لڑکے سے الگ کر لیا تھا اس لئے میری شخصیت دب گئی
اس لڑکے کی شخصیت ابھر آئی۔

تخلیقی عمل کی چوتھی منزل یہ تھی میں نے غیر شعوری
طور پر اس لڑکے کو اپنا ہیرو بنا لیا۔ مجھے اس لڑکے کے دکھوں
اور پریشانیوں سے محبت ہو گئی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا یہ میرا
موضوع ہے۔ میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا
چاہا اور "ایک لڑکا" ضمیر انسانیت کا علامیہ بن گیا۔ یہ
سب خیالات اور احساسات ایک ہی ساتھ ذہن میں
نہیں آئے۔ ایک ایک کر کے آئے۔ اور پھر میں انہیں بھول
گیا۔ دو سال، تین سال، چار سال، قوس و قزح کے سب
رنگ غائب ہو گئے۔ پھر ایک دن، رات کے ایک بجے کے
قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرعہ گونج رہا
تھا۔ مطلع

"یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو"

مجھے معلوم تھا یہ لڑکا کون ہے۔ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی
باز پرس کیوں کر رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری عمل شروع
ہوا۔ معاشرے کی اخلاقی قدروں میں تضاد، معیشت کے
لئے جدوجہد اور قدم قدم پر [illegible] کے ساتھ تعاون،

مذہب کی اندرونی اور بیرونی شکل، ذہن حساب دینے لگا۔
اور مطلب یہ نکلتا تھا، یہ لڑکا جسے میں برسوں سے
جانتا تھا۔ اخترالایمان کی شخصیت دو حصوں
میں تقسیم ہو گئی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا
وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میں نے
نظم کا پہلا بند لکھا اور سو گیا۔

خالد: آپ نے افسانے بھی تو لکھے ہیں؟

اخترالایمان: افسانے اس زمانے کے نمایاں رسائل
ساقی، ہمایوں وغیرہ میں چھپتے تھے۔ پہلا افسانہ
"مچھلی والا" تھا۔

خالد: اختر صاحب، آپ نے کیا ڈرامے بھی لکھے ہیں؟

اخترالایمان: ڈرامے تو نہیں، ڈرامہ لکھا ہے، منظوم
"سب رنگ" اس کا نام تھا۔ [illegible] میں چھپا تھا۔
عام طور پر لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا۔ جس ادارے
نے چھاپا تھا وہ بند ہو گیا۔ اب میں اسے دوبارہ
"جنگل" کے نام سے اپنی نئی کتاب "نیا آہنگ"
میں شامل کر رہا ہوں۔ اس کے سب کردار جانور
ہیں۔ یہ ڈرامہ میں نے [illegible] میں لکھا تھا۔ ریڈیو
کے لئے کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے جن کی تفصیل یاد نہیں
ایک ڈرامہ البتہ یاد ہے گالزوردی کے "سیب
کا درخت" سے ماخوذ تھا۔ کشمیر ریڈیو سے نشر
ہوا تھا۔

خالد: خود آپ کی نگاہ میں آپ کی شاعری کے
انفرادی عناصر کیا ہیں؟

اخترالایمان: میں پہلا شاعر ہوں جس کی نظمیں، نظم کی
تعریف پر پوری اترتی ہیں بلکہ نظم کا صحیح تصور
پیدا ہی میں نے کیا ہے ورنہ تو نظم نام [illegible]

دکھانے کا جوش اور دوسرے خاص طور پر پہلے کے شعراء کی نظمیں جاہیے جہاں سے جو مثال دو نظم میں فرق پیدا نہیں پڑتا تھا۔ میں پہلا شاعر ہوں جس نے اردو شاعروں میں ٹوٹے ہوئے آدمی کا تصور دیا ہے۔ اس کی ابتدائی مثالیں "خاک و خون" اور تاریک سیارہ" اور بعد کی "ایک لڑکا" اور دوسری بہت سی نظمیں اردو شاعری کو خود کلامی کا رنگ دے کر جاگیرداری اور بورژوائی تقاضے اتار کر عام سطح پر لایا ہوں۔ اور "ہما شما" کو شاعری کا کردار بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔

خالد :۔ لکھتے وقت بالعموم آپ کو کس طرح کا ماحول درکار ہوتا ہے؟

اختر الایمان :۔ میرا ماحول میرے ذہن میں ہوتا ہے ذہن سے باہر نہیں۔

خالد :۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی جامع اور مستند تعریف کیا ہو سکتی ہے؟

اختر الایمان :۔ وہ ادب جو صرف مارکسی خیالات کی ترویج کرے اور اس ہی کے تحت تخلیق کیا جائے۔

خالد :۔ کس مقصد کے تحت ترقی پسند ادبی تحریک معرض وجود میں آئی تھی؟

اختر الایمان :۔ مارکسی نقطۂ خیال کو ترویج دینے کے لئے

خالد :۔ کیا وجہ ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک عملی طور پر کامیاب نہیں ہو سکی؟

اختر الایمان :۔ اس لئے کہ جو لوگ اس سے متعلق تھے وہ دیانت دار نہیں تھے۔

خالد :۔ کیا وجہ تھی کہ آپ ترقی پسند گروپ سے علیحدہ ہو کر "حلقۂ ارباب ذوق" میں شامل ہو گئے تھے؟

اختر الایمان :۔ ترقی پسندی اپنا مفہوم بدلتی رہی ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا ن۔م۔ راشد، میراجی مجھے، لوگ ترقی پسند کہتے تھے۔ بلکہ میں برائے نام ہی شامل تھا۔ ترقی پسند کا مطلب تھا وہ لوگ جنسی موضوعات پر کھل کر لکھیں اس کے بعد یہ تعریف الٹ گئی۔ یہ نام مارکسی ادیبوں نے لیا ہے۔ میرا تعلق مارکسی ادیب اور حلقہ ارباب ذوق دونوں سے برابر کا رہا ہے۔ ویسے جب حلقۂ ارباب ذوق کی بنیاد پڑی تھی ترقی پسندوں میں وہ تحریک موجود نہیں تھی جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔

خالد :۔ "حلقۂ ارباب ذوق" کا کیا نظریہ اور پیغام تھا؟

اختر الایمان :۔ حلقۂ ارباب ذوق کا کوئی نظریہ نہیں تھا، اور اگر تھا تو صرف یہ کہ ادب پارہ سیاسی ہو نفسیاتی اس کا کوئی بھی موضوع ہو مگر ادب کی تعریف پر پورا اترتا ہو۔

خالد :۔ ابھی تک آپ کی کتنی مطبوعات منظر عام پر آچکی ہیں اور وہ کتب کہاں سے انعام یافتہ ہیں۔

اختر الایمان :۔ ۱ "گرداب" ۱۹۴۳ء میں دلی سے چھپی تھی۔ ساقی بکڈپو نے شائع کی تھی۔

۲ "تاریک سیارہ" ۱۹۴۶ء میں لاہور سے نیا ادارہ والوں نے چھاپی تھی۔

۳ "سب رنگ" ۱۹۴۸ء میں کتب پبلشر نے بمبئی سے چھاپی تھی۔

۴ "آب جو" ۱۹۵۷ء میں چھپی تھی۔ وہ بھی لاہور سے چھپی تھی۔

۵ "یادیں" ۱۹۶۱ء میں رخشندہ کتاب گھر بمبئی نے چھاپی تھی۔

۴ "جنت لمحات" ۱۹۶۹ء میں چھپی تھی وہ بھی بمبئی سے رخشندہ کتاب گھر ہی نے چھاپی تھی۔

۵ "نیا آہنگ" ۱۹۷۷ء میں بمبئی سے چھپی تھی، رخشندہ کتاب گھر نے چھاپی تھی۔

۶ "سروساماں" ۱۹۸۳ء میں رخشندہ کتاب گھر نے چھاپی تھی۔ کلیات ہے۔ "یادیں" کو ساہتیہ اکادمی کا انعام، "جنت لمحات" کو یوپی اکیڈمی کا انعام اور "نیا آہنگ" کو میرا کادمی اور مہاراشٹر اردو اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔

خالد:۔ اب ذرا کچھ آپ کی فلمی مصروفیات کے بارے میں: آپ فلموں میں کس طرح آئے اور آپ کی پہلی فلم۔

اخترالایمان:۔ ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد میں ایک اردو کانفرنس ہوئی تھی اس میں شرکت کی غرض سے گیا۔ حیدرآباد سے بمبئی اور پونا اس لئے گیا تھا کہ وہاں مدھوسودن، جوش صاحب اور کرشن چندر تھے۔ ان سے میری پرانی ملاقات تھی۔ شالیمار پکچرز پونا میں میرے ایک اور کرم فرما تھے ان کا نام ملک حبیب احمد تھا وہ میرے ایک عزیز دوست ملک نسیم الظفر کے والد تھے اور شالیمار پکچرز میں منیجر تھے۔ میں جب پونا گیا تھا ٹھہرا بھی ان ہی کے پاس تھا۔ میں پونا فلمی دنیا میں شامل ہونے کی غرض سے گیا بھی نہیں تھا۔ پونا میں ملک حبیب احمد نے میری ملاقات ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد سے کرائی۔ احمد صاحب نے "گرداب" میری پہلی کتاب پڑھی تھی، جس کے نام سے بھی واقف تھے۔ ایسے ہی ملاقاتوں میں بات چلی اور احمد صاحب نے روک لیا۔ شالیمار میں میری فلم "غلامی" (۱۹۴۵ء) تھی۔ اس فلم میں میرے ساتھ کرشن چندر نے بھی کام کیا تھا۔ میں نے اس فلم میں مکالمہ نگار کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ منظر نگار کی حیثیت سے بھی، اور ایک چھوٹا سا کردار بھی ادا کیا تھا۔

خالد:۔ ابھی تک آپ نے کتنی فلموں کے مکالمے لکھے ہیں؟

اخترالایمان:۔ مکالمے تو بہت فلموں کے لکھے۔ چالیس برس یہی کام کیا ہے۔ کچھ معروف فلموں کے نام یہ ہیں — "قانون" "گمراہ" "وقت" "ہمراز" "دھند" "آدمی" "مجرم" "میرا سایہ" "روٹی" "نغمہ" "دھرم پتر" اور "پھول اور پتھر" اور بہت سی فلمیں ہیں جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔

خالد:۔ اور ابھی تک آپ نے کن کن فلموں کی کہانیاں لکھی ہیں؟

اخترالایمان:۔ فلموں میں اکثر منظرنامے اور مکالمے لکھتا ہوں۔ کہانیوں کی تعداد کم ہے۔ ان میں "فرشتہ" "بکھرے موتی" "رفتار" اور "پھول اور پتھر" شامل ہیں۔

خالد:۔ ابھی تک آپ کی لکھی ہوئی کن فلموں کو انعامات مل چکے ہیں؟

اخترالایمان:۔ "دھرم پتر" اور "وقت" دو فلموں پہ فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا۔

خالد:۔ ہندی ادب میں فلم سے متعلق مقالات لکھے جا رہے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ اردو ادب میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔

اخترالایمان:۔ ممکن ہے اردو کے ادیب فلم کی کہانیوں کو

ادب میں یا اچھے ادب میں شمار نہ کرتے ہوں
ہندی والے کرتے ہوں گے۔

خالد :- اور کیا وجہ ہے کہ اردو ناولوں کی طرف فلم
والے توجہ نہیں دیتے؟

اختر الایمان :- ناول اردو کے ہوں یا ہندی کے اکثر اس
قابل نہیں ہوتے ان سے کوئی اچھی فلم بن سکے۔
یہ بات انگریزی ناولوں پر صادق آتی ہے۔
انگریزی کے بھی بہت لوں سے فلمیں نہیں
بنتیں۔

خالد :- منشی پریم چند کی کہانی فلم غبن پر آپ نے
مکالمے لکھتے وقت فلمی نقطۂ نظر سے منشی پریم
چند کو بہ حیثیت فلمی کہانی نویس کیسا محسوس کیا
اگر وہ آج زندہ ہوتے تو کیا آج کے ماحول میں
وہ فلموں کے لئے موزوں تھے یا نہیں؟

اختر الایمان :- "غبن" جب میرے پاس آئی تھی، تین
چوتھائی بن چکی تھی اس کا ڈائریکٹر مر چکا تھا
میں نے صرف اسے مکمل کرنے میں مدد دی تھی۔ رہ
گئی یہ بات کہ پریم چند زندہ ہوتے تو فلم کے
قابل ہوتے یا نہیں اس کا دارومدار تو ان ہی پر تھا
اور وہ ہی اس کا صحیح جواب دے سکتے تھے۔
ایک اچھا ادیب اچھا فلم نگار بھی ہو سکتا ہے۔
اور نہیں بھی ہو سکتا، کرشن چندر نہیں ہو سکے۔

خالد :- کسی بھی ادبی تخلیق کو فلم میں پیش کرنے پر کیا
اس کی ادبی روح قائم رہ سکتی ہے۔؟

اختر الایمان :- ضرور رہ سکتی ہے۔ یہی اچھے منظر نگار کی خوبی ہے

خالد :- اردو زبان کے بغیر فلم کی مقبولیت و کامیابی
مشکوک ہے۔ کیا یہ دعویٰ درست ہے؟

اختر الایمان :- بالکل درست ہے۔ اگر آپ کی مراد
نگارشی اردو سے نہیں۔

خالد :- اختر صاحب اب آپ کی مکالمہ نگا،
منظر نگاری کے بارے میں کچھ سوالات کر
گا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ گفتگو اور مکالمہ
بنیادی فرق ہوتا ہے؟

اختر الایمان :- گفتگو ضروری نہیں خوش گفتاری
میں بھی آئے مگر مکالمہ کے اندر مقصد
علاوہ خوش گفتاری کا پہلو نمایاں ہونا

خالد :- "مکالمہ" کی جامع و مستند تعریف

اختر الایمان :- وہ بات جو بات موقع محل، مو
مقصد کے اعتبار سے بھرپور ہو۔

خالد :- مکالمہ لکھتے وقت بالعموم کن
کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے؟

اختر الایمان :- مکالمہ لکھتے وقت ان باتوں کو ذ
چاہئے کہ اول موقع کے اعتبار سے بات
مختصر، دلچسپ اور واضح ہو۔ دوسرے
مکالمہ نگاری کی قابلیت کا اظہار نہ ہو۔
کے جس طبقہ سے آئے ہوں اور جوان کا
نفسیاتی انداز مقرر کیا گیا ہے اس کی حد
نہ جائے۔ اور تیسرے گفتگو کتابی نہ
آنکھیں جو نہیں دیکھ سکتیں اس بات
کرے اور کہانی کو برابر کھولتا جائے۔
بڑھائے۔

خالد :- "مکالمہ ہم کلامی" لکھنا زیادہ دشو
ہے یا "مکالمۂ خودی"؟

اختر الایمان :- وہ ہم کلامی ہو یا خود کلامی جو کام

سے کیا جائے گا مشکل ہوگا۔

خالد :- مکالموں پر زور دینے سے "ایکشن" کا زور از خود ختم ہو جاتا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

اختر الایمان :- "ایکشن" بالکل ایک الگ چیز ہے۔ اگر آپ کی مراد ہاتھوں یا سر کی حرکات سے ہے تو وہ ایک فطری فعل ہے۔ جو گفتگو کرنے میں آپ سے آپ سرزد ہوتا ہے۔ مکالمے سے اس کا کوئی تعلق نہیں

خالد :- کیا آپ مکالمہ لکھتے وقت فلم ایکٹر کی شخصیت اور اس کی نفسیات وغیرہ پر غائر نظر رکھتے ہیں؟

اختر الایمان :- مکالمے، ایکٹروں اور آرٹسٹوں کو سامنے رکھ کر نہیں لکھے جاتے۔ کہانی کے ان کرداروں کو سامنے رکھ کر لکھے جاتے ہیں جنہیں کہانی نگار یا منظر نگار نے تخلیق کیا ہے۔

خالد :- کیا مکالمہ، منظر نامہ سے الگ ایک آزاد فن ہے یا منظر نامے کا ایک حصہ یا متبادل۔

اختر الایمان :- منظر نامہ۔ فلمی کہانی کی دوسری منزل ہے اور مکالمہ تیسری، دونوں اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہیں۔

خالد :- کیا مکالمہ، منظر نامے سے نکالا جاتا ہے؟

اختر الایمان :- منظر نامہ، مکالمے کی نوعیت فراہم کرتا ہے مکالمہ کا مواد نہیں، باقی کام مکالمہ نگار کرتا ہے۔

خالد :- کیا یہ ضروری ہے کہ جو مکالمے لکھے وہ منظر نامہ بھی لکھے؟

اختر الایمان :- مکالمہ نگار اور منظر نگار دونوں الگ الگ شخص بھی ہو سکتے ہیں اور ایک بھی۔ دونوں الگ الگ فن ہیں۔

خالد :- کہانی و منظر نامے میں مکالمے کا کیا بدل ہوتا ہے؟

اختر الایمان :- کہانی نگار، کہانی لکھتا ہے۔ منظر نگار منظر، مکالمہ نگار، ان تمام کرداروں جو کہانی اور منظر نامے میں ہیں زندہ کرتا ہے انہیں زبان دیتا ہے۔ ذ[illegible] پر زور دیتا ہے اور کردار بھی۔

خالد :- فرض کیجئے کہ ایک فلم بنگالی یا ملیالم زبان میں مقبول ہوتی ہے، وہی فلم جب اردو یا ہندی میں بنائی جاتی ہے تو اس وقت اس کے مکالموں کا ترجمہ کیا جائے گا یا از سر نو لکھے جائیں گے؟

اختر الایمان :- کوئی قاعدہ، کلیہ نہیں مگر عام طور پر لفظ ترجمہ کرنے سے بات نہیں بنتی۔ ہر زبان کا مزا اور محاورہ الگ الگ ہے۔

خالد :- additional Dialogue writer کی کیوں ضرورت پیش آتی ہے؟

اختر الایمان :- جب اسکرین پر لفظ additional - Dialogue writer۔ لکھا ہوتا ہے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اصل مکالمہ نگار، مکالمے لکھ چکا تھا۔ اتفاق سے بعد میں یا تو کچھ سین پھر سے لکھنے پڑے یا کچھ سینوں کا اضافہ کرنا پڑا اور اس وقت اصل مکالمہ نگار دستیاب نہیں تھا کسی اور سے لکھوانے پڑے۔

خالد :- کیا یہ ذمہ داری مکالمہ نویس کی ہے کہ وہ اداکار کا لہجہ، تلفظ اور ادائیگی کو سنوارے سنبھالے؟

اختر الایمان :- نہیں مگر یہ مکالمہ نگار کے معاہدہ کی شرط ہو[illegible]

خالد :- بحیثیت مکالمہ نگار کے آپ کے ذاتی تجربات کیسے رہے؟

اختر الایمان :- جو بھی تجربات ہیں خوشگوار ہیں۔

خالد :۔ اسکرین پلے (منظر نامہ) کی تعریف کیا ہے اور کس طرح تیار کیا جاتا ہے؟

اختر الایمان :۔ اسکرین پلے (منظر نامہ) کہانی کی فلمی شکل کا نام ہے۔ یہ تخلیقی کام ہونے کے ساتھ ساتھ تکنیکی بھی ہے۔ یہ فن اتنا آزاد ہے کہ منظر نگار کبھی کبھی کہانی نگار کا بنیادی خیال اور چند سین رکھتا ہے باقی سب بدل دیتا ہے اس حد تک کہ کہانی نگار اس کی شکل بھی نہیں پہچان پاتا۔

خالد :۔ جیسا کہ آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "میرے اندر گیت نگاری کی صلاحیت یا mental aptitude نہیں ہے" تو آپ کی ادبی تخلیقات تو فلموں میں مناسب جگہ پا سکتی ہیں؟

اختر الایمان :۔ اگر ادبی تخلیق کی گنجائش فلم میں ہو تو ضرور جگہ پا سکتی ہے اور وہ بھی یہ صحیح کہا تھا کہ مجھ میں اچھا گیت نگار بننے کی صلاحیت نہیں۔

★

مانک ٹالا

قومی یکجہتی اور پریم چند

(اسلام کا وِش ورکش کے پسِ منظر میں)

تنسیخ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے التوا (سنہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء) کے بعد ملک ایک مرتبہ پھر نراجی حالات کا شکار ہو گیا۔ ہندو مسلم اتحاد اور قومی آزادی کی تحریک کے روح پرور نظارے خواب و خیال اور بھولے بسرے افسانے بن کر رہ گئے۔

وہ شر پسند اور فرقہ پرور عناصر جو مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کی قد آور شخصیتوں کے بوجھ تلے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے، انہیں پھر سے ایک نئی زندگی کا پروانہ مل گیا۔ ملک میں پھر سے ہندو مسلمان فسادات اور بربریت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس رَو بلکہ بدرَو کی تند و تیز لہر میں بڑے بڑے قوم پرست بھی بہہ گئے۔ شدھی، سنگھٹن اور تبلیغ کی تحریکوں نے ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو پھر سے مسموم کرنا شروع کر دیا۔ برطانوی حکومت اور اس کے زیر سایہ پلنے والے حکومت نواز اور فرقہ پرست گرگوں نے پھر سے کھُل کھیلنا اور گُل کھلانا شروع کر دیئے

منشی پریم چند نے ان زہریلے عناصر کی تخریبی ذہنیت کے تجزیہ اور پہچان میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ اور وہ اپنے قلم سے تلوار کا کام لیتے ہوئے اپنی کہانیوں اور مضامین کے ذریعہ ان گھناؤنی سازشوں کا پردہ فاش کرنے اور ان کی بیخ کنی کے لئے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اس پرآشوب دَور میں انہوں نے قومی یک جہتی کے موضوع پر اپنی بہترین کہانیاں اور مضامین تخلیق کئے۔ ان میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ پرست اور تخریب کار عناصر کو بڑی ہنرمندی، فن کاری اور چابک دستی سے طشت از بام کیا۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے خلاف انہوں نے منشی دیا نرائن نگم کے مشہور زمانہ ماہنامہ "زمانہ" کے مئی سنہ ۱۹۲۴ء کے شمارے میں ایک انتہائی سخت مضمون "ملکانہ راجپوت شدھی" کے عنوان سے شائع کرایا۔ اس مضمون کو ارسال کرنے

سے چند روز پہلے انہوں نے نگم کو جو خط لکھا تھا، اس کے الفاظ اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ مضمون کس قدر زوردار اور تہلکہ مچا دینے والا ہوگا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۳ء کے خط میں نگم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"ادھر میں اردو لکھنا بند سا کر رکھا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن ملکانہ شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔ تین چار دنوں میں بھیجوں گا۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے۔ لیکن امید ہے کہ آپ اس مضمون کو "زمانہ" میں جگہ دیں گے" [1]

اس مضمون کے شائع ہوتے ہی ہندوؤں کے فرقہ پرست حلقوں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ پنڈت سری رام شرما نے "زمانہ" کے جون ۱۹۲۳ء کے شمارے میں اور اقبال بہادر ورما سحر ہنگامی نے جولائی کے زمانہ میں اس مضمون کے خلاف لکھا۔ لیکن واہ واہ پریم چند ہی کے حصے میں آئی۔ افسوس کہ استدادِ زمانہ کے ہاتھوں "زمانہ" کا وہ پرچہ محفوظ نہ رہ سکا جس میں پریم چند کا متذکرہ بالا مضمون چھپا تھا۔

"زمانہ" فروری ۱۹۲۴ء میں بھی پریم چند کا اسی نوعیت کا ایک اور مضمون "قحط الرجال" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں پریم چند نے مولانا محمد علی اور شوکت علی کی ہندو مسلمان اتحاد کی کوششوں کو سراہا تھا۔ اسی مضمون میں انہوں نے علی برادران کو باہم مکمل کی جوڑی کہہ کر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اور اسی مضمون میں انہوں نے کانگریسی کے چند ہندو لیڈروں کی دوغلی اور غیر مناسب روش کے خلاف سخت ترین الفاظ میں لکھا تھا۔ پریم چند کا فرقہ واریت کے خلاف یہ جہاد ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہا۔

ہندی کے مشہور ادیب اور پریم چند کے دوست چتر سین شاستری نے ۱۹۲۳ء میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ایک نہایت زہریلی کتاب "اسلام کا وِش ورکش" (اسلام کا زہریلا شجر) کے نام سے شائع کرائی تھی۔ یہ کتاب بھی ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء کی ان تباہ کن تحریکوں ہی کی بازگشت تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد بھی ہندو مسلمانوں کے دلوں میں لگی ہوئی فرقہ واریت کی چنگاری کو ہوا دینا تھا۔ تاکہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر فرقہ وارانہ فضا کو اور بھی زیادہ مسموم کیا جائے۔ غیر ملکی حکمرانوں کا منشا بھی یہی تھا کہ ملک کے دونوں بڑے فرقوں میں بغض عناد اور نفرت کی فضا تیار کرکے انہیں آپسی جھگڑوں اور دنگے فسادوں میں مصروف رکھا جائے تاکہ ملک میں چل رہی آزادی کی تحریک میں رخنہ پڑتا رہے۔ اس مقصد کے لئے انہیں کہیں نہ کہیں سے بھاڑے کے ٹٹو مل ہی جایا کرتے تھے۔

پریم چند تو بہت پہلے ہی سے آزادی کی لڑائی میں کود چکے تھے۔ اور جیسا کہ درج بالا سطور میں بتایا گیا ہے وہ اپنے قلم سے فرقہ پرست اور ملک دشمن عناصر کو انتہائی بے باکی سے بے نقاب کر رہے تھے۔ اپنے اس ارفع و اعلیٰ کاز کے سامنے وہ ذاتی دوستی کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ چتر سین

استری اگرچہ ان کے دوست تھے لیکن جب انہیں
اسٹری جی کی اس مذموم حرکت کا پتہ چلا تو وہ ان
خلاف نبرد آزما ہونے سے بھی نہیں ہچکچائے۔
لہوں نے اپنے دوسرے ہم خیال دوستوں، بنارسی
اس چترویدی، جینندر کمار اور کرشن دیو پرشاد
ز کے ساتھ مل کر چترسین شاستری کی قماش کے
ے دشمن اور فرقہ پرست عناصر کے خلاف ایک
ذ قائم کرکے ان کی شکست و ریخت کی ہر ممکن
ششش کی اور اس شر انگیز اور قابل نفرت پرا
یگنڈا کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔

بنارسی داس چترویدی نے انہیں اس کتاب
شائع ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے خلاف
یک مضمون بھی برائے اشاعت ارسال کیا تھا۔
م چند اسے اپنے ماہنامہ ہنس، ۲ میں شائع کرنا
ہتے تھے لیکن ہنس کی قریب ترین اشاعت
لائی ۱۹۳۳ء) والا پرچہ مکمل ہو چکا تھا۔
نچہ اس مضمون کی اہمیت کے نظر انہوں نے
مضمون اپنے ہفت روزہ ہندی اخبار "جاگرن"
قریب ترین اشاعت میں شائع کر دیا۔ اس کی
شاعت سے پہلے انہوں نے چترویدی جی کے نام
نے ۱۷ جولائی ۱۹۳۳ء کے خط میں درج ذیل الفاظ
ما اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

"اسلام کا وش ورکش" میں نے ابھی تک
نہیں دیکھا۔ لیکن "چترپٹ" میں اس
کا جو اشتہار چھپا ہے اس سے میں بخوبی
بھانپ سکتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ فرقہ پرستی
پھیلانے کی یہ ایک انتہائی شر انگیز اور
مستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا
ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا
کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس بارے
میں کچھ لکھوں گا۔ اور اب جب کہ
آپ نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں
لے لیا ہے۔ میں دل و جان سے آپ کے
ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور
ہیں لیکن ہمیں اس کی پرواہ نہ کرنی
چاہئے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے۔ میں
آپ کا نوٹ "جاگرن" میں شائع
کر رہا ہوں۔ کیوں کہ جولائی کا "ہنس"
مکمل ہو چکا ہے۔ اگر آپ یہ کتاب
مجھے بھیج دیں تو میں اس موضوع پر
پورا ایڈیٹوریل لکھوں گا ۳۵

پریم چند کے ذہن میں اس کتاب کے خلاف اس
قدر ہیجان پیدا ہو چکا تھا کہ اسی روز انہوں نے
جینندر کمار کے نام بھی ایک خط میں اس کے خلاف
لکھنے کی تحریک کی۔ متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے

"...... اور ان چترسین کو کیا ہو گیا کہ
اسلام کا وش ورکش لکھ ڈالا۔ اس کی
ایک آلوچنا (تنقید) تم لکھو۔ اور وہ
پستک میرے پاس بھیجو۔ میں نے چترویدی
جی سے پرستاؤ مانگا ہے۔ اس کھلی ہوئی
پروپیگنڈہ کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔
اور یہ رشبھ بھلے آدمی بھی ان چالوں
سے دھن کمانا چاہتا ہے۔" ۳۶

چترویدی جی کا مضمون جاگرن میں فوراً شائع

گیا۔ پھر اگست ۱۹۳۳ء کے ہنس میں بھی اس کتاب کے خلاف سخت تنقید ہوئی۔ اس کے تنقید نگار تھے شری کرشن دیو پرشاد گوڑ۔ ش

لیکن پریم چند خود اس کتاب کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اس قدر بے چین نظر آتے ہیں کہ گوڑ صاحب کی ہنس میں تنقید شائع کرنے سے پہلے انہوں نے ۲۴ جولائی ۱۹۳۳ء کے "جاگرن" میں ایک زبردست ایڈیٹوریل اس کتاب کے خلاف لکھا۔ (غالباً اس دوران انہیں مطلوبہ کتاب مل گئی ہوگی) پریم چند کا یہ ایڈیٹوریل پورے کا پورا پیش کر رہا ہوں کیوں کہ کبھی کبھی سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کی ہوئی تحریر اپنا تاثر کھو دیتی ہے اور اکثر و بیشتر مفہوم بھی واضح نہیں ہوتا جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال بھی رہتا ہے۔

اقتباس :-

ابھی حال میں اس نام کی ایک کتاب ساہتیہ منڈل دہلی نے شائع کی ہے۔ اس کے مصنف ہیں شری چترسین جی شاستری۔ شاستری جی مشہور مصنف ہیں۔ ان کے قلم میں زور ہے اور تحریر میں دلکشی۔ لیکن بدقسمتی سے کبھی کبھی وہ اپنی شہرت کے لالچ میں وہ اس طرح کی تخلیقات کر ڈالتے ہیں جن سے سنسنی کے ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے کی ذہنیت جھلکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی زہریلی کتابیں زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں پر جو مظالم کئے ان کی غلط اور یک طرفہ تفصیلات پیش کر کے فرقہ وارانہ ذہنیت والے ہندو عوام میں مسلمانوں کے خلاف جذبات کو بھڑکایا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں۔ لیکن کیا اس طرح دشمنی کی آگ شاستری جی جیسے ذمہ دار قلم کار کے شایان بات ہے؟ نقص تو سبھی نکالے جا سکتے ہیں۔ کیا ہندو دھ[رم] پاک ہے؟ اپنے اپنے وقت میں طاق[ت] نے مظالم کئے ہیں۔ لیکن ان گئی بیتی با[توں کو] پالنا اور ان کی تشہیر کر کے عوام میں [نفرت] بونا ملک کو تباہی کی طرف لے جا[نا ہے]۔ "رنگیلا رسول کی قبیل کی کتا[ب سے ملک] کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟" اسلام[...] کے صفحہ ۴۳ پر قرآن میں درج باتوں [کو بیان کیا] گیا ہے کہ قرآن کے مطابق :-

(۱) خدا آدمی کو بہکاتا ہے

(۲) خدا سب سے بڑا کپٹی (د[ھوکے باز] ہے)

(۳) خدا نے ہر ایک شہر میں گند[ے لوگ] رکھ چھوڑے ہیں تاکہ وہ لوگو[ں کو] دھوکا دیتے رہیں۔

(۴) خدا گھات میں لگا رہتا [ہے]

(۵) بہشت میں شراب پینے کو اور منتظر حوریں اور لونڈے [ملیں گے /] لئے ملیں گے۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی بنیاد اور گمراہ کن باتوں کی تشہیر کا کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں [میں] مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ایسی ذہنیت والے لوگوں سے خو[ف ...]

رکھے۔

اس سے آگے چل کر شاستری جی نے اروِن، ایلفنسٹن وغیرہم یورپی مصنفین کی تحریروں کے حوالے دے کر اس خیال کی حمایت کی کوشش کی ہے کہ حضرت محمد انسانیت کے بھیانک دشمن تھے۔ اور قرآن میں جہالت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یورپ کے مورخوں نے اسلام کو اس لئے بدنام کیا کہ وہ یونان اور بلقان وغیرہ ملکوں سے ترکوں کو نکالنا چاہتے تھے۔ اسلام کی مقبولیت ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ ان کی (یعنی مغربی مورخوں کی) گھڑی ہوئی باتوں کی مثالیں پیش کرنا کسی بھی طرح قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ مذہبی تعصب کے باعث کرہ ارض کو جن بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس سے تاریخ کے صفحے کے صفحے سیاہ ہیں۔ اس لحاظ سے کیا عیسائی، کیا بودھ اور کیا ہندو سبھی برابر کے مجرم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک مذہب کو پکڑ کر اس میں دنیا بھر کے عیب گنا دینا غیر صحت مند اور جانب دار ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ کتاب اسلام کی تاریخ ہے۔ کسی فرقے یا مذہب کی تاریخ لکھنا بری بات نہیں لیکن غیر جانبدار ہو کر پوری محنت لگن اور تحقیق کے ساتھ سچ اور جھوٹ کو پرکھ کر اسے پوری جانب داری سے پیش کیا جانا چاہیے

اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی تخلیق میں کس قسم کی ذہنیت کا ہاتھ ہے اور کتاب کے سرورق پر جو رنگین تصویر دی گئی ہے وہ مصنف کی گندی ذہنیت کی ننگی تصویر ہے۔

اس (کتاب) میں زیادہ تر ان ہی انگریزی تواریخوں سے نقل کی گئی ہے جو مسلمانوں کے لئے اپنے ذہن میں دشمنی اور تنگ نظری کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ جیسے نرنیر اور منوچی وغیرہ۔ وہی بادشاہوں کے محل کے اندر کی باتیں۔ مینا بازار کے فرضی قصے اس کتاب کی بنیاد ہیں۔ نہ جانے کس پُریان (مسلمہ) سے صفحہ ۱۰۳ پر لکھا گیا ہے کہ مغل بادشاہ سانپ پالتے تھے اور جس سردار پر انہیں شبہ ہوتا تھا اس کو سانپ سے ڈسوا دیتے تھے۔ یا زہریلے کپڑے پہنوا کر اس کی زندگی کا چراغ گُل کر دیتے تھے۔ چلئے مان لیتے ہیں کہ یہ درست ہے لیکن اس سے کیا (ثابت ہوتا ہے؟) قرون وسطیٰ کے مذہبی جنون یا مطلق العنانی کے دور میں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا؟ ہندو راجہ بھی تو وِش کنیائیں رکھتے تھے۔ اور ان کے ذریعہ اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے۔ آج ان باتوں پر معترض ہونا بے ہودگی نہیں تو کیا ہے؟

چترسین جی شاستری ہمارے دوست ہیں۔ وہ عالم فاضل ہیں۔ اچھے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ ہماری ان سے استدعا ہے کہ وہ اس طرح کی اشتعال انگیز بے ہودہ تحریروں سے اپنے نام اور ہندی بھاشا کو داغ دار نہ کریں۔ اور عوام میں جو دشمنی اور تعصب کے جذبات پہلے ہی بھڑکے ہوئے ہیں۔ اس بارود کو آگ نہ دکھائیں[6]

ہم منشی پریم چند کے صاحبزادے شری امرت رائے کے ممنون ہیں کہ انہوں نے پریم چند کی ہندی اور اردو کی بہت سی تحریروں کو مختلف رسائل سے کافی عرق ریزی سے ڈھونڈ کر انہیں یکجا کر کے شائع کر دیا ہے۔ لیکن اگر وہ چترویدی جی اور گوڑ صاحب کی اس قسم کی متنازعہ مسائل پر شائع شدہ تحریریں بھی شائع کر دیتے تو اردو اور ہندی کے محققین ان کے بہت ممنون احسان ہوتے۔ بہرحال یہی غنیمت ہے کہ انہوں نے پریم چند

کی مختلف رسائل میں ہزارہا صفحات پر بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کرنے کا کام کر ڈالا ہے۔ ان کی یہ محنت قابلِ صد ستائش ہے۔

حواشی

۱؎ چھٹی پتری (ہندی) جلد ۵۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۶۲ء۔ ہنس پرکاش۔ الہ آباد۔ ص ۱۳۲۔

۲؎ پریم چند کا ہندی ادبی اور سیاسی ماہنامہ۔ اس کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۳۰ء میں پریم چند نے اپنے ذاتی پریس "سرسوتی پریس" بنارس سے جاری کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد کچھ چند برس تک جاری رہا۔ اپنی قوم پرستانہ پالیسی کے باعث یہ جریدہ ہمیشہ برطانوی سرکار کا معتوب رہا۔ اور متعدد بار اس کی ضمانت ضبط ہوئی۔

۳؎ پریم چند کے خطوط۔ مرتبہ مدن گوپال۔ ص ۲۹۵۔ ناشر مکتبہ جامعہ۔ پہلا انڈیشن۔ جون ۱۹۶۸ء

۴؎ ایضاً ص ۲۶۷

۵؎ قلم کا مزدور۔ از مدن گوپال ص ۱۳۷۔ ناشر مکتبہ جامعہ پہلا انڈیشن۔ مئی ۱۹۶۶ء

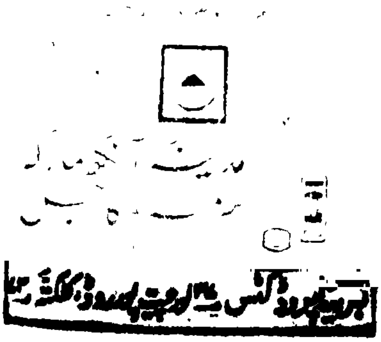
۶؎ وودھ پرسنگ جلد ۲۔ ص ۲۱۶-۲۱۴۔ مطبوعہ ہنس پرکاشن الہ آباد۔ پہلا انڈیشن ۱۹۶۲ء اس کتاب کی تین جلدوں کے لگ بھگ تیرہ سو صفحات میں پریم چند کے ہندی اور اردو میں شائع شدہ مضامین۔ تبصروں اور اداریوں وغیرہ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

بقیہ :- ہم خیال

استانی اسے اس کے گھر پر چھوڑ دیتی تھیں۔

جئے سنگھ نے جب سنا کہ سپنا اسکول سے ابھی تک نہیں آئی ہے تو وہ پاگلوں کی طرح اسے اسکول سے لانے چل پڑا۔ مگر ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ سلمیٰ استانی سپنا کا ہاتھ پکڑے آتی نظر آئی۔ مگر ان کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ شاید وہ کوئی دعا پڑھ رہی تھیں۔ جئے سنگھ ان کے چہرے کو دیکھ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے بڑی ہی اپنائیت سے "بہن جی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو آپ کے محلہ تک چھوڑ آؤں گا۔ آپ مجھ پر پورا وشواس رکھیں" پھر جئے سنگھ نے سپنا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سپنا کا دوسرا ہاتھ سلمیٰ استانی کے ہاتھ میں تھا۔

تینوں کے قدم سنسان سڑک پر اٹھ رہے تھے۔ امن، بھائی چارے اور انسانیت کا پیغام دیتے ہوئے۔ ایک مرد ایک بچی اور ایک عورت مشتمل امن کی بہت چھوٹی مگر مضبوط اور فاتح گزر رہی تھی۔



عبدالحق حقانی القاسمی

عربی غزل کا نمائندہ شاعر

جمیل بن معمر

شخصیت اور رنگ تغزل

غزل ایک نازک اور مقبول ترین صنف سخن ہے۔ اس کی نزاکت میر کے اس شعر میں جھلکتی ہے کہ

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کے اس کارگہ شیشہ گری کا

غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ عورتوں سے حسن و عشق کی باتیں کرنے اور محبت کا دم بھرنے کو غزل کہتے ہیں۔

یہ قصیدے کی صاف ستھری اور ترقی یافتہ شکل و صورت ہے۔ جس میں حسن و عشق کے واردات اور قلبی احساسا[ت] کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دور جاہلی کی شاعری میں غزل کے موضوعات قصیدے ہی میں پیش کئے جاتے تھے۔ اور جان غزل عورتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ جو کہ ان کے تصور میں، خوبصورت نصف زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بقول، مجاز،۔ اس دنیا میں عورت ہی ہے جس سے عشق و عاشقی کی پینگیں بڑھائی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اس دور کے مشہور شاعر خدائے سخن امرؤالقیس کی شاعری میں غزل کا بہت ہی پیارا اور دل ربا انداز ملتا ہے۔ اس نے

اپنی معشوقاؤں کی جو شاعرانہ پیکر تراشی کی وہ بے مثل ہے گو کہ اس میں وہی عریانیت اور ابتذال ہے جو جدت پسند شعراء کی ان غزلوں میں ملتی ہے جو فرائڈ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے جن کا خیال ہی یہ ہے کہ جنسی بندشوں کے سبب سے ہی بہت سی نفسیاتی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور یہ جنسی خواہشات کی بے محابا آسودگی کو ارتقاء ذات کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ جیسے ظفر اقبال کا یہ شعر۔

بتی جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے
جنیاں میری نیچے ہے، شلوار اس طرف

اور بشیر بدر کا یہ شعر

وہ لذتوں کا بدن چیل کی طرح جھپٹا
پھر اس کے بعد میری بوٹی بوٹی کرتا ہے

اس شاعر کے یہاں بھی یہی ننگاپن ملتا ہے۔ جنسی اشارے اور میلانات سے بھرپور یہ شعر دیکھئے

اذا ما بکی من خلفها انصرفت له
بشق وتحتی شقها لم یحول

جیسا وہ بچہ اس کے پیچھے رونے لگتا ہے تو یہ اپنے بدن کے اوپر کا ادھا دھڑ اس کی طرف پھیر دیتی ہے اور اس کا نیچے کا دھڑ میرے نیچے رہتا ہے

اس پر مستزاد یہ کہ شاعر اپنی معشوقہ کے جسمانی حسن کا تجزیہ کرتے ہوئے اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتا ہے اور اس کے مفاتن تک کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

پھر اس کے بعد مجموعی طور پر صنف نازک کے حسن کو ایک ہی شعر میں اس طرح پیش کر دیتا ہے۔

الی مثلها یرنوا الحلیم صبابہ
اذا ما اسبکرت بین درع ومجول

دانا بھی اس کی طرف عشق کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جب کہ وہ انگیا اور سینہ بند پہن کے آ کھڑی ہوتی ہے۔

اس کو داغ نے بھی پیش کیا ہے۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

امرؤالقیس کا یہ شعر ہمیں ہومر کی مشہور رزمیہ نظم میں زیوس دیوتا کی لڑکی اور مینا لاؤس شاہ اسپارٹا کی حسین ترین بیوی ھیلن کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں شاعر نے حسن کا تجزیہ نہیں کیا ہے بلکہ یہ بتلایا ہے کہ اس ستمگر شوخ چشم اور قیامت بدوش دوشیزہ کی طرف عمر رسیدہ بزرگوں عقل مندوں، زاہدوں کی نگاہیں جب اٹھیں تو ٹھہری ہی رہ گئیں۔ اس کے حسن نے شہر ٹرائے کو برباد کیا۔

انگریزی شاعر پوپ نے ہیلن کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

She moves a Goodes and
She looks a queen.

بہرحال شاعر امرؤالقیس کی شاعری میں جنسی تلذذ اور کشش ہے۔ افلاطونی عشق ہے۔ شاعر خود کو عشق کے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ کہتا ہے۔

یمین اللہ ابرج قاعدا
ولو قطعوا راسی لدیک واوصالی

خدا کی قسم میں یہاں سے (معشوق کے پاس سے) نہیں اٹھوں گا چاہے لوگ میرا سر اور میرا ہاتھ پاؤں تیرے پاس کاٹ کر رکھ دیں۔

اختر شیرانی نے اسی احساس کو یہ زبان دی ہے۔

کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اختر
جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کر دونگا

بہرصورت غزل شروع ہی سے قصیدے کی صورت میں موجود رہی ہے۔ اور پروان چڑھتی رہی ہے دور اموی میں آکر ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

غزل کی ترقی کا یہ سنہرا زمانہ ہے اسے اس دور مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگوں کی ساری دلچسپیاں اسی سے وابستہ ہو کر رہ گئیں۔ اس کی مقبولیت کا سبب تنعم اور تعیش ہے جس کی کوکھ سے ہوسناکی جنم لیتی ہے یہ ہوسناکی اور عیاشی کچھ اس درجہ بڑھ گئی کہ غزلیں ہر ایک کے دلوں کی دھڑکنیں بن گئیں۔

اس دور میں غزل دو خانوں میں تقسیم ہو گئی دو مکاتب فکر سامنے آئے

(۱) عذری۔ جن کی محبت میں سچائی۔ صداقت کا عنصر اور محبوب کے لئے جان تک تج دینے کا جذبہ ہوتا ہے ان کی محبت میں تعیش، ہوسناکی اور معاملہ بندی نہیں ہے ان کا تصور عشق یہ ہے کہ "اذا عشقوا ماتوا" جب اردو غزل کی اشاریت اور ایمائیت میں شمع و پروانہ کہتے

(۲) اس مکتبہ فکر میں کثیر عزہ ، مجنوں لیلیٰ ، قیس و لبنیٰ کافی شہرت کے حامل اور مختلف ناولوں کے اہم ترین کردار ہیں۔

(۳) دوسرا مکتب فکر اباحی کہلاتا ہے جن کے یہاں لکھنوی انداز کی غزلیہ شاعری ہے۔ ہوسناکی، تعیش پسندی، معاملہ بندی، اور بانکپن۔ جذبات نفسانی کی تسکین کا جذبہ ملتا ہے۔ شاعری میں پیکریت کا نرالا انداز ملتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے اس شعر سے ان کے خیال کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

اس مکتبہ فکر کے نمائندہ عمر بن ابی ربیعہ قریشی ہیں جن کی شاعری میں حد درجہ نغمگی اور موسیقیت ہے۔ زبان و فن کا بڑا احترام ملتا ہے۔ ان کی شاعری کا خاص امتیاز یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اپنے تئیں معشوق کے جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ دوشیزائیں خود ان پر جان دیتی نظر آتی ہیں۔ اردو میں جگر مرادآبادی کا یہی انداز ہے۔

اس مختصر مضمون میں غزل عذری کے سرخیل جمیل بثینہ کی شاعری پر ایک مطالعہ پیش ہے۔

یہ حجازی شاعر وادی قری میں پیدا ہوا شاعرانہ ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے شعری ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ چچازاد بہن بثینہ بنت حباب سے محبت ہو گئی جس نے غزل میں مہمیز کا کام دیا اسی رسم و راہ و الفت کی طرف شاعر اشارہ کرتا ہے۔

علقت الهوى منها وليدا فلم
يزل الى اليوم ينمى حبها ويزيد

بچپن ہی سے اس کے عشق میں گرفتار ہوں اور آج تک یہی کیفیت ہے بلکہ محبت اور بڑھتی ہی جاتی ہے۔

دل ابھی بھولا نہیں ہے آغاز الفت کے مزے

جمیل اونٹ کی چارہ گری کے لئے وادی بغیض گیا تھا۔ ایک دن اتفاقاً آرام کرنے کے لئے سو گیا۔ بثینہ اور اس کی باندی کا اسی راہ سے گذر ہوا جہاں وہ لیٹا سو رہا تھا۔ نازیبا حرکت کی وجہ سے جمیل نے بثینہ کو برے الفاظ کہے۔ بثینہ نے ٹو دی پوائنٹ جواب دیا یہ انداز جمیل کو بھا گیا۔ برے الفاظ پیار کے مدھر بول میں بدل گئے۔ یہیں سے شاعر اس عشق کے۔ چوں کہ پہلا عشق پہلا گناہ بھلایا نہیں جاتا اس لئے شاعر کو پہلا عشق اس طرح یاد ہے۔ آنکھوں کے سامنے ماضی کے سارے دریچے کھل جاتے ہیں۔ شاعر پکار اٹھتا ہے۔

واول ماقاد المودة بيننا
بوادى بغيض يا بثين سباب
فقلنا لها قولا فجاءت بمثله
لكل كلام يا بثين جواب

اے بثینہ! وہ جو میری اور تیری محبت کا سبب بنا۔ وادی بغیض کی گالیاں تھیں میں نے تجھ سے برے الفاظ کہے تو تو نے بھی اسی طرح جواب دیا۔ اے بثینہ دنیا کی ہر باتوں کا جواب ہے۔

میاں تو اٹھے تھے عجب انداز سے جوش غضب میں، مگر چودہویں کا مسکراتا چاند اور چڑھتا ہوا حسن کا دریا۔ بل کھاتی ہوئی جوانی دیکھی تو اس کے نام پوری زندگی کی صبح و شام لکھ دی۔ تکلفات کی دیواریں گرجاتی ہیں۔ تعلقات شباب پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور عشق کی سنسنی خیز خبر برق کی طرح پھیل جاتی ہے۔ اب کھلے بندوں دونوں کے لئے ملنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ مگر ملے بغیر دل مضطر کو سکون و قرار کہاں! چوری چھپے ملاقاتوں ہی سے دل بہل رہا ہے نوبت اس جا رسید کہ بادشاہ

وقت مروان بن حکم کے دروازے پر دستک دی جاتی ہے۔ اور دونوں کی آپسی محبت کی شکایت لکھوائی جاتی ہے جو کہ ان کے تصور میں قوم کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ بادشاہ وقت اس جرم کی پاداش میں قتل اور زبان کے کاٹنے کی دھمکی دیتا ہے۔ یہ سن کر جمیل کے اوسان خطا کر جاتے ہیں۔ یمن کی طرف بھاگ نکلتا ہے اور اس دوری منزل کے باوجود محبت کی جڑیں مستحکم ہوتی جاتی ہیں۔ بات شادی تک جا پہونچتی ہے۔ جمیل کی آرزو ہے کہ اس کی زلفوں کی نرم چھاؤں میں زندگی کی صبح و شام گذرے مگر یہ آرزو بر نہیں آتی۔ بثینہ خبر اکسی اور کے آنگن کی مہکار بنا دی جاتی ہے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مگر محبت کا جنون سر پر سوار ہے۔ جمیل بن بن، جنگل جنگل صحرا صحرا گھومتا ہے اور ہائے بثینہ کی آوازیں لگاتا ہے۔

لذت صحرا نوردی دوری منزل میں ہے

بس ذہن و دل پہ ایک ہی نام۔ صحراؤں اور جنگلوں میں اسی کا خیال رشتہ جان بنا ہوا ہے۔ یادش بخیر!

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا (غالب)

جمیل کی شاعری

میں داخلی احساسات و جذبات کی جیسی شائستگی خیال کی پاکیزگی، سوز دروں، جذبہ جمال و صداقت کی جو گرمی ملتی ہے وہ دراصل انہیں کا حصہ ہے۔

جمیل کی شاعری میں حسرت کی طرح پاکیزگی، عفت طرازی جذبات کی گرمی ملتی ہے۔ جمیل صحت مند خیالات کا نمائندہ شاعر ہے۔ غزل کی رنگین دنیا میں رہ کر پاس احتیاط رکھتا ہے، ہم انہیں غزل کی آبرو کہہ سکتے ہیں۔

ان کے یہاں حسرت موہانی کی طرح، تہذیب عاشقی کا تصور ملتا ہے۔ رنگ تغزل کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

الا لیت ریعان الشباب جدید
ودهرا تولى يا بثين يعود

شاعر اس شعر میں اپنے شباب کی سرمستیوں کو یاد کرتا ہے اور بہت ہی آرزوؤں کے ساتھ کہتا ہے کہ کاش جوانی کی سرمستیاں پھر لوٹ آتیں کیونکہ

جو تیری یاد میں معمور و نغمہ خواں گذرے
وہ لمحے کتنے حسین، کس قدر جواں گذرے

ایک عام شاعرانہ نقطہ نظر ہے کہ "کافی ہے تسلی کو میرے ایک نظر بھی" مگر شب ہجر کے پرستار اس شاعر کو یہ بھی نصیب نہیں۔ اس لئے بڑی ہی ناامیدی کے ساتھ کہتا ہے۔

ارانی لا القی بثینة مرة
من الدهر الا خائفا او علی وجل

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بثینہ کا دیدار نصیب ہی نہ ہوگا سوائے حالت خوف کے یا چلتے پھرتے رات کی تنہائیاں اور وہی پریشان خیالیاں ہیں۔ جمیل محو خواب ہے۔ صفحہ دل پر محبوب کا خیال ابھرتا ہے۔ شاعر محبت بھرے رنگ میں کہتا ہے۔

اظل نهاری مستهاما ويلتقي
مع الليل روحى فى المنام وروحها

اے دل شاعرا میں تو اس کے عشق میں سارا دن کھویا ہی رہتا ہوں۔ اور جب رات آتی ہے تو عالم خواب میں میری روح اس کی روح سے ملاقات کرتی ہے۔

ؤمن کی زبان میں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ل کی تڑپ دیکھئے، کہ جب دن بہت انتظار معشوقہ میں گذر گئے۔ ملاقات کے امکانات کم ہوگئے تو شاعر فراق غم میں گھلا جاتا ہے اور مجبور ہو کر غالب کی طرح

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

بھی فقیرانہ لباس میں در جاناں تک پہونچتا ہے اور بثینہ کو تنہا پاکر صدائے فقیرانہ لگاتا ہے

هل البائس المقرور دان فمصطل
من النار او معطي لحافا فلابس

ہے کوئی غریبوں پر عنایت کی نظر کرنے والا؟ جو اسے لحاف عطا کردے یا آگ کا انتظام کردے تاکہ کسی طرح مشقت بھری رات تو گذر جائے۔

یہ جانی پہچانی سی۔ درد سے بھری ہوئی آواز جب بثینہ کے سامعہ سے ٹکراتی تو ذہن کے پردے پر جمیل کی بے کسی کی تصویر ابھر آئی۔ اور دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو یہ اسی کی آواز ہے۔ جس نے مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ پیار کیا تھا۔ غمناک لمحہ مسرت کے لمحے سے گذر گیا۔ اب جمیل کے چہرے پر مسرت کی لہریں پھیلتی نظر آرہی تھیں۔ غم جاناں کا یہ شاعر وفا کا پیکر تھا اس نے اپنی زندگی کے قیامت خیز لمحات اسی کی یادوں میں گذارتا رہا باوجودیکہ وقت نے بہت ہی گہرے زخم دیئے تھے جس کی چوٹ کبھی کبھی ابھر بھی آتی تھی۔

ایسے ہی لمحوں میں حقیقی جوانی کی گھڑی آپہنچی

جس کی خبر اس نے ان اشعار میں دی ہے۔

صدع البغي وما كن بجميل
ولثوى عصر لتواء غير قفول
ولقد اجرا الذيل في وادي القرى
نشوان بين ذراع ونخيل

پس از مرگ جمیل بثینہ نے قاصد کی زبانی جب یہ اشعار کہے تو پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ غم کے آنسو روتی ہوئی اپنے یہ شعر پڑھتی ہے۔

وان سلوى عن جميل لساعة
من الدهر ما حانت ولا حان حينها
سواء علينا يا جميل بن معمر
اذا مت بأساء الحياة ولينها

کہ تیرے جانے کے بعد زندگی کی بپتائیں اور آسانیاں دونوں برابر ہوگئی ہیں۔

جمیل کی شاعرانہ قدر و منزلت

جمیل اپنے معاصر شعراء میں اونچا مقام رکھتا ہے۔ معاصرین نے ان کی شاعری کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور داد و تحسین پیش کی ہے۔

کثیر عزہ جو شعری ادب میں بلند ترین مقام کا حامل ہے کہ قسم بخدا سب سے بڑا شاعر تو وہ ہے جن کے یہ شعر ہیں۔

وخبرتماني ان تيماء منزل
لليلى اذا ما الصيف القى المراسيا
فهذى شهور الصيف عني
فما للنوى ترمي بليلى المراميا

جمیل بن معمر

ابن اذھر نے

نحن معشنا یوم اول لشاعرنا
ویوم اتی والاسنة ترعفا
ویوم رکایاذی الجزاة ودفعته
بنیان کانت لبعض ما قد سلفوا

جیسے اشعار سن کر یہ تاثرات پیش کئے تھے۔

" یہ تو اہل اسلام میں سب سے
بڑا شاعر ہے۔"

ابن حسان نے تنقیدی رائے کا اظہار فرماتے ہوئے کہا ہے۔

" واللہ اشعر اہل الجاھلیة واللہ مالا
حد منہم مثل ھجائہ ونسیب

قسم بخدا یہ تو اہل جاہلیت میں سب سے بڑا شاعر ہے
ہجو اور نسیب میں اس کے پایہ کا کوئی نہیں۔

یقیناً یہ اپنے دور کا مثالی شاعر تھا۔ اشعار میں وہ رقت وسلاست ہے کہ اسے سن کر ایک گونگا پتھر رو دیتا ہے۔

ان تمام اقوال کی روشنی میں جس میں ان کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف ہے جو ایک پس منظر بھی رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کو نئی تنقیدی کسوٹی سے پرکھا جا سکتا ہے۔

کتابیات

الاغانی لابی الفرج الاصفہانی۔ الشعر اوالشعراء لابن قتیبہ
لانور تامر
جریر شخصیت اور شاعری از ڈاکٹر عبدالہادی صاحب
شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ۔ دیگر جرائد ورسائل

شرون کمار ورما

تجربہ

سفید بالوں سے ہم نے سیکھا ہے نیکیوں کا حساب رکھنا
یہ ایسا کچرا نہیں کہ جس کو
اٹھا کے دریا میں پھینک آئیں
اور اس جہالت سے حظ اٹھائیں
وہ لوگ جن کا تھا یہ عقیدہ
کہ نیکیاں کر ندی میں ڈالو
کبھی کے ان بھوکی پیاسی ندیوں کے سیل میں ختم ہو چکے ہیں
نہ موج ان کے لیے پریشاں
نہ ساحلوں پر نشان اُن کے
وہ اپنی پہچان کھو چکے ہیں
سفید بالوں سے ہم نے سیکھا ہے نیکیوں کا حساب رکھنا
اگر ضرورت ہو جال بُننا
مچلتی لہروں سے بے وقوفوں کے قصے سُننا ▲

مشرف عالم ذوقی

محاسبہ

اپنی پہچان
جو موجوں کے سپرد کر آئے ہیں
اپنی آواز
جو ٹریفک کے حوالے کر آئے ہیں
آج وہی
خود احتسابی کے جرم پر اتر آئے ہیں
موجیں اُٹھتی ہیں
ٹریفک چیختا ہے
اور سگریٹ کے مرغولے چھوڑنے کا عمل جا
نہ کھڑکیاں ہیں
نہ دروازے
نہ چھت
یہ مکان کوئی مکان نہیں رہ گیا ہے ▲

رتجگوں کا موسم

شاعر صدیقی (پاکستان)

رات کا بسیرا ہے
تیرگی کا ڈیرا ہے
دور تک اندھیرا ہے

یہ ہوائیں یخ بستہ
لوریاں سناتی ہیں
گھنٹیاں بجاتی ہیں
تاکہ مست ہو جاؤ
لوریاں میں کھو جاؤ
گہری نیند سو جاؤ
تم مگر مرے ہمدم
لوریاں میں مت کھونا
آج رات مت سونا
رتجگوں کا موسم ہے
تلخ جام پی پی کر

جانے صبح کب آئے
اور پھر پلٹ جائے
تم کو نیند میں پاکر
اس لئے مرے ساتھی
صبح کے تمنائی
زندگی کے شیدائی
رات جتنی بھاری ہو
تلخ گھونٹ پی پی کر
رات جاگتے رہنا
ایک ایک پل سم ہے
رتجگوں کا موسم ہے

جاگتے ہی رہنا ہے
انتظار کرنا ہے
خاور درخشاں کا

"فساد"

نورؔ جمالی . ایم . اے

بند دروازے، مقفل کھڑکیاں
شہر مقتل گاہ اب تو ہو گیا
(۱) ہر طرف کرب و جمود، خامشی
آرزوئیں مرقدوں میں اسیر
اپنے کاندھوں پہ لئے اپنی صلیب
زندگی جیسے ہو اک بارِ عذاب

بھوک سے بچے گھروں میں جاں بلب
ماؤں کے چہروں پہ خوف و اضطراب
وقت کی سولی پہ ہیں لٹکے ہوئے
(۲) جانے کتنے شہر کے معصوم لوگ
دور سڑکوں پر فرشتوں کی یہ لاش
کوئی بھی ان پر نہیں ماتم کناں
سب کے سر پر موت کا سایہ مہیب
خوف سے سہمے ہوئے ہیں بام و در

سوچتا ہوں رام کے اس دیش میں
کب تک، آخر قتل، خوں، غارتگری ؟
(۳) ایک دن ٹوٹے گا آخر یہ جمود ؟
وقت کی سب بندشوں کو توڑ کر
خود مکانوں سے نکل آئیں گے لوگ
اپنے ہاتھوں میں لئے تیغ و تبر
پھر نہ رہ جائے گا چنگیزی نظام

غزلیں

سرداس شفیق

نہ حرفِ شوق نہ شرحِ معاشقہ لکھوں
جو زندگی کو ہیں درپیش مسئلہ لکھوں

قلم ملا ہے تو اس دورِ بے یقینی میں
بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کا مرثیہ لکھوں

عجیب چیز ہے اس کی نگاہ کا جادو
نظر کبھی اس سے ملے تو معانقہ لکھوں

کب آئینے میں ہے طاقت کہ اسکو عکس کرے
سفیرِ صبح کو شب کا معاملہ لکھوں

اکیلی راہ میں وہ ناگہاں اگر مل جائے
اندھیری شب کو اجالوں کا آئینہ لکھوں

ہجومِ کیف میں رہتا ہے کس کو ہوش یہاں
میں کس طرح ترے ہونٹوں کا ذائقہ لکھوں

بڑے فراخ ہیں اس کی عطا کے دروازے
ذرا کچھ اور بھی دل کا مطالبہ لکھوں

خود اپنے عکس سے ہیں بدگماں آئینے
میں اپنے عہد کا طرزِ معاشرہ لکھوں

شفیقؔ راہ نوردوں کی آگہی کے لئے
میں سنگِ میل ہوں قدموں کا فاصلہ لکھوں

○

شمس بدایونی

خوابوں کے جزیروں کو بسانے نہیں دیتا
دیوارِ انا کوئی گرانے نہیں دیتا

تہذیب کا پیکر ہے جو دنیائے سخن میں
گفتار میں اخلاق کو آنے نہیں دیتا

یہ جذبِ جنوں ہے جو رہِ ترکِ طلب میں
پندار کی دیوار کو ڈھانے نہیں دیتا

حالات کا ہے جبر جو مطرب کے لبوں کو
بے گائے ہوئے گیت سنانے نہیں دیتا

گردابِ فنا راہ میں ہے زیست کی حائل
یہ خوف ہمیں سر بھی اٹھانے نہیں دیتا

انساں کی فکر اور عمل کا یہ تفاوت
حالات کو معمول پہ آنے نہیں دیتا

کل تک جو روایت کا امیں تھا وہی شمسؔ آج
محفل میں غزل داغؔ کی گانے نہیں دیتا

○

جنید حزیں لاری

شادابیٔ چمن جو بہارِ چمن میں ہے
اس تازگی کی روح گل پیرہن میں ہے

تاریکیوں کے بطن میں در آئے روشنی
کیا ایسی کوئی شمع تری انجمن میں ہے

چھایا ہوا ہے قلب و نظر پر غبار سا
سورج مرے شعور کا شاید گہن میں ہے

بچھڑے ہوئے وطن سے زمانہ گزر گیا
وابستگی کی لہر سی یادِ وطن میں ہے!

خوابوں کی دلکشی کا ہے میٹھا سا ایک زہر
کہتے ہیں وہ حلاوتِ غم میرے فن میں ہے

شاید سخنورانِ بنارس ہیں بے خبر
مدت سے کیوں حزیںؔ اسی شہرِ سخن میں ہے

○

غزلیں

حسن نجمی سکندرپوری

کیا دل میں شوقِ دید، شروعِ سفر میں تھا
ہر ذرّہ رہگذر کا، ہماری نظر میں تھا

شہرت کمانے شہر میں آئے تھے چند دوست
کوئی بلا طرب میں، کوئی کھنڈر میں تھا

فاتح تھا موسموں کے نشیب و فراز کا
وہ ایک سند پتّا جو تنہا شجر میں تھا

منزل کی جستجو میں رواں اتنے سارے لوگ
ایسا ہجوم پہلے کہاں رہگذر میں تھا

ساحل پہ اک پہاڑ مسائل کا سامنے
دریا میں تھے تو ہر سوں سفینہ بھنور میں تھا

قتل اس کا رات ہو گیا شاید اسی لئے
وہ سنگ دوست ہو کے بھی شیشے کے گھر میں تھا

بخشا ہے کس کو وقت نے، کل ایک گلبدن
محوِ سفر سلگتی ہوئی دوپہر میں تھا

نجمیؔ! عجیب رُت ہے اُمس اور صبح دم
کتنا سکون پہلے نمودِ سحر میں تھا

٭

سیفی سرونجی

یوں تو ہے عالی شان مگر گھر نہیں رہا
آتی ہے جس پہ نیند وہ بستر نہیں رہا

آیا ہوں پورے سات سمندر کھنگال کر
مجھ سا جہاں میں کوئی شناور نہیں رہا

ہر چہرہ سوگوار ہے ہر پھول ہے اداس
پہلا سا میرے شہر کا منظر نہیں رہا

اک بات کہہ کے اس نے قد اپنا گھٹا لیا
احسان اس کا اب کوئی مجھ پر نہیں رہا

لفظوں سے کر رہا ہے ہر اک شخص مجھ پہ وار
تیری گلی میں کیا کوئی پتھر نہیں رہا

بازار کی تمام یہ رونق خرید لوں
لیکن ہے جیب خالی میاں زر نہیں رہا

مانا شکست ہو گئی دشمن سے جنگ میں
پیچھے ہمارا پھر بھی یہ لشکر نہیں رہا

طوفان آئے شہر میں یا کوئی زلزلہ
مجھ کو کسی بھی بات کا اب ڈر نہیں رہا

٭

گوہر شیخپوروی

حادثوں نے جب کبھی یہ پوچھا تمہیں کیا چاہئے
ہم نے خوش ہو کر کہا بس زخم تازہ چاہئے

ٹوٹتی قدروں کا دعویٰ ہے کہ انساں کے لئے
انگلیوں پہ جوڑنے والا ہی رشتہ چاہئے

پیٹ پر پتھر سہی رکھتے تو ہیں پاس انا
شیش محلوں کا نہ ہم کو کوئی صدقہ چاہئے

عکس تابی آج بھی مرہونِ منت ہے مری
آئینے کے واسطے کوئی تو چہرہ چاہئے

وارداتِ قتل، اغوا، رہزنی، عصمت دری
آپ کو اخبار میں اب اور کیا کیا چاہئے

جب کوئی ٹائر رگڑ سے چیخا تو سمجھے یہ ہم
ہوشیاری سے سڑک کو پار کرنا چاہئے

کرم خوردہ سب کتابیں درس دیتی ہیں ہمیں
آدمی کو بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

شادمانی کی تمنا حرفِ آخر تو نہیں
حادثوں سے کھیلنے کا بھی سلیقہ چاہئے

ہیں اخوت کے پجاری اس لئے گوہرؔ ہمیں
ہر عبادت گاہ سے کچھ ربط رکھنا چاہئے

٭

ملنگی

شبیہہ عباس جارچوی

برانچ لائن کے ایک دور افتادہ مقام پر ایک غیر معروف اور چھوٹے ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں اس وقت تین آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک اسٹیشن ماسٹر جو ٹکٹ بھی جاری کرتا ہے بکنگ کا کام بھی کرتا ہے اور دوسرے کلریکل کام بھی کرتا ہے۔ دوسرا لیمپ مین ہے جو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لگے ہوئے کھمبوں پر لگے ہوئے لالٹینوں اور اپ ڈاؤن ہونے والے سگنلوں پر چڑھ کر ان میں تیل بھرتا ہے۔ یہی شخص اسٹیشن پر مسافروں کے پینے کے لئے پانی بھرتا ہے اور یہی کانٹے والے کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہ دونوں افراد ریلوے کے ملازم ہیں جبکہ تیسرا شخص ان کا ایک شناسا ہے۔ رات کے دو بجے ہیں، اسٹیشن ماسٹر اپنا حساب کتاب کر رہا ہے۔ جبکہ دوسرے دونوں افراد شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر، لیمپ مین اور ان کا شناسا تینوں قریبی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر اور لیمپ مین ریلوے کی جانب سے فراہم کردہ، اسٹیشن سے ملحق کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ قریبی گاؤں یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔

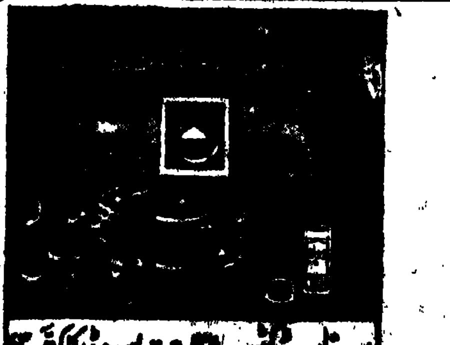
آؤٹر سگنل کے قریب سے ایک کچی سڑک ریلوے کراسنگ سے ہوتی ہوئی مذکورہ گاؤں تک جاتی ہے۔ اسٹیشن کے قریب ہی ڈیڈ لینڈ پر مال گاڑی کا ایک پرانے زمانے کا ڈبہ جس کے دو دروازے ٹوٹے ہوئے ہیں نہ جانے کتنی مدت سے خستہ حالت میں کھڑا ہے اس اسٹیشن پر دن میں چار پسنجر ٹرینیں اور دو مال گاڑیاں رکتی ہیں۔ آج دن میں ریل کی پٹری کا معائنہ کرنے والی گاڑی پر آنے والے ایک آدمی نے اسٹیشن ماسٹر کو بتایا تھا کہ آج رات تین بجے آنے والی پسنجر ٹرین کا گارڈ اسٹیشن کے عملے کی تنخواہ لے کر آ رہا تھا اس لئے آج رات کی اس ٹرین کا خصوصی انتظار تھا۔ بعد میں اطلاع ملی کہ مذکورہ ٹرین دو گھنٹے لیٹ ہے اور بجائے تین بجے رات کے صبح پانچ بجے پہنچے گی۔ سردیوں کا دن چھوٹا ہوتا ہے، شام سرعت سے ڈھلتی ہے، اور راتیں بہت زیادہ سنسان ہوتی ہیں سردیوں میں رات میں مسافر کم ہی سفر کرتے ہیں لیکن عملے کو تو اپنی ڈیوٹی دینی ہی ہوتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے جس کے

سبب کمرہ گرم تھا ۔ اتفاقاً کھڑکی پر دستک ہوئی ۔ اسٹیشن ماسٹر جس کا نام نور دین تھا نے کھڑکی کھولی اور سامنے ایک ملنگ کو کھڑا پایا ۔ " باؤ جی ۔ فورٹ عباس کے لئے گاڑی کتنے بجے جائے گی ؟ " ملنگ نے فوری سوال کیا " گاڑی کا ٹائم تین بجے کا ہے لیکن دو گھنٹے لیٹ ہے ، صبح پانچ بجے جائے گی ۔ " نور دین نے جواب دیا اور کھڑکی فوراً بند کرلی ۔ ملنگ غالباً کمرے کی دیوار سے ٹیک لگاکر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد ہیر باآواز بلند پڑھنے لگا ۔ ملنگ خود کو سردی اور نیند کے غلبے سے بچانے کے لئے لہک لہک کر پڑھ رہا تھا " ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ آکھیں کون وچھڑے یار ملاوندے نیں " جب کچھ دیر اسے اسی طرح پڑھتے ہوئے گذر گئی تو لیمپ مین نے نور دین سے کہا " بابو جی اس ملنگ کو اندر ہی بلالو باہر سردی میں ٹھٹھر رہا ہے ۔ یہاں کچھ آرام سے بیٹھ جائے گا ۔ " " ہاں بلالو کوئی حرج نہیں ۔ " اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ۔ تھوڑی دیر میں ملنگ کمرے میں آکر انگیٹھی کے پاس آکر بیٹھ گیا اور ہاتھ تاپنے لگا ۔ ملنگ کی عمر کوئی پچاس سال کے لگ بھگ تھی ، ہاتھ میں ایک بڑا سا چمٹا ، ہاتھوں میں کڑے ، گلے میں مالا اور سبز رنگ کا چوغہ پہنے ہوئے تھا ۔ ملنگ صحت مند اور خوبصورت تھا ۔ اور ساتھ ساتھ صاف ستھرا بھی ۔ اسٹیشن ماسٹر تو ریلوے کی ملازمت میں پانچ سال قبل ہی آیا تھا ۔ لیکن لیمپ مین عرصہ تیس سال سے اسی اسٹیشن پر اسی حیثیت میں کام کر رہا تھا ۔ اسٹیشن ماسٹر نور دین اپنا کام کرتا رہا اور لیمپ مین اور دوسرا شخص ملنگ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے ۔ باتیں کرتے کرتے لیمپ مین نے ملنگ سے کہا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ۔ ملنگ نے جواباً بتایا کہ وہ ایک زمانے میں ریل کے ڈبوں میں

ٹھنڈی بوتلیں فروخت کرتا تھا ۔ اور اس دراز علاقوں تک آیا جایا کرتا تھا ۔ آپ وقت دیکھا ہوگا مگر اس بات کو تو بہت ہوگیا ۔ ملنگ نے اپنی بات ختم کی ۔ ہاں کہ میں نے آپ کو اسی طرح دیکھا تھا لیکن ملنگی کب اور کیوں اختیار کی ؟ لیمپ کیا ۔ بڑا ذاتی سا سوال ہے ، کیا کروگے بولا ۔ اچھا اگر تمہیں اصرار ہی ہے تو سنو ، بدلا ۔ انگیٹھی میں پڑے ہوئے کوئلوں کو کر " میں ضلع گوجرانوالا کی تحصیل وزیرآباد کا رہنے والا ہوں ۔ " ابھی ملنگ نے گفتہ تھی کہ کھڑکی پر کھٹکا ہوا اور اسٹیشن ما ایک مسافر نے ٹائم پوچھا اور اس کے بعد ہوگئی ۔ تھوڑے وقفے کے بعد ملنگ نے کہا ۔ " میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا نے بچپن ہی میں میری منگنی میری خالہ کی چک کے ایک قریبی گاؤں میں رہتی تھی کہ نے ہوش سنبھالا تو ریلوں میں ٹھنڈی بو کرنی شروع کردیں ۔ جس سے مجھے خاصا کرتا تھا ۔ اور گذر بسر ہو جایا کرتی تھی ۔ بڑی ہوئی تو میرے اور اس کے والدین تیاریاں شروع کردیں ۔ ابھی دونوں گھ معاملے پر بات چیت ہی کر رہے تھے کہ ا نے ہمیں آن گھیرا ۔ ہوا یہ کہ جس چک م خالو رہتے تھے وہاں کے زمیندار نے جبر بیوی اور پانچ بچے موجود تھے ، میری منگیتر کا پیغام بھجوایا ۔ زمیندار کی یہ حرکت

اور اشتعال انگیز تھی جبکہ اس کی اپنی اولاد کی عمر میری
منگیتر سے کہیں زیادہ تھی لیکن ہم لوگ زمیندار کا مقابلہ
نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا خوبصورتی سے اس معاملے کو ٹالنے
کی کوشش کی گئی۔" ملنگ کی گفتگو جاری تھی کہ اسی دوران
ایک قلی کمرے میں داخل ہوا اور اس سے علیک سلیک
اور رسمی گفتگو کے باعث ملنگ کی گفتگو کا سلسلہ کچھ
دیر کے لئے پھر منقطع ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ملنگ
پھر بولا۔" زمیندار کو ہم لوگوں نے ہر طریقے سے قائل کرنے
کی کوشش کی کہ یہ بچپن کی مانگ ہے لیکن وہ ٹس سے مس
نہ ہوا۔ اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ جب
اس نے دیکھا کہ میرے جیتے جی اس کی خواہش کامیاب
نہیں ہو سکتی تو اس نے ایک خطرناک چال چلی وہ یہ
کہ انہیں دنوں ہمارے تھانے کے علاقے میں قتل ہو گیا
اور پولیس باوجود سخت کوشش کے ملزمان کا کھوج
نہ لگا سکی، اور انہیں دنوں زمیندار نے تھانے دار سے
مل کر میرا نام بطور قاتل کے درج کرا دیا اور اس طرح میں
گرفتار ہو گیا۔ اب زمیندار کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔
اور وہ بار بار میری منگیتر کے یہاں اپنا رشتہ بھیجنے لگا۔
اور ساتھ ہی ساتھ اس نے میرے متعلق مشہور کر دیا
کہ اس کو عمر قید کی سزا ہو گی لہٰذا وہ جیل سے آنے سے
رہا۔ میری منگیتر اور خالہ اور خالو نے دو سال تک میرا
انتظار کیا اور بعد ازاں میری منگیتر زمیندار کی دوسری
بیوی کی حیثیت سے اس کی حویلی میں چلی گئی۔ میں بیس
سال تک جیل میں رہا اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے ایک
مرتبہ بھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی مقدمہ
چلنے کی نوبت آئی۔ زمیندار کی اس دوسری بیوی کے
اس دوران پانچ بچے ہوئے اور بیس سال کے بعد جب میں
جیل سے رہا ہوا تو اس سے ایک سال قبل زمیندار کا
انتقال ہو گیا تھا۔ میرے والد اور والدہ دونوں اسی
دوران اس دنیا سے انتقال کر چکے تھے اور جب میں میرا
آبائی گھر بارشوں سے زمین بوس ہو چکا تھا۔ آپ اس بات
کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب میں جیل سے رہا ہوا تو اس جہان
دنیا میں کوئی ایسی شے میرے لئے باقی نہ تھی جس سے میرا
جذباتی تعلق ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ وقت بہت سے زخموں
کیلئے مرہم ہوتا ہے لیکن میرے لئے ایسا نہ ہو سکا۔ کیا
کچھ لوگوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ میں بے قصور اور
بے گناہ ہوں محض زمیندار کی خوشنودی حاصل کرنے
اور دوسری صورت میں اپنی جھوٹی انا کو تسکین دینے
کے لئے مجھے قاتل مشہور کیا۔ یہ وجہ تھی کہ جیل سے رہائی
کے بعد میں نے اس جھوٹی دنیا کو ترک کرنے اور ملنگ
بننے کا فیصلہ کیا۔" ملنگ نے لیمپ مین کو اپنی کہانی
کا اختتامیہ سنایا۔ پانچ بجنے ہی والے تھے صبح کا سپیدہ
نمودار ہو رہا تھا۔ دور سے ریل کی سیٹی کی آواز آ رہی تھی
ملنگ نے اپنا چمٹا اٹھایا، لیمپ مین اور دوسرے
حاضرین سے مصافحہ ملایا۔ حق باہو کا ایک نعرہ لگایا۔
کمرے سے باہر نکل گیا۔

★



خورشید ملک ۔ شاہجہاں پور

تاریک روشنی

وہ رات دوسری راتوں سے زیادہ تاریک تھی۔ آسمان میں ٹمٹماتے ہوئے تارے بھی اتنی روشنی نہیں پہونچا پا رہے تھے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دے سکے۔ وہ اپنی جھونپڑی کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اس جھونپڑی کا پٹ جلد از جلد کھل جائے مگر انتظار کی گھڑیاں تھیں کہ تمام ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھیں۔

انسان جنم لینے کے بعد ہی سے خواہشات کے لامتناہی سلسلہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لئے بچہ پیدا ہونے کے بعد جب اپنے آپ کو خواہشات کے جال میں پھنستا ہوا محسوس کرتا ہے تو وہ رو رو کر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ وہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے جس میں لاتعداد خواہشات کی تکمیل کے لئے اسے دیانت داری، ایمانداری، وفاداری اور سچائی سے ہاتھ دھونا پڑے اور ریاکاری، تصنع، مکر و فریب اور بدعنوانی کا دامن پکڑنا پڑے۔ بچہ روتا رہتا ہے مگر اس کی التجا کوئی نہیں سمجھ پاتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ بچہ کو جنم لینے کے بعد رونا اس کے ٹھیک طرح سے جنم لے لینے کی اولین پہچان ہے۔ مجبور ہو کر وہ بھی چپ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ جس طرح اس فریبی دنیا میں قدم رکھنے میں اس کا کوئی اختیار نہیں ہے اسی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی اس کے بس میں نہیں ہے۔ مجبوراً وہ اپنے آپ کو صدیوں سے چلی آ رہی روش پر ڈال دیتا ہے۔ خواہشات کے جال سے انسان جتنا بچانے کی کوشش کرے گا اتنا ہی وہ اس میں الجھتا چلا جائے گا۔ لمحہ لمحہ کر کے خواہشات کا گارا استعمال کر کے وہ اپنی زندگی کی کھوکھلی دیواریں کھڑی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے دولت کی خواہش، شہرت کی خواہش، عزت کی خواہش، نوکری کی خواہش، مکان کی خواہش، فیکٹری کی خواہش ہر وقت گھیرے رہتی ہیں۔ کچھ نہیں تو کم از کم اپنے پیٹ میں سلگنے والی آگ کو دن میں دو دفعہ بجھانے کی خواہش ضرور رہتی ہے۔ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے وہ مستقل بھاگتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بھاگتے بھاگتے وہ اپنا سب کچھ گنواتا چلا جاتا ہے۔ اپنا دل، اپنی معصومیت، اپنا وقار، اپنے ماں باپ، اپنے بھائی بہن، اپنے رشتہ دار حتیٰ کہ اکثر اپنا ملک تک کھو جاتا ہے۔ اگر کچھ اور نہیں ہار پاتا تو کم از کم اپنی زندگی کے

بیش قیمت لمحات ضرور ہار جاتا ہے۔ یہ کیسا جوا ہے
جس میں مستقل ہار ہی ہار نصیب ہوتی رہتی ہے؟ وہ
ادمی بھی اپنی کچھ خواہشات سے مغلوب ہوکر جھونپڑی
کی طرف بے چینی سے دیکھ رہا ہے۔

وہ نارزن ہال کے وسیع میدان کے ایک کنارے
تلک پارک سے ملحق چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سے
ایک کا مکیں ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے اپنا
سب کچھ داؤ پر لگا کر ہار چکے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں
کے مقصد تک کو بھول چکے ہیں۔ دو ہاتھیوں کی لڑائی
میں وہ لوگ گھاس کے مانند بلا وجہ میں روندے جا
چکے ہیں۔ وہ رکشہ چلاتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں، مزدوری
کرتے ہیں، پھر بھی غربت کے اس دور میں اتنا نہیں حاصل
کر پاتے ہیں کہ ہفتہ میں چند روز بھی پیٹ بھر خوراک
لے سکیں۔ مگر وہ زندہ ہیں۔ زندہ کیا ہیں بس چلتی
پھرتی لاشیں ہیں۔ پچکے رخسار اور اندر کو دھنسی ہوئی
آنکھیں ان کی المناک زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی
ہیں۔ کاش کے ان کے پیدا ہوتے ہی ان کے ہونے کا
مفہوم سمجھ لیا جاتا اور ان کا گلا گھونٹ کر ختم کردیا
گیا ہوتا تو آج وہ ایسی المناک اور اذیت ناک
زندگی گزارنے سے بچ جاتے۔

جس جھونپڑی کی طرف وہ دیکھ رہا ہے
اس میں ایک عورت رہتی ہے۔ جس کا اس دنیا میں اس
کے دو معصوم بچوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ وہ بھیک
مانگ کر گزارہ کرتی ہے مگر اس مہنگائی میں بھیک
بھی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ اس
کے اور بچوں کے پیٹ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ
پہونچ سکا ہے۔ بچوں کو دلاسہ دے کر اس نے سلانے

کی کوشش کی مگر خالی پیٹ تو نیند بھی نہ
ہے۔ آج اس نے عاجز آکر مصمم ارادہ کر
اگر بھوک کا کچھ انتظام نہ ہو سکا تو وہ دو
بچوں کو گلا گھونٹ کر ختم کردے گی اور
بھی اس جہنم سے نجات حاصل کرکے اصل جہنم
جائے گی جو کہ اس جہنم سے بدرجہا بہتر ہوگی۔
...ن میں گرفتار وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھ
اپنا رکشہ لے کر ادھر سے گزرا۔ وہ بہت ...
سے رکشہ لے کر جا رہا تھا۔ اور ضرورت سے ز...
نظر آرہا تھا۔ اس عورت کو اس کے ... را
کرن نظر آئی۔ اس نے اس کو روکا اور اپنی ...
اس کی کہانی سنکر اس رکشہ والے کی اداسی میں
ہوگیا کیونکہ پچھلے دن سے اسکی بھی مزدوری ...
رہی تھی تاہم اس نے وعدہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ انت...
کرے گا۔ دونوں ہی نے آنکھوں ہی آنکھوں ...
دوسرے کی خواہشات کے پیام سمجھ لئے۔ عو...
اسے بتا دیا کہ اگر کچھ انتظام ہو جائے تو وہ ا...
اس کی جھونپڑی میں آئے جب وہ اپنے بچوں
پھر تسلی دے کر سلانے میں کامیاب ہو...

اس وقت وہ اپنی جھونپڑی سے ا...
کی جھونپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا اور بے چینی...
ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ...
کیوں نہیں جاتے؟ اچانک جھونپڑی کا چٹ...
قریب میں رکھی ہوئی پوٹلی لے کر جلدی سے جھ...
کا ٹمٹماتا چراغ اپنی روشنی باہر کے گھپ...
میں پھینکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ ...
میں داخل ہوگیا۔ عورت نے پٹ بھیڑ دیا اور

نظروں سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس کی بھی نگاہیں عورت کے جسم کے شکنجے کا جائزہ کر تڑپ کر واپس آ گئیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ فاقہ زدہ عورت اپنے سوکھے ہونٹوں، پچکے ہوئے پیٹ، پچکے ہوئے رخساروں اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے باوجود اس کو بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی اس عورت کا جسم اس کو عطر کی بند بوتل کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بوٹلی لے لی اور جلدی سے اس کو کھول ڈالا۔ چند روٹیاں اور ساگ۔ عورت کو وہ کسی مرغن کھانے سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

مجبوری، مدد، کمزوری، لاچاری، اور بھوک کی خواہشات کا ملا جلا نمونہ وہ دونوں پیش کر رہے تھے۔ عورت نے چراغ کو اٹھا کر پوٹلی کے قریب کر دیا۔ چراغ کی روشنی ان دونوں کے چہروں پر پڑنے لگی۔ دونوں کے چہرے روشن ہو گئے مگر اس روشنی سے پیدا ہونے والی تاریکی میں دونوں ڈوبنے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ تاریکی دونوں کے دلوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ اسی لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ کون روشنی میں تاریک ہوا اور کون تاریکی میں روشن خواہشات سے خواہشات کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔

اور یوں ازل سے خواہشات کی تکمیل کے لئے انسان کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتا چلا آ رہا ہے۔

◊◊◊

بقیہ: لاش

وہاں پہلے سے کام کر رہی تھی۔ کالج کی برائے نام ملاقات نے ہم دونوں کو قریب کر دیا۔ قربت اپنی حدیں توڑ دینا چاہتی تھی۔ لیکن مسائل اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب نائلہ کی شادی طے پا گئی۔ شادی کے دن اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بیٹھی نہارتی رہی۔ اس نے اپنی زبان سے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی آنکھیں ضرور کچھ کہہ رہی تھیں... کیا؟... پتہ نہیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور بڑے ہی ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "جب تک میں رخصت نہ ہو جاؤں، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

اور اور میں اس فرسودہ سماج کے ذریعے لگائے گئے انکش کے باوجود بارات کی رخصتی تک اس کے قریب رہا۔ بارات تو رخصت ہو گئی تھی لیکن وہ آنکھیں انہیں ہی رخصت نہ کر سکا۔ نہ جانے ان میں کیا کچھ پنہاں تھا۔ وہ آنکھیں کل پھر مجھ سے جیسے یہی التجا کر رہی تھیں۔ "مجھے رخصت کئے بغیر نہیں جاؤ گے۔" میرے قدم جیسے گڑ گئے اور اس وقت تک رکا رہا جب تک لاش دفن نہ کر دی گئی۔

اور آج جب میں دوائے کر واپس آیا ہوں، یہاں گھر کے سامنے ایک بھیڑ پھر اکٹھی ہے۔ میں چوروں کی طرح اس بھیڑ میں گم ہو جانا چاہتا ہوں، اپنے آپ کو چھپا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن — چاچی نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ وہ بھیڑ کو چیرتی ہوئی مجھ تک پہنچی ہیں اور میرا گریبان تھامے چیخ رہی ہیں۔

یہی ہے!...... ہاں ہاں.... یہی ہے وہ قاتل۔ جس نے میرے آدمی کی جان لی... میرا سہاگ لوٹ لیا.....؟

دوائیاں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی ہیں، اور میں بت کی طرح ساکت کھڑا سوچ رہا ہوں — کیا میں بھی ایک لاش ہوں؟... یا کوئی گدھ جو ان لاشوں کے گرد منڈلا رہا ہے —!

◊◊◊

بہار میں

اقلیتی فرقے کے لوگوں کی فلاح کے لئے

سرکار کے ذریعہ اٹھائے گئے نئے قدم

حکومت بہار صوبے کے اقلیتی فرقہ کے ترقی اور فلاح کے لئے کوشاں ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو
رہنمائی اور شری بندیشوری دوبے وزیر اعلیٰ کی قیادت میں صوبائی حکومت نے ایسے کئی پروگرام نافذ کئے ہیں
ان اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو مین اسٹریم سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے، مدرسوں اور اردو معلموں کو سہولت د
بنگلہ، پنجابی وغیرہ زبانوں کی ترقی کے لئے مختلف اکاڈمیوں کا قیام، اردو روزناموں کے لئے ٹیلی پرنٹر
کے لئے کل خرچہ کا آدھا حصہ امداد کی شکل میں دینے، جیسے اہم کاموں کے علاوہ حکومت کے ذر
میں ذیل کام کئے جارہے ہیں۔

(الف) اقلیتی فرقہ کے اقتصادی ترقی کے لئے سرکار کے ذریعہ ۱۰ کروڑ روپے کی پونجی سے
اقلیتی مالیاتی کارپوریشن لمیٹڈ کا قیام۔

(ب) کارپوریشن کمرشیل تجارت کے لئے مذہبی اقلیتی فرقے کے لوگوں کو آسان قسطوں پر قرض

(ج) پانچ ایسے ضلعوں میں جہاں اقلیتوں کی تعداد زیادہ ہے ۱۲ بنے کارخانوں کے وکاس کرنے کا

(د) اقلیتی فرقے کے لئے رانچی اور پٹنہ یونیورسٹی میں کوچنگ کلاس شروع۔ دوسری یونیورسٹی
کوچنگ کلاس شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(ہ) ۲۰ نکاتی پروگرام کے نفاذ کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس میں ایک اقلیتی فرقے کا ممبر ہونا لازمی
(و) قبرستان اور وقف کمیٹیوں کو زمین کا سیاسی ابن۔آر۔ڈی۔پی اور سماجک وکاس یوجنا
(ط) اقلیتوں کی شکایتوں پر کارروائی کرنے کے لئے صوبائی سطح پر ایک سیل کا قیام۔

حکومت امید کرتی ہے کہ سبھی فرقے کے لوگ بڑی کوششوں سے حاصل
بھائی چارا اور میل ملاپ کے ماحول کو بنائے رکھنے میں سبھی ممکن مدد دیں گے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

ज० सं० सं० पी० 184 जन (अ-98)/87-88

استاکسٹ: عبدالغفار یہ فیورس چھتہ مسجد باری روڈ گیا

افروز عالم

لاش

اور میں ایک لاش میں تبدیل ہو گیا —— لاشوں نے میرے گرد ایک ہالہ تیار کر لیا۔ ایک۔ دو تین... ان گنت لاشیں۔ میں بچوکا کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا —— آہ!.... کتنی جلدی بدل جاتے ہیں یہ دنیا کے نقشے ——

کل ہی صبح کی تو بات ہے۔ میری مکان مالکن جنہیں میں چاچی کہتا ہوں آئی تھیں اور شہر سے دوائیاں لا دینے کو کہا تھا۔ ان کے شوہر ٹی بی کے پرانے مریض تھے۔ چارپائی پر گھڑیاں گن رہے تھے۔ رات سے کھانسی کچھ زیادہ ہی پریشان کر رہی تھی، رہ رہ کر سینے میں درد اٹھتا تھا اور خون کی ایک آدھ الٹی بھی ہوئی تھی شاید —— چنانچہ نسخے اور پیسے لیکر گھر سے تو ٹھیک ہی روانہ ہوا تھا۔ کیا پتہ تھا کہ راستے میں یہ جان سوز واقعہ پیش آنے والا ہے۔

اس گھر کے نزدیک لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ وہ نائلہ کی سسرال تھی۔ نائلہ جو کبھی میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی..... بھیڑ کو چیرتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا.... آ...... ہ! کس قدر بھیانک منظر تھا وہ......

فرش پر نائلہ کے شوہر کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے سے نیچے دل کی جگہ قینچی کی پوری نوک پیوست تھی۔ خون کے چھینٹے دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ سینے سے تین چار انچ اوپر نائلہ کے پیر جھول رہے تھے۔ اس کی لاش ناگن کے ایک پھندے سے لٹکی تھی۔ گردن لانبی ہو گئی تھی۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ آنکھیں ابل پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ شکتی کا اوتار درگا اپنے دشمن کے سینے پر پیر رکھے کھڑی ہے

خوف اور دہشت کے مارے میں کمرے سے باہر نکل آیا —— ماضی کی نہ جانے کتنی یادیں ذہن پر دستک دینے لگیں۔

ان دنوں گریجویشن کے امتحان سے تازہ تازہ فارغ ہوا تھا۔ اور ابھی رزلٹ نہیں آئے تھے بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے جان سن اکیڈمی میں اسسٹنٹ ٹیچر کی نوکری کر لی تھی۔ نائلہ وہاں

(باقی ص۳۴ پر)

ہم خیال

قیصر شاہدی

دیکھتے ہی دیکھتے دکانیں بند ہونے لگیں۔ سڑکوں پر بھاگ دوڑ مچ گئی اور پھر شہر کا سارا سکون درہم برہم ہوگیا۔ ہر طرف ایک ہی آواز گشت کرنے لگی۔ فساد ہوگیا...... ہندو مسلم فساد.... بلوا........ جتنا منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔

مسلمانوں نے ایک مندر میں کچھ پھینک دیا ہے

.... نہیں، نہیں..... جب میر گنج کے مسلمان اپنی مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے تو ہندوؤں نے..... نہیں، نہیں.......

حالانکہ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا تھا۔ جب گرلس کالج کی دو لڑکیاں رادھا اور پونم کالج سے چھٹی کے بعد اپنے گھروں کو جا رہی تھیں تو راستے میں چار نوجوان ان پر فحش فقرے چست کرنے لگے تھے۔ ان نوجوانوں کا تعلق نہ تو ہندو دھرم سے تھا اور مذہب اسلام ہی سے۔ ان لوگوں کا تعلق غنڈہ ازم اور لوفر ازم سے تھا۔ یہ چار نوجوان۔ دینا، فضل، پریم اور سلیم تھے۔

دینا نے رادھا کی طرف آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا

"ہائے ذرا اس کی جھیل جیسی یہ آنکھیں تو دیکھ۔ قسم سے اگر اس جھیل میں کوئی ایک مرتبہ ڈوب جائے تو.......“

"ارے یار مجھے تو اس کی کالی گھنی زلفیں بے حد پسند ہیں۔ اسی کو زلف بنگال کہتے ہیں" فضل نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اور طلعت پنجاب کیوں بھول رہے ہو" یہ کہہ کر گویا سلیم نے بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر چاروں نے زوردار قہقہے فضا میں بکھیر دیئے تھے۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن فضل اگر تو نے اس سے نام پوچھ لیا تو میں ابھی تجھے پانچ روپے کے رس گلے کھلاؤں گا۔ بول شرط منظور ہے؟"

پریم نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔

"لیکن اگر اس نے اپنی سینڈل نکالی تو۔"

"بس ڈر گیا نا۔ بڑا خان کا بچہ کہتا ہے۔" پریم نے یہ جملہ شاید اس مناسبت سے کہا تھا کہ اکثر یا تو پریم فضل

بھی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہتا
" خان کا بچہ ہوں۔ ہاں خان کا بچہ "
اور اکثر نام پوچھنے پر وہ بڑے ہی فخر سے اپنا سینہ پھلاتے ہوئے کہتا " فضل خاں "
ایسی باتوں کو سن کر بھلا کب وہ رکنے والا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آستینوں کو اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔
" اچھا ابھی نکال پانچ روپے "
" تو پوچھ بھی تو آ — " پریم نے کہا۔

پھر فضل نے اپنی چال ان دونوں لڑکیوں کے پیچھے تیز کر دی۔ جب ان دونوں لڑکیوں نے اسے اپنے پیچھے لپکتے ہوئے دیکھا تو ان دونوں نے بھی اپنی رفتار کچھ تیز کر دی۔ اس طرح دونوں لڑکیوں کے پیچھے فضل اور ان کے پیچھے دینا، پریم، اور سلیم چل رہے تھے۔

رادھا اور پونم رامون پان دکان کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ پان دکان پر چار پانچ نوجوان پان کھا رہے تھے۔ رادھا کی نظر پان دکان پر کھڑے دنیش پر پڑی جو اس کے بھائی کا دوست تھا۔ اس میں گھبراہٹ کی جگہ جرأت آگئی۔ اس وقت تک فضل اس کے کچھ اور قریب آگیا تھا۔ رادھا نے ناگن کی طرح پھپکاری بھری۔ " بے شرم راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑتے شرم نہیں آتی؟ "

پھر کیا تھا پان دکان پر کھڑے لوگ فضل کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھیڑ لگ گئی۔ دینا، پریم، اور سلیم نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر سمجھا۔ پھر لوگ فضل پر لات اور گھونسوں کی بارش کرنے لگے۔ جب تک کہ وہ زمین پر گر نہ پڑا تھا کسی نے اپنا ہاتھ نہ روکا تھا۔

اور پھر جب یہ خبر فضل کے محلہ میر گنج پہونچی تو وہاں کے چند شر پسند نوجوانوں نے دو چار دستی بم لاکر پان دکان کے قریب پھینک دیئے۔ جس سے کچھ ہندو نوجوان زخمی ہو گئے آخر یہ لوگ بھی تو کسی بات میں کم نہ تھے۔ ان نوجوانوں کا پیچھا کرتے ہوئے میر گنج میں گھس آئے اس وقت تک مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ میر گنج کے لوگ مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ میر گنج مسجد کے امام صاحب نے جب ان لوگوں کو لاٹھی، بھالا اور بموں سے لیس دیکھا تو انہیں سمجھانا چاہا۔ مگر نوجوانوں نے ان کے قریب ایک بم پھینک دیا۔ جس سے وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لاٹھی، بھالا، گنڈاسا اور بموں کا آزادانہ استعمال ہونے لگا

پھر کیا تھا جنگل کی آگ کی طرح خبر پورے شہر میں گشت کرنے لگی تھی۔ بات مسجد کے امام صاحب کے سمجھانے سے بدل کر مسجد اور مندر میں کچھ پھینکنے کی ہونے لگی تھی۔ سبھی اپنے اپنے گھروں میں بند ہونے لگے تھے۔ اسی وقت جے سنگھ بھی اپنے دفتر سے گھر لوٹ آتا تھا۔ اس کی بیوی نے روتے ہوئے کہا تھا۔ سپنا اسکول سے ابھی تک نہیں آئی ہے۔ وہ یہ سن کر بالکل گھبرا گیا تھا کئی برے خیالات اس کے ذہن میں جنم لینے لگے تھے۔

سپنا جے سنگھ سب سے چھوٹی لڑکی تھی جو محلے سے کچھ ہی دور ایک مڈل اسکول میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ میر گنج سے سلمیٰ نام کی ایک استانی اسی مڈل اسکول میں پڑھانے جایا کرتی تھیں۔ چونکہ سپنا کا گھر انہیں راستے میں پڑتا تھا اس لئے سپنا ان ہی کے ہمراہ اسکول جایا کرتی تھی۔ اور چھٹی ہونے پر سلمیٰ

(باقی صفحہ پر)

مبصر :۔ ڈاکٹر فریدہ کول
سوپور، کشمیر

نئی کتابوں کا تعارف

خواہشمندانِ تبصرہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں

نام کتاب :۔ سعادت حسن منٹو ۔ حیات اور کارنامے
مصنف :۔ ڈاکٹر برج پریمی ۔ سال اشاعت :۔ ۱۹۸۶ء
ضخامت :۔ ۳۹۲ صفحات ، قیمت :۔ 65/- روپے
ناشر :۔ مرزا پبلیشر، حسن آباد، رعناواری، سری نگر، کشمیر

ڈاکٹر برج پریمی ریاست جموں و کشمیر کے ایک معروف ادیب ہیں۔ آپ اردو دنیا میں ایک کامیاب اور ممتاز نقاد کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ڈاکٹر پریمی نے اپنے فکر و فن کی ابتداء افسانہ نگاری سے کی۔ لیکن فکری بالیدگی نظر کی پختگی اور مطالعے کی وسعت نے آپ کو فن افسانہ نگاری تک محدود نہ رہنے دیا۔ بلکہ اردو کے تاریخی تنقیدی اور تحقیقی ادب کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ اور آپ نے کئی گراں قدر تصانیف کے ذریعے اپنی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی دیدہ وری کا بین ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان تصانیف میں حرف جستجو اور جلوہ صد رنگ قابل ذکر ہیں۔ جو منظر عام پر آکر ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ کشمیریت، کشمیریات اور کشمیری زبان و ادب، تہذیب و کلچر اور ثقافت و سماج کی روح کو اُجاگر کرنا ڈاکٹر برج پریمی کی دلی تمنا ہے۔ بحیثیت ایک اہل نظر نقاد کے وہ خوب جانتے ہیں کہ اقبال، غالب، منشی پریم چند وغیرہ پر کافی کچھ لکھا گیا ہے لیکن کشمیر کے وہ تخلیق کار اور اہل قلم جنہوں نے قومی سطح پر اردو ادب میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ لیکن وہ گمنام اور ناشناخت ہیں۔ پس ان کی پہچان کو اپنی تصانیف کے ذریعے ابھار کر ان کے صحیح مقام کا تعین کرنا ڈاکٹر پریمی بحیثیت ایک کشمیری کے اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ کشمیریت سے متعلق چند تصانیف کے مسودے اس وقت ان کی ترتیب و تکمیل کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ البتہ ذوق نظر پریم ناتھ پردیسی "عہد، شخص اور فنکار" اس وقت زیر طبع ہے۔ جو چند ہفتوں کے اندر شائع ہو جائے گی۔ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ڈاکٹر برج پریمی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر موصوف کو ۱۹۷۸ء میں کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے نواز اگیا۔ اور اب یہ مقالہ دیدہ زیب کتابت اور طباعت میں ملبوس ایک عمدہ کتاب کی صورت میں چھپ کر آچکا ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے دور تک اردو افسانے کا جو تدریجی ارتقا ہوا ہے اس کا اجمالی جائزہ لینے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ بیسویں صدی کی شروعات میں اردو افسانے کا آغاز پریم چند کے ہاتھوں ہوا۔ پریم چند نے ماورائی اور طلسماتی فضا کے عناصر کو قلع قمع کرکے افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کا آغاز کیا۔

دوسری جانب پریم چند ہی کے دور میں اردو افسانہ رومان اور تخئیل کی بھول بھلیوں سے ہمکنار ہوا اور تخئیل پرستی کے زیر اثر ان کے یہاں جو افسانوی ادب پیدا ہوا وہ سماج اور ان کی محبت کے درمیان چھڑ جانے والی جنگ کا احاطہ کرنے لگا۔ ۱۹۳۲ء میں اردو افسانہ کو تخئیل کی قلابازیوں سے نکالنے کے لئے ایک ایسا گروپ سامنے آیا جو "انگارے" گروپ کے نام سے متعارف ہے۔ اس گروپ میں ڈاکٹر رشید جہاں سجاد ظہیر، احمد علی اور محمود الظفر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے مشترکہ طور پر ایک افسانوی مجموعہ "انگارے" شائع کیا۔ اور پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت میں شاداب تجربے کئے۔ انگارے گروپ کے ادیبوں نے پہلی بار سماجی، تہذیبی، معاشی جنسی اور نفسیاتی مسائل کی بھرپور ترجمانی کی۔ اور ترقی پسند تحریک کے لئے راہیں ہموار کردی۔ جس کا قیام ۱۹۳۶ء میں عمل میں لایا گیا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے پاس چونکہ بات سوچنے، سمجھانے اور سمجھنے کا انداز نیا تھا۔ اس لئے وہ باغیانہ اور جارحانہ فکر واحساس کے حامی بن کر ابھرنے لگے۔ انہوں نے سچے معنوں میں سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور جنسی زندگی کو اپنے فن کا موضوع قرار دیا۔ ترقی پسندوں کی اسی نئی پود میں سعادت حسن منٹو ایک شہسوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے۔ ان کے یہاں سماجی، معاشرتی اور جنسی مسائل کی ہوبہو تصویرکشی ملتی ہے۔ دراصل جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے محسوس کیا ہے۔ مشاہدہ کیا ہے۔ اسی کو اپنے فکروفن کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ طوائف کی زندگی کی تصویرکشی میں انہیں کئی بار خود طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا پڑا تھا۔

پیش نظر کتاب میں ڈاکٹر برزیجی نے تحقیقی عرق ریزی کے ساتھ منٹو کے فکروفن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تحقیق کا فن خاردار وادیوں میں بھٹکنے اور کسی ہیرے کی دستیابی کا فن ہے۔ اس عمل میں غیر ضروری بیانات اور بے جا تکرار کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ مواد کی تہوں میں چھلانگ لگا کر منطقی استدلال کے سہارے صحیح منزل کا تعین ہو سکے۔ لیکن ڈاکٹر برزیجی نے غیر ضروری بیانات اور بے جا تکرار سے اجتناب کرکے منٹو کی فنکاری اور افسانہ نگاری کی صحیح صحیح سمتیں تلاش کیں ہیں۔ اور ایک معتبر وکیل کی طرح یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کہ منٹو۔ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے کس قدر منفرد اور مختلف تھے۔ انہوں نے منٹو سے کوئی جذباتیت کی بنا پر کوئی رشتہ قائم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اندر کے انسان کو ٹٹول کر ان کے فکروفن کو پرکھنے کی سعی کی ہے۔ وہ سچے ناقدان

فن کی طرح انہوں نے منٹو کو خالی خولی فحش نگار قرار دے کر ان کی تذلیل نہیں کی ہے بلکہ ان کی فحش نگاری کی محرکات کا کھوج لگا کر ان کے فکر و احساس کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔

زیر نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے ان ابواب پر ایک ایک کر کے تبصرہ رقم کیا جائے تو صفحات سیاہ ہوں گے۔ پس ایک اجمالی نظر سے چند اہم باتیں قابل توجہ بن جاتی ہیں

ڈاکٹر برجیا نے منٹو کی حیات، شخصیت اور کارناموں کو بنیاد بنا کر منٹو کے فن سے بحث کی ہے۔ (۱) ضمن میں انہوں نے منٹو کے بچپن، جائے پیدائش، شجرہ نسب، تعلیم، ذریعہ معاش، سفر قیام بمبئی، صحافتی اور فلمی اداروں آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ منٹو کی وابستگی پاکستان کو ہجرت، وہاں ان کی ادبی اور غیر ادبی سرگرمیاں جنوں اور موت کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری زیر بحث لانے سے قبل انہوں نے اردو افسانے کا تاریخی ارتقا نہایت ہی ٹھوس اور مدلل طریقے سے پیش کیا ہے نیز منٹو کے ہاتھوں افسانہ نگاری کی روایات میں جو تنوع مندی اور توانائی پیدا ہوئی اس کے تناظر میں منٹو کی جدت پسندی اور عصری حسیت کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے منٹو کی افسانہ نگاری کو مختلف ادوار میں منقسم کیا ہے اور ان کے ہر دور کی افسانہ نویسی کی فکری و فنی خصوصیات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ نثر کے دیگر شعبوں میں منٹو نے جتنے بھی کارنامے انجام دیئے ہیں مصنف نے ان کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے منٹو کے مضامین، انشائیوں، مکتوبات، خاکوں، ریڈیائی ڈراموں اور ترجموں کا تجزیہ تحقیقی دیدہ دانش کے ساتھ پیش کیا ہے۔

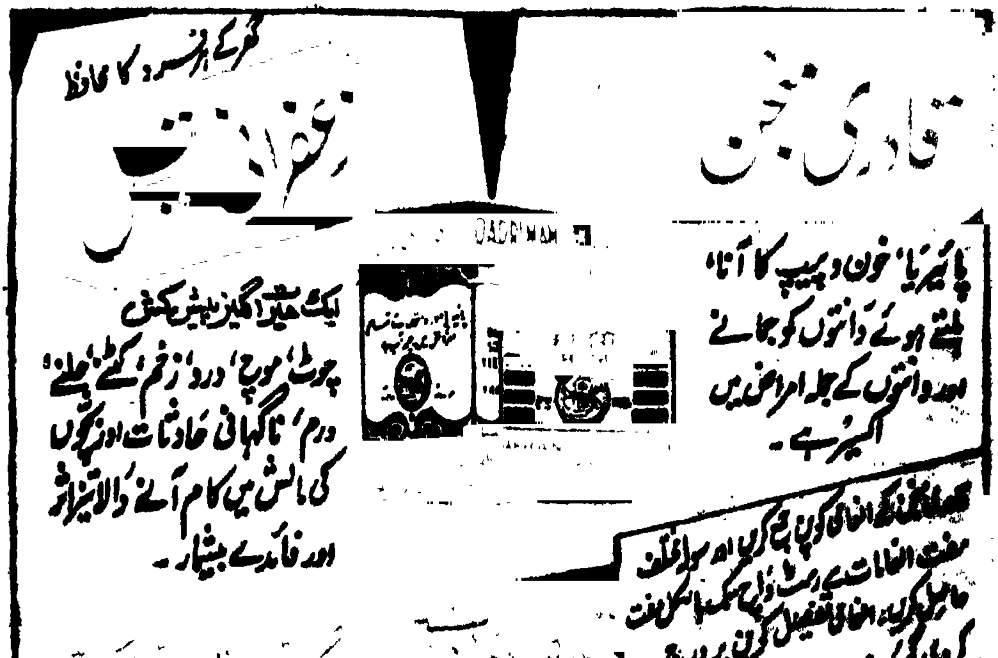
کتاب کا آخری حصہ بعنوان منٹو ایک نظر میں پر مبنی ہے۔ جس میں مصنف نے معروضی انداز نظر اختیار کر کے منٹو کی فکر و فنی زندگی کا معلوماتی آئینہ خانہ سجایا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور انہوں نے بہ نفس نفیس منٹو شناسی میں ایسی گراں قدر حقائق سامنے لائی ہیں جو اس قدر انوکھی اور چونکا دینے والی حقیقتیں ہیں کہ ان سے منٹو کے ناقدین اور محققین کو ایک نئی راہ نئی روشنی اور نیا وژن حاصل ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ منٹو شناسی میں یہ مطالعہ ہر اعتبار سے قابل فخر مطالعہ تصور کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے جہاں منٹو کا فکر و فن آئینہ ہو جاتا ہے وہاں ڈاکٹر صاحب کا خلوص، لگن، انتھک محنت اور [illegible] کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ تحقیق کے تناظر میں صرف یہ کتاب اب منٹو شناسی میں اولین اور آخری کتاب ہوگی۔ کیونکہ منٹو کے فکر و فن کا کوئی بھی گوشہ مصنف نے نہیں چھوڑا ہے۔ پس میرے خیال میں خال ہی کوئی ایسا ہوگا جو مذکورہ کتاب کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب کو مزید کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل ہوگا۔ تنقیدی نقطے اعتبار سے یہ مطالعہ ایک غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ تجزیہ ہے بلکہ یہ کہنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ جو بھی نتائج انہوں نے دوران مطالعہ برآمد کئے ہیں ان سے اختلاف، انحراف کی بہت کم گنجائش نظر

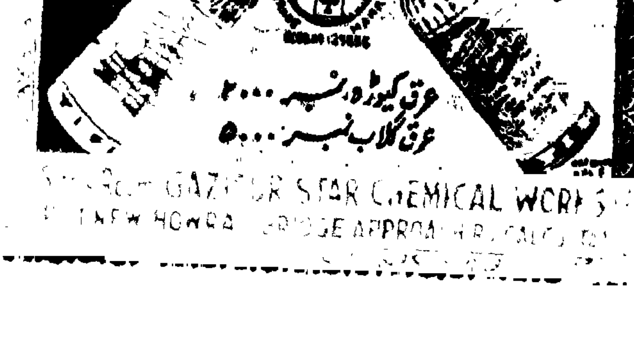
آتی ہے اس لئے کہ ان کا انداز بیان ہر جگہ مدلل، ٹھوس اور حقیقت پسندانہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی سائنس داں تجربہ گاہ میں اجزائے کیمیاوی کو ریزہ ریزہ کرکے ان کی خاصیت بتا رہا ہے۔ پس یہ مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے سائنٹیفک اور غیر جذباتی انداز نظر کا حاصل ہے جو ہر اعتبار سے معقول اور متوازن ہے۔ کتاب کے آخری فلیپ پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے یہ تاثرات کتاب کی قدر سنجی اور قدر سازی کی ضمانت پیش کرتے ہیں:

• برج پریمی نے پرانے اور بوسیدہ تصورات ترک کرکے منٹو کی طوفانی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں نئے اور اہم حقائق سامنے لائے ہیں۔ انہوں نے تنقید کے تواریخی اور ساختیاتی انداز نظر کے امتزاج سے منٹو کی شخصیت اور ان کے فن کا ایک بے تعصب مطالعہ پیش کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ برج پریمی کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک ٹھوس اضافہ ثابت ہوگا۔"

★




مئو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان
● لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس نمبر U 18/77 ضرور دیکھیں
● کیپسول پر مارکہ دیکھیں
● اگر لیبل پر مذکورہ لائسنس نمبر نہ ہو اور ایل ٹی مارکہ نہ ہو یا دوسرا مارکہ ہو تو ہرگز نہ خریدیں۔
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، مکٹنے، جلنے کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی


TEKKA
ROSE WATER
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰
GAZIPUR STAR CHEMICAL WORKS
NEW HOWRAH BRIDGE APPROACH

ماہنامہ سہیل گیا — کی ایک اور عظیم پیشکش — اُردو کی معتبر آواز

شہپر رسول کی ادبی خدمات کا اعتراف

ایک شمارہ

شہپر رسول کے نام

مضامین

- شہپر رسول ایک معتبر شعری آواز — ڈاکٹر اسلم حنیف
- نئی غزل کا منفرد شاعر۔ شہپر رسول — شمس بدایونی
- شہپر رسول مستقبل کی معتبر آواز — عادل صدیقی
- شہپر رسول کی غزل اور معنوی ترسیلی رابطے — محمد نور السلام
- اپنی دھرتی کا سپوت (خاکہ) — فیض الحسن
- شہپر رسول ایک دوست ایک پیکر خلوص (خاکہ) — ذکی طارق
- اس کے علاوہ شہپر رسول سے ادبی موضوعات پر ڈاکٹر ہلال فریدی کا اچھوتا انٹرویو — اور — شہپر رسول کی شعری تخلیقات کا انتخاب

صفحات ۸۰

عنقریب منظر عام پر آرہا ہے

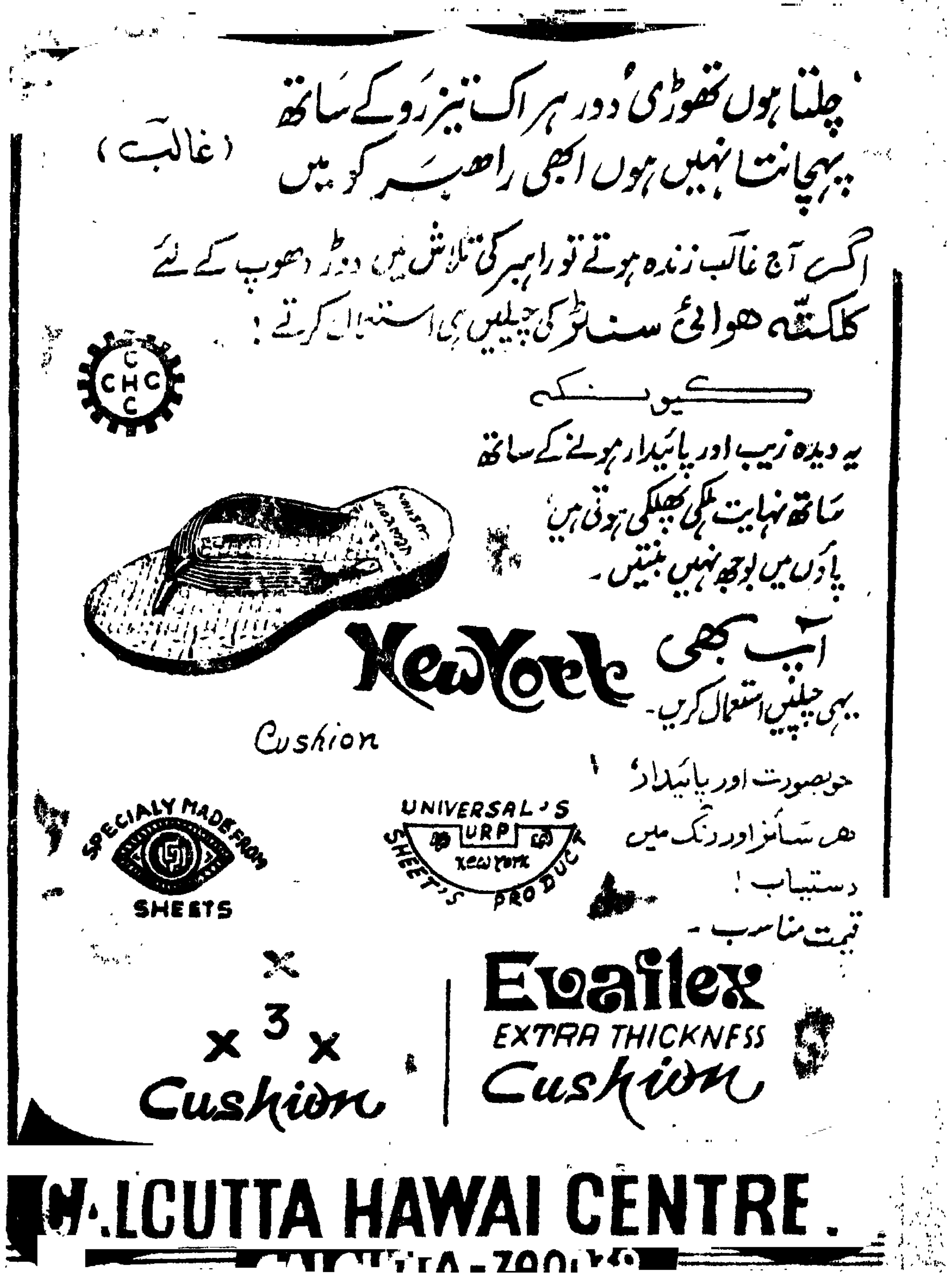
قیمت ۴/=

آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرالیں ۵ سالانہ خریداروں کو یہ شمارہ مفت دیا جائے گا۔

آج کا سالانہ چندہ مبلغ ۳۰/= روپے ارسال کرکے یہ نمبر مفت حاصل کریں۔

منیجر ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

Regd. No. Gay-4
Phone : 21573
R gd with the R. N. P. at R. No. 3520/57
49 Years of Publication
THE SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya-823 001



ماہنامہ
گیا

OCT, NOV '87

Rs. 2.50/-


TRADE JRI MARK
JANTA
F AM
جنتافو
خوبصورت
آرام دہ
اورمضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
66/H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL-700 046

بانی:- حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسہاروی ◆ بیادگار:- زین العابدین احمد و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

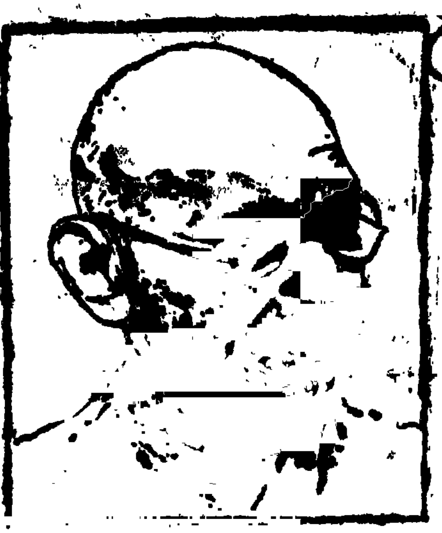
اکتوبر و نومبر ۱۹۸۷ء

فون نمبر ۲۱۵۷۳

چیف ایڈیٹر:- مسعود منظر — مجلس مشاورت — شمارہ ۱۰، ۱۱، جلد ۴۹
ایڈیٹر:- جمیل منظر — ڈاکٹر تارا چرن رستوگی — بدل اشتراک فی شمارہ ۲/۵۰
معاونین:- شکیل احمد ابدالی — ڈاکٹر قمر رئیس — سالانہ:- ۲۵/=
عبدالقیوم ابدالی — اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر برج پریمی — لائف ممبری:- ۵۰۱/=

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ:- ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا

کتابت:- سید عبدالاحد گیاوی



آئیے، ہم سب ایک دوسرے میں ایسے گھل جائیں جیسے سمندر میں پانی کی بوندیں۔ اگر سمندر کی بوند جدا جدا ہو، تو ان میں سے ہر ایک سوکھ کر جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بوندیں جب آپس میں مل ملا کر سمندر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، تو اس قدر طاقتور ہو جاتی ہیں کہ بڑے بڑے جہازوں کو اس کی سطح پر اٹھائے رکھتی ہیں۔ سمندر کی طرح یہ بات ہم پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ آخر کار ہم بھی تو انسانوں کا ایک سمندر ہیں۔

سمندر کی بوندوں کی طرح ایک رہیے۔



متفرق اشعار

جگن ناتھ آزاد

کمالِ نقد و متاعِ نظر پہ ناز نہ کر
یہ دَور بے ہُنری ہے ہنر پہ ناز نہ کر
خرد رسا ہو کہ ہو نا رسا ہے ایک ہی بات
جو باخبر ہے دلِ باخبر پہ ناز نہ کر
ہوائے سرد کو دیکھ اے ذرائے شعلۂ دل
متاعِ سوز و متاعِ شرر پہ ناز نہ کر

○

کیا کہوں دنیا سے میں عہدہ برآ کیونکر ہوا
ایک شیشہ تھا کہ ہر پتھر سے ٹکرانا پڑا

○

شر ہی پہ نظر جس کی ہے وہ آنکھ ہے اندھی
سورج نے کبھی رات کا نقشہ نہیں دیکھا

○

تو اگر دیوانہ بن جاتا تو ہم گل کی طرح
فاش ہوگا ثمر پہ جا کر سب کہیں رازِ چمن

یہ تیرا انکسار اے دل! انا کا ایک پہلو ہے
تجھے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن ہم سمجھتے ہیں

○

قیمت [illegible] بشر کی گری ہے وگرنہ آج
ہر ایک شے کا دام کہیں سے کہیں گیا
مصرع بھٹک رہا ہے مرا ہول کی طرح
شاید خیال تیرے نہایت قریں گئے

○

حیرت ہے کہیں شیشہ کہیں موم کہیں سنگ
انساں کے بھی کیا روپ ہیں انساں کے بھی کیا ڈھنگ
وسعت وہ بیاباں میں تھی کہ گم اس میں تھے آفاق
اور اس کے پس پردہ جو دیکھا تو دل سنگ
قصے تری مہماں نوازی کے سنے تھے
دیکھی ہے مگر صرف تری دعوتِ صد سنگ
ممکن ہے تو جو بند ہے دروازۂ دل کم
شعروں کو پرکھنے کے لئے کھول نہ فرہنگ

○



دیکھو سنو جیو
کھلی کراسنگ کو دیکھ سن کر پار کرو
ہوشیار لیول کراسنگ
کھلی کراسنگ پر خاص دھیان رکھئے۔ رکئے اور دیکھئے کہیں پاس سے کسی ٹرین کے آنے کی آواز تو نہیں آرہی ہے۔ بات تو ہے محض ایک پل کی
پوروتر ریلوے کی جانب سے عوامی تحفظ کے مفاد میں جاری کردہ
پوروتر ریلوے

خواجہ احمد عباس

سے ایک ملاقات

اختر الزماں مبارک پوری

۸ مارچ ۱۹۸۶ء میں بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے موضوع سے متعلق ڈاکٹر ظ انصاری، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، اور کالی داس گپتا رضا صاحب سے گفتگو کی۔ انہیں دنوں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب بمبئی یونیورسٹی میں تصوف پر توسیعی خطبے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے بھی ایک طویل گفتگو ہوگئی تھی۔

۳۰ مارچ ۸۶ء کو شام ۷½ بجے اردو کے معمر ادیب خواجہ احمد عباس صاحب سے بھی ان کی قیام گاہ جوہو پر ملاقات کی۔ خواجہ صاحب میرے موضوع سے متعلق تو نہیں تھے لیکن ایک بزرگ ادیب ہونے کے ناتے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی، ماحول، تعلیم و تربیت اور ادبی کارنامے سے متعلق راقم السطور کو معلومات فراہم کیں۔ سوالات پہلے سے سٹ نہیں تھے کیونکہ محض ملاقات مقصود تھا لیکن موقع ہاتھ آگیا اس لئے گفتگو بھی کر لی۔

خواجہ احمد عباس صاحب نے اردو زبان اور مسائل زبان سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ بھی احساس ہوا کہ انہیں زبان اور مسائل زبان سے دلچسپی نہیں تھی یہاں تک کہ "انجمن ترقی اردو ہند" کی مساعی جمیلہ سے وہ ناواقف محض تھے۔ اپنے مخصوص مزاج اور کچھ پیرانہ سال کے باعث وہ چڑچڑے ہوگئے تھے۔ اکثر بلاوجہ تیز و تند لہجہ اختیار کر جاتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی گفتگو جو میں نے تقریباً ۲۵ منٹ تک کی ہے کیسٹ سے نقل کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اختر الزماں :- خواجہ احمد عباس صاحب! آج آپ سے مل کر کافی مسرت ہوئی کہ ایک بزرگ ادیب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔

خواجہ احمد عباس :- میں بزرگ نہیں ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہوں۔

اختر :- ہم تو آپ کو بزرگ ہی مانیں گے اور ساتھ

ہیں ایک اچھا ادیب بھی۔ آپ نے ہمارے فکشن کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس لئے میں چاہوں گا کہ آپ اپنی حیات کے متعلق کچھ بتانے کی زحمت کریں کہ آپ نے بڑے نازک حالات میں تعلیم حاصل کی، اردو تحریر کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر صحافت اختیار کی۔

واجد :- آپ سوال کیجئے، میں جواب دوں گا۔

ستر :- اپنی حیات سے متعلق کچھ بتائیں؟

واجد :- (گرجدار آواز میں) حیات کیا چیز ہے یہ میں نہیں جانتا؟ آپ کوئی [illegible] سوال کیجئے کہ آپ کہاں پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے۔

فتح :- آپ کب، کہاں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟

واجد :- ہریانہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو پہلے پنجاب میں تھا اس کا نام پانی پت ہے وہاں کی تین لڑائیاں بہت مشہور رہیں۔ میں اس قصبہ میں پیدا ہوا اور جس خاندان میں پیدا ہوا وہ مولانا حالی کا گھرانا تھا۔ ہمارے گھر میں مولانا حالی کی لائبریری تھی۔ اس تعلق سے لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا۔ میں نے تعلیم کی ابتدا گھر پر کی۔ قصبہ کے چاروں کونوں پر "حالی مسلم ہائی اسکول" کی چار پرائمری شاخیں تھیں۔ میں نے جس پرائمری اسکول میں داخلہ لیا تھا اس کا نام "بو علی شاہ قلندر" تھا۔ بو علی شاہ قلندر کا جہاں مزار تھا اس کے قریب ہی ایک اور مزار تھا۔ ایک احاطے اور ایک دالان میں ان کے علاوہ تین بڑی بڑی قبریں تھیں۔ اس احاطے اور دالان میں ہمارا اسکول تھا۔ میں نے اس اسکول کی دوسری جماعت میں داخلہ لیا کیوں کہ قرآن مجید گھر پر پڑھ لیا تھا۔ مجھے اسکول میں الف بے سیکھنی نہیں پڑی تھی۔ یہاں میں نے دوسری، تیسری اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

اختر :- اس کے بعد آپ تعلیم کے لئے کہاں تشریف لے گئے؟

خواجہ :- حالی مسلم ہائی اسکول" ہمارے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ اسکول میں جانے کے لئے کھیتوں سے گزر کر پورا قصبہ Cross کرنا پڑتا تھا اس اسکول میں میں نے پانچویں کلاس سے آٹھویں کلاس تک تحصیل علم کیا۔ ان دنوں میرے Cousin (کزن) خواجہ غلام السیدین علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ میرے والد صاحب نے مجھے علی گڑھ بھیج دیا کہ میں وہیں رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ علی گڑھ کے ایک انٹر کالج میں نویں تا بارہویں جماعت پڑھ کر بی۔ اے کے لئے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے کر لینے کے بعد میں Journalism (جرنلزم) میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے والد کا اصرار تھا کہ میں ایل۔ ایل۔ بی کر لوں کیوں کہ صحافت ان دنوں بیکاروں کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر میں جرنلزم میں کچھ کام نہ کر سکوں تو پھر واپس آکر Law شروع کر دوں۔ اس طرح ایل ایل بی بھی کر لیا۔ لیکن جس دن امتحان ختم ہوا اسی دن بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا تھا

اور قانون سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

اختر:۔ اس وقت سے آپ یہاں مقیم ہیں؟

خواجہ:۔ ہاں! اس گھر میں تو نہیں لیکن بمبئی میں اس وقت سے مقیم ہوں پہلے بھنڈی بازار کے چوک میں رہتا تھا۔

اختر:۔ اردو میں آپ نے کب سے لکھنا شروع کیا؟

خواجہ:۔ ۱۹۳۶ء میں میری پہلی کہانی "ابابیل" جامعہ میں چھپی تھی۔ اب جامعہ بند ہو گیا

اختر:۔ ضیاء الحسن صاحب کی ادارت میں جامعہ اب بھی بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔

خواجہ:۔ اچھا بہت دنوں سے میں نے نہیں دیکھا ہے۔

اختر:۔ سنا ہے کہ آپ کو پہلی کہانی کی اشاعت کے لئے بہت محنت کرنا پڑی تھی؟

خواجہ:۔ کچھ محنت کرنی نہیں پڑی تھی۔ ایک دو روز میں کہانی لکھ دی۔

اختر:۔ لکھنے کے لئے نہیں بلکہ کہانی شائع کرانے کے لئے؟

خواجہ:۔ ہاں شائع کرانے لئے اخباروں اور رسالوں میں بھیجی مگر واپس آگئی۔ پھر جامعہ میں بھیجی اور شائع ہو گئی۔

اختر:۔ آپ نے فکشن ہی میں لکھا ہے کہ کچھ تنقیدی ادب اور تحقیق کی طرف بھی متوجہ ہوئے تھے؟

خواجہ:۔ میں نے مضامین بھی لکھے ہیں لیکن تنقیدی اور تحقیقی نہیں۔

اختر:۔ مضامین کا کوئی مجموعہ ہے یا متفرق ہیں؟

خواجہ:۔ نہیں، مضامین کا مجموعہ نہیں ہے۔

اختر:۔ اب تک کل کتنے ناول قلم بند کئے؟

خواجہ:۔ کوئی دس بارہ

اختر:۔ اس میں سب سے اچھا کس ناول کو آپ سمجھتے ہیں؟

خواجہ:۔ (قدرے بلند آواز میں) سب سے اچھا تو نہیں سمجھتا لیکن سب سے بڑا ناول "انقلاب" ہے

اختر:۔ انگریزی ادبیات میں بھی آپ نے کچھ لکھا ہے؟

خواجہ:۔ جی ہاں، انہیں ناولوں کو انگریزی میں بھی لکھ دیا ہے۔

اختر:۔ Translate کر دیا ہے؟

خواجہ:۔ Translate تو نہیں کیا ہے لیکن دوبارہ انگریزی میں لکھ دیا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں میں Translate نہیں کرتا کیوں کہ دوسرے بہت سے کام ہیں۔ مگر دوسری زبان میں منتقل کر دیتا ہوں۔

اختر:۔ سیاسیات میں بھی آپ کے مضامین اور کتابیں ہیں

خواجہ:۔ بہت سے ہیں مگر انگریزی میں ہیں اردو میں نہیں ہیں۔ جرنلزم انگریزی میں کرتا تھا اس لیے اس زبان میں آسانی تھی دوسرے Publish کرنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔ اردو میں اپنا ناول "انقلاب" شائع کرنے کے لئے مجھے پندرہ سال تک انتظار کرنا پڑا پھر بھی کسی نے شائع نہیں کیا۔ پندرہ ہزار روپے خرچ کر کے میں نے خود شائع کیا۔ اردو کے Publisher چھوٹے چھوٹے ناول مانگتے ہیں جنہیں

Long Short Story کہنا چاہئے۔
میں نے مجبور ہو کر چھوٹے چھوٹے ناول بھی لکھے ہیں۔

اخلاق :۔ آپ نے افسانے بھی کافی تعداد میں لکھے ہیں؟

خواجہ :۔ ہاں سو سے زیادہ لکھے ہوں گے

اخلاق :۔ آپ کے ان افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ کون ہے؟

خواجہ :۔ (گرجدار آواز میں) میں نے جو افسانہ لکھا ہے وہ اچھا ہے۔ اوروں کی نگاہ میں وہ بکواس ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں جو میرے Latest افسانے ہیں وہ زیادہ اچھے ہیں۔ میں کتابوں اور افسانوں کے بارے میں کوئی تکلف نہیں کرتا ہوں۔ میں اپنی رائے کو فوقیت دیتا ہوں۔ اس سے چاہے دوسرے اتفاق کریں یا نہ کریں۔ دوسروں کی رائے کو بھی صحیح سمجھتا ہوں مگر اپنی رائے کو صحیح تر سمجھتا ہوں۔

اخلاق :۔ کیا آپ پر کسی یونیورسٹی سے کام ہو رہا ہے؟

خواجہ :۔ بنارس یونیورسٹی، گورکھپور یونیورسٹی، اور اندھرا میں مجھ پر کام ہو رہا ہے۔

اخلاق :۔ کیا آپ اپنی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بیان کریں گے جس کے باعث آپنے ادب میں اتنا اونچا مقام حاصل کیا ہے۔

خواجہ :۔ میں نے کوئی مقام ہی حاصل نہیں کیا ہے اس لئے کسی اہم واقعہ کا سوال ہی نہیں ہے۔

اخلاق :۔ ایسی بات نہیں ہم تو آپ کو ایک صاحب اسلوب، بزرگ اور مایہ ناز ادیب تصور کرتے ہیں

خواجہ :۔ یہ تو آپ کی مہربانی ہے ورنہ اردو کے بڑے بڑے تنقید نگار ایسا نہیں سمجھتے ہیں۔

اخلاق :۔ جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ پر بیک وقت چار یونیورسٹیوں میں کام ہو رہا ہے اگر آپ کا اردو ادب میں کوئی مقام نہیں ہوتا تو آپ کی حیات میں کم از کم پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالے نہیں لکھے جاتے۔

خواجہ :۔ کام تو جو تم کی مہربانیوں سے ہو رہا ہے اور تنقید نگاروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اخلاق :۔ تخلیقی ادب کے بغیر تنقید کا وجود ہی کہاں ہے لہذا اصل چیز تو تخلیق ہے اس لئے تنقید نگاروں سے کیا گلہ شکوہ

خواجہ :۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں اس لئے نہیں کہ میں ادب میں کیوں آیا۔ ویسے میں اپنی تحریروں کو ادب ہی کہتا ہوں۔ میں نے پندرہ ہزار روپے خرچ کر کے "انقلاب" شائع کی۔ سو جلد میں خاص اہتمام کے ساتھ چھپوائی اور ان کے لئے ڈبے بنوائے۔ اپنے دفتروں میں سو آدمیوں کو مدعو کیا۔ کتاب کی رسم اجرا ہوئی اور مشاعرہ ہوا۔ اخبار کے ایڈیٹروں، ادیبوں اور تنقید نگاروں میں جو مجھے دوست تھے انہیں میں نے انقلاب کی ایک ایک جلد نذر کی، آپ یقین نہیں مانیں گے کہ ایک ادمی نے بھی ایک سطر نہیں لکھی۔ کرشن چندر نے کتاب کی اشاعت سے قبل پیش لفظ لکھا تھا جو اس میں شامل ہے

باقی ۹۹ آدمیوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ایک صاحب نے لکھا بھی تو یہ لکھا۔ "خواجہ احمد عباس کا ناول انقلاب" جو انہوں نے مجھے کئی سال قبل present کیا تھا۔ میری میز پر رکھا ہوا ہے اور گرد جمع کر رہا ہے" یہ لفظ ہیں ان کے کہ گرد جمع کر رہا ہے" انہوں نے اپنا یہ مقولہ میرے ہی اخبار "بلٹز" کے اردو اڈیشن میں شائع کروایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس معاملے میں Bitter (سخت) ہوں۔ ان کا نام نہیں لوں گا۔

احتشو:۔ میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ بزرگوں کے تلخ باتوں کا برا نہیں مانتا۔ رہا تنقید نگار صاحب کا معاملہ کہ آپ کا ناول "ان کی میز پر گرد جمع کر رہا ہے" اس سلسلے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی چشمہ یا دریا بہہ رہا ہو اور اس سے کوئی فیض حاصل نہ کرے تو یہ اس کی بدتوفیقی ہے۔

خواجہ:۔ ایک آدمی فیض حاصل نہ کرے تو کوئی بات نہیں۔ کیا ۹۹ آدمی فیض حاصل نہ کریں؟ اور اس کتاب کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھیں مجھے اس بارے میں شکایت ہے۔

احتشو:۔ ہاں حضور! آپ کی شکایت حق بجانب ہے اور اس طرح کی شکایت ہر کوئی کو ہو سکتی ہے۔ آپ فلم کے میدان میں کب آئے؟

خواجہ:۔ میں نے پہلا فلم ۱۹۴۶ء میں ڈائرکٹ کیا تھا اس کا نام "دھرتی کے نام" ہے۔

احتشو:۔ کون کون سی کامیاب فلمیں ہیں؟

خواجہ:۔ میری کوئی فلمیں کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔

احتشو:۔ چونکہ ان فلموں میں "معجزہ" رہا ہوگا اس لئے سب فلاپ ہو گئی ہوں گی کیوں کہ عوام کو معجزے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہر اچھے قلم کار کا یہی حال ہوا ہے۔

آپ نے ادب کی ترقی پسند تحریک میں جم کر حصہ لیا تھا۔

خواجہ:۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) یہاں تک کہ A- -gressive writers Association اور Indian peoples theatres Associa-tion کا بھی سکریٹری ہو گیا تھا۔ یہ دونوں انجمن ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔

احتشو:۔ اس تعلق سے ایک بات دریافت طلب یہ ہے کہ کیا ادیبوں کو کسی ادبی تحریک یا سیاسی نقطہ نظر سے وابستہ ہونا ضروری ہے؟

خواجہ:۔ ادیب کے لئے سیاسی ہونا محدود ہونے کے مترادف ہے

لہذا ادیب اور ادب کو محدود ہونا نامناسب ہی نہیں بلکہ تباہ کن ہے۔ لیکن اس زمانہ میں ترقی پسند تحریک کی ضرورت تھی اس تحریک کا ادب پر خوش گوار اثر ہوا اور اب وہ اثر اس میں رچ بس گیا ہے اس لئے اب ترقی پسند تحریک کی ضرورت نہیں رہی۔ اردو ادب ہی کو آپ ترقی پسند تحریک کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ترقی پسند تحریک نے جتنا کام کیا ہے کسی تحریک نے نہیں کیا ہے۔

احتشو:۔ آپ نے شاعری بھی کی ہے؟

خواجہ:۔ نہیں۔

اختر :۔ آپ کبھی درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے ہیں؟

خواجہ :۔ کبھی نہیں، میں نے صرف پڑھا ہے، پڑھایا نہیں ہے۔

اختر :۔ آپ نے اپنے قلم کے ذریعہ تعلیم تو بہر حال دی ہے۔ یہ تو ادب کی بات ہوئی آپ نے علمی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے اس میدان میں ایک طویل عمر گزاری ہے جس کا آپ کو تلخ تجربہ حاصل ہے۔ اب میں اردو زبان سے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے پچاس سال پہلے ہی اردو زبان ناسازگار حالات کا شکار ہو گئی تھی اور اب تو اس کی ناؤ دن بدن ڈگمگاتی ہی جا رہی ہے۔ آئے دن اس پر طرح طرح کے تشدد ڈھائے جا رہے ہیں۔

خواجہ :۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا تشدد ہو رہا ہے؟

اختر :۔ اردو زبان کو سرکاری و نیم سرکاری سطح پر منقطع کر دیا گیا ہے۔ اسے فرقہ پرست بتایا جا رہا ہے اور اس کے رسم الخط پر بھی حملہ کیا جا رہا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ اس کے قتل کی سازش میں اردو خواں طبقہ بھی شامل ہے۔ اور لوگ اس زبان کو پڑھنا شجر ممنوعہ تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم اردو کو روزی اور روٹی کا وسیلہ نہیں بنا سکیں تب بھی اس کو زندہ رکھنا ہوگا۔ اس زبان میں ہماری تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ لہذا تہذیب کے بقا اور تحفظ کے لئے اس زبان کی ترویج و اشاعت ناگزیر ہے اگر ایسا نہ ہو تو کوئی بھی زبان زندہ نہیں رہ سکتی اور اس کا سارا ادبی سرمایہ بے کار ہو جائے گا۔ اس کی تہذیب مٹ جائے گی

خواجہ :۔ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ کوئی کچھ بھی کرے یہ زبان زندہ رہے گی۔ کوئی زبان سرکار سہارے زندہ نہیں رہتی۔ بنگالی زبان کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کو سرکاری مدد نہیں ہے۔ کیرلا کی ملیالم زبان کو دیکھئے۔ وہ سرکاری امداد سے محروم ہے۔ لیکن یہ زبان بہت ترقی کر چکی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ زبانوں کو پڑھتے ہیں۔ ان میں ۹-۹ ہزار ایڈیشن چھپتے ہیں۔ اردو میں تو ساڑھے سو کے بھی ایڈیشن چھپ جاتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ کم سے کم ایک ہزار کا ایڈیشن نکلتا لیکن اردو کی کئی کتابیں دیکھیں جو ساڑھے سو چھپی تھیں۔ یہ ہمارے عوام کی بے حسی۔ پانچ روپے کا سینما دیکھیں گے لیکن پانچ کی کتاب نہیں خریدیں گے۔ اس کی جب ہے اس لئے اردو کے قتل کرنے میں کسی کو نہیں ہے۔ اردو عوام ہی کافی ہے۔

اختر :۔ ان کی حس بیدار کرنے کے لئے ہمیں عمل اختیار کرنی چاہئے؟

خواجہ :۔ اردو لکھنا، پڑھنا اور بولنا چاہئے کتابیں اور رسالے شائع کرنا چاہئے۔ افسوس کہ اردو کتابیں بکتی نہیں ہیں۔ ا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ہر کتاب اور رسالہ خریدا جائے۔ یہ اردو کی سب بڑی خدمت ہوگی۔ میں پڑھنے کے لئے ہوں کہ آپ کسی کے ہاتھ سے لے کر پڑھ ل

سے کچھ نہیں ہوگا۔

اختر :- اردو سے اگر کوئی زبان متصادم ہے تو وہ ہندی ہی ہے۔ اردو والے ہندی کے پیچھے نہیں پڑتے لیکن ہندی والے مسلسل اردو کی جڑ کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کبھی اردو والے ہندی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے ہوں لیکن میری کوتاہ نظر سے ایسی بات گزری نہیں ہے۔ ہندی والے اردو کو کوئی زبان ہی نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو ہندی کی شیلی ہے اور لطف یہ ہے کہ اپنے نصاب میں اردو کو کوئی جگہ بھی نہیں دیتے۔

احمد :- اگر وہ (ہندی والے) کہتے ہیں کہ اردو کوئی زبان نہیں ہے تو کہئے کہ ہاں یہ کوئی زبان نہیں ہے۔ اگر وہ شیلی کہتے ہیں تو کوئی گالی نہیں دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اردو والے ضرورت سے زیادہ نازک مزاج ہیں۔ ایسی باتوں کو Seriously لیتے ہیں۔ اردو پڑھیں لیکن ہندی کی مخالفت نہ کریں۔

اختر :- میرے خیال میں اردو والے ہندی کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور نہ کبھی کی ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہے ؟

احمد :- یہ بہت تکلیف دہ موضوع ہے اور بہت طاجلا ہے۔ لوگوں نے اسے اسلامی زبان بنا دیا ہے۔ اردو ہندستان کی زبان ہے۔ کسی مذہب کی نہیں ہے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے کا میں سخت مخالف ہوں۔

اختر :- میرے خیال میں مسلمان تو ایسا نہیں کہتے ؟

خواجہ :- کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام کی اشاعت کے لئے اردو زبان کا بقا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے خلاف ہندی والوں کا comment اس انداز کا سامنے آیا ہے۔ مسلمان اگر اردو کو اردو کے حال پر چھوڑ دیں تو یہ ان کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

اختر :- کیا ہم سرکار سے اردو کا مطالبہ نہ کریں؟

خواجہ :- سرکار سے مانگ کیجئے مگر آل انڈیا تنظیم بنائے۔ کوئی communal تنظیم نہیں۔

اختر :- انجمن ترقی اردو (ہند) کل ہند پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ اس کے اقدام آپ کے خیال میں کیسے ہیں؟

خواجہ :- مجھے معلوم نہیں ہے کہ انجمن کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ اردو کے لئے کام کرتی ہے تو اچھا کر رہی ہے اور اگر وہ اردو کو اسلامی زبان بنانا چاہتی ہے تو غلط کرتی ہے۔

اختر :- انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ حضرات اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور عام اردو داں طبقہ کبھی ایسی بات نہیں کہتا ہے۔ لیکن ہندی والے کہتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کے برعکس اردو والوں کا کہنا ہے کہ کوئی زبان کسی مذہب کی نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اردو پر یہ الزام بے بنیاد اور لغو ہے۔

ہماری زبان، قومی آواز، آجکل، شاعر، نیا دور

دو ماہی اکیڈمی وغیرہ کا میں مستقل طور پر مطالعہ
کرتا ہوں لیکن کہیں بھی ایسی بات نظر نہیں آتی
ہے۔

خواجہ: آپ صرف چھ رسالوں کا نام لیتے ہیں۔
میرے پاس کوئی دو درجن رسالے آتے
ہیں ان رسالوں میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان ہی
اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔

اختر:۔ یہ بات میری کوتاہ نظر سے نہیں گزری ہے
لہذا رہنمائی کریں کہ آپ نے کہاں دیکھی ہیں؟
ویسے میں کبھی کبھی معارف، برہان، جامعہ
بھی دیکھ لیتا ہوں۔ ممکن ہے مجھ سے چوک
ہو گئی ہو۔

خواجہ:۔ آپ اسے کھوجیں گے تو نظر آئے گی

اختر:۔ ظاہر ہے اب مزید تلاش کروں گا۔
اچھا صاحب! مذہب کے بارے میں آپ کا
کیا خیال ہے؟

خواجہ:۔ (گرجدار آواز میں) مذہب کا معاملہ
میرا اور خدا کا ہے لہذا اس سے متعلق مجھ
سے سوال کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں
ہے۔ میرا مذہب خدا جانتا ہے اور میں جانتا
ہوں بس۔

اختر:۔ ویسے آپ اشتراکی نظام کو بہتر سمجھتے ہیں۔
اس نظام نے انسانوں کی فلاح و بہبود کا
کیا کام کیا ہے؟

خواجہ:۔ اس نظام نے فلاح و بہبود کا بہت سا کام
کیا ہے۔ سوچئے روس میں جو انسانوں کی بہتر
حالت ہے وہ ہندوستان میں: کیسویں صدی

میں بھی نہیں ہے۔ مگر میں اشتراکی dogma
کا قائل نہیں ہوں کہ گلے میں لٹکا لیا۔ یہی وجہ ہے
کہ مجھ کو انجمن ترقی پسند مصنفین اور انڈین
تھیٹر سے نکال دیا گیا تھا۔ communal
Riot۔ کے بارے میں میں نے ایک مضمون لکھا
تھا کہ میں ہندوستان کی سبھی سیاسی پارٹیوں کو
accuse کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندوستانی
عوام کو پہلے ہندوستانی نہیں بنایا بلکہ سیاسی
بنا کر انہیں لڑنا مرنا سکھا دیا ہے۔ یعنی کمیونسٹ
ہو کہ مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا ہو کہ کانگریس،
ہر سیاسی پارٹی نے ہندوستانی عوام کی غلط رہنمائی
کی ہے۔

اختر:۔ جس جوش اور جذبہ سے اشتراکیوں نے
کام کیا ہے وہ یقیناً سراہنے کے قابل ہے۔

خواجہ:۔ مگر ہندوستان میں نہیں۔ یہاں صرف ہندوؤں
اور مسلمانوں کو لڑایا گیا ہے۔ کیا آپ اس
کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ ایک کمیونسٹ یونین میں
مسلمانوں کے خلاف یہ جذبہ ہو جائے کہ اگر وہ
پارٹی میں آئیں گے تو ہم کام نہیں کریں گے

اس لئے میں نے جہاں اور پارٹیوں کو مجرم قرار
دیا ہے وہیں کمیونسٹ پارٹی کو بھی مجرم ٹھہرایا
ہے۔ ان لوگوں نے مجھے عوام دشمن کہہ کر دونوں
انجمنوں سے نکال دیا تھا۔

اختر:۔ آپ نے اس کے خلاف کوئی ایکشن (Action)
نہیں لیا تھا؟

خواجہ:۔ اس کے خلاف کیا Action لیتا؟ جہاں تک ہو سکا لکھا اور رسالوں میں چھپوایا۔ ترقی پسند رسالوں میں چھپنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ "نیا ادب" کا میں خود ایڈیٹر تھا اس کے تین ایڈیٹر کرشن چندر، سردار جعفری اور میں تھا۔ بعد میں میں نکل آیا مگر Printer اور Publisher کی جگہ اب بھی میرا نام چھپتا تھا۔ میں نے کہا جس رسالہ میں ایڈیٹر ہی کا مضمون شائع نہ ہو اس کا میں ایڈیٹر نہیں رہوں گا۔

اختر:۔ ترقی پسند حضرات سے آپ کے مراسم کیسے ہیں؟

خواجہ:۔ سبھی لوگوں سے تعلقات اچھے ہیں۔ دس برس بعد ان لوگوں نے مجھ سے معافی مانگی مگر معافی مانگ لینے سے یہ سب باتیں دور نہیں ہوتیں۔ میں نے کہا کہ اب میں انجمن میں نہیں رہوں گا لیکن دوستانہ تعلقات رکھوں گا۔ جب مجروح سلطان پوری اور سردار جعفری صاحب کو مجروح کی ایک نظم کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا تھا تو میں Protest تھا۔ میں نے ان لوگوں کو رہا کرانے کے لئے ایک وفد بنایا اور مرارجی ڈیسائی سے کہا کہ شاعر کبھی کبھی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر جاتے ہیں۔ مجروح صاحب کا بچپنا کہہ لیجئے۔ (مجروح کم عمر تھے)

اختر:۔ ادب سے متعلق ایک بات اور۔ اردو ادب کی کن شاخوں نے بہتر کام کیا ہے جن پر یہ زبان ناز کر سکتی ہے؟

خواجہ:۔ شاعری میں

اختر:۔ ان میں اچھے شعراء کون کون ہیں؟

خواجہ:۔ میں نمبروار نہ بتا سکوں گا۔ جوش، فراق، جگر، فیض، سردار جعفری، اور مجروح وغیرہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کا شعری سرمایہ اعلیٰ پایہ کا ہے۔ آج غزلوں کی مقبولیت اس کی گواہ ہے کہ اردو کا اثر ابتک زائل نہیں ہوا ہے۔

اختر:۔ اور اقبال؟

خواجہ:۔ ہاں اقبال بھی، مجھے نام یاد نہیں آیا تھا۔ یادداشت اب کمزور ہو گئی ہے۔

اختر:۔ پریم چند سے خواجہ احمد عباس تک فکشن میں جو کام ہوا ہے وہ آپ کی نظر میں کیسا ہے؟

خواجہ:۔ کرشن چندر کا کام اچھا ہے لیکن اتنا اچھا نہیں ہے جتنا شاعری میں ہے

اختر:۔ میرا خیال ہے کہ افسانے میں بہت اچھا تخلیقی ادب پیدا ہوا ہے۔ ایک جگہ ای۔ ایم فارسٹر نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں مختصر افسانہ بہت مقبول ہے۔ شاعری ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بازگشت ہے اور تنقید کمزور ہے۔ اردو کے اسکالروں کا کہنا ہے کہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے پہلو بہ پہلو اردو افسانہ نگاری نے بھی عروج حاصل کیا ہے۔ یہی ایک ایسی صنف ہے۔ جسے عالمی ادب میں جگہ مل جائے گی۔

خواجہ:۔ ہوا ہے اچھا۔ میں تو مقابلہ کر رہا تھا کہ نظم میں بہت بلند پایہ شاعر ہیں۔ افسانہ نگاروں میں بھی کرشن چندر، منٹو اور بیدی وغیرہ ہیں

ڈاکٹر فریدہ کول (کشمیر)

فیض احمد فیض

الفاظ کے رمز آشنا

شاعری بنیادی طور پر ایک مخصوص تخلیقی
ی کا نام ہے۔ اس عمل کی تشکیل لفظ و بیان سے ہوتی
۔ ادب کا ذریعہ اظہار الفاظ ہے۔ جب شاعر لفظوں
لیقی برتاؤ سے ایک تخلیقی صورت حال کو خلق کرتا ہے
عری زبان معرض وجود میں آتی ہے۔ فیض احمد فیض
پسند شعرا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ نظریاتی
ر اشتراکی تھے۔ اور غم ذات اور غم کائنات کے ترجمان
۔ فیض محبت و بغاوت اور رومان و انقلاب کے نغمہ
۔ ان کی شاعری کی تمام اصناف میں لفظ و بیان
ے مخصوص لسانی عمل پایا جاتا ہے۔ جو نہ صرف ان
مقصد ابلاغ کو پورا کرتا ہے بلکہ شعری زبان کے
ید امکانات کو بھی روشن کرتا ہے۔

فیض کی شعری تخلیقات کے کل نو مجموعے ہیں۔
ث و تمحیص اور نقد و تحقیق کی منزلوں سے گزر چکے
ن میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، سروادی
دست تہ سنگ، ورق ورق، میرے دل میرے مسافر

اور شام شہر یاراں قابل ذکر ہیں۔ فیض بنیادی طور پر
رومان پرست تھے۔ لفظ و بیان کے برتاؤ کے ضمن میں
جہاں فیض شعری روایات کی پاسداری کا احترام کرتے ہیں
وہاں وہ اپنے شاعرانہ احساسات و ادراکات کے اظہار
میں روایت شکن بھی نظر آتے ہیں۔ اور قدیم شعری روایات
کو برتنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لے کر جدت پسندی
کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حروف و الفاظ
عروض و قوافی، تراکیب و محاورات، تشبیہات و استعارات
اور رموز و علائم کا چن چن کر استعمال ہوا ہے۔ زبان
و بیان کی یہ شعوری کد و کاوش ان کے الفاظ کی رمز
آشنائی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

فیض ایک غزل گو شاعر ہیں۔ لیکن غزل گوئی
پر انہوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اردو شاعری
میں نظم آزاد، نظم معرا، اور پابند نظم کے پیرائے اور نئے
تجربے کئے۔ ان تجربات کے اظہار میں انہوں نے نئے الفاظ
اور شعری الفاظ استعمال میں لائے۔ اس سے یہ بات

واضح ہو جاتی ہے۔ کہ انہیں کم سے کم الفاظ کے ذریعے معنی و مطالب کے سمندر سمیٹ لینے کا سلیقہ حاصل تھا۔ انہوں نے اردو شاعری کے مروج الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کو اس طرح برتا ہے کہ ان میں معنی و مفاہیم کے نئے نئے پیکر ابھرنے لگے۔ جو فیض کی عصری حسیت، اور معنویت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی مانوس لفظ یا استعارہ صرف فیض کے برتنے کے مخصوص ڈھنگ سے نیا اور غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ فیض کی شاعری میں نئی نئی تراکیب اور اصطلاحات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ مثلاً تیر و تفنگ شمشیر و خنجر، زرہ و سناں، قتل و مقتل، ظالم و قاتل، تیشہ و فرہاد، جستجو و آرزو، داغ و سوز، غم و درد، خون دل و جگر، رقیب و اغیار، دوستاں و دشمناں، بساطِ یاراں، شب نگاراں، جشن جاناں، سنگ و خشت، اسیر و زنجیر زنداں، میکدہ و ساقی، شیشہ و جام پیام و سلام، شراب و محبت، جور و ستم، یلغار و تسخیر دشت و چمن، صبا و صرصر، خون کف پا، کوچہ و دار، کاکل و رخسار، چوڑیوں کی کھنک، پھولوں کی مہک، رنگ و حنا، امروز و فردا، جام و مینا، عہد و پیماں، تصور جمال، باد نو بہار، کنج قفس، ایسی ہی ہزاروں تراکیب اور اصطلاحات ہیں جن سے فیض نے اپنی شاعرانہ زبان کی تشکیل کی ہے۔ مندرجہ بالا اصطلاحات اور الفاظ مظاہر اردو شاعری میں صدیوں سے رائج تھے۔ لیکن فیض نے انہیں نئی معنویت، نئے عصری شعور اور نئے علامتی انداز کے ساتھ ایسے برتا کہ ہر پیکر لفظ اور استعارہ فیض کے کسی نہ کسی خیال احساس جذبے اور آہنگ کا ترجمان بن کر رہ گیا ہے۔

فیض کی جن جملہ عصری تخلیقات میں اگرچہ غزلوں کی تعداد زیادہ نہ سہی لیکن یہ غزلیں فیض کی تخلیقی برتاؤ خاص لب و لہجہ اور طرز اظہار کے لحاظ سے اردو غزل گوئی میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ فیض نے غزل کی روایات اور احکامات کو پہلے سمجھا اور تب برتا۔ اس طرح انہوں نے پہلے غزل میں ممتاز صنف سخن میں اپنے خیالات اور احساسات کو نئی معنویت اور عصری حسیت کے تناظر میں پیش کیا۔ جیسا کہ آل احمد سرور اردو غزل کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے کرتے ہیں۔

" غزل بڑی کافر صنف سخن ہے۔ یہ
اشارے، کنائے، رمز و ایما، کم سے کم
الفاظ کے ذریعے زبان سے زیادہ سے
زیادہ کام لینے، معنی کی پرتوں کو برتنے
مدھم چراغوں کی لو سے ذہن میں
چراغاں کرنے کا فن ہے۔ یہاں
سورج کی تیز روشنی کا گذر نہیں
چاندنی کا جادو جگایا جاتا ہے۔ "

لمحے لمحے، ۱۹۸۶

آل احمد سرور کے اس فنی تجزیے کی روشنی میں فیض کی غزلیں بھی زبان و بیان کے اعتبار سے اشارات کنایات اور رمز و ایما سے ملبوس نظر آتی ہے۔ فیض کی غزلوں میں کمیت الفاظ سے معنی کی تہیں گھٹتی نہیں۔ بلکہ ابھرتی رہتی ہیں۔ یہاں لفظ و بیان کی وہ گھن گرج تلوار زنی اور پھاڑ نہیں ملتا ہے۔ جو ترقی پسندوں کا طرۂ امتیاز تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہاں ایسے پر اثر اور پرسوز الفاظ اور اشارے ملتے ہیں جن کو فلک و شگاف خطیبانہ انداز سے دور کا بھی واسطہ

فیض کی شاعری میں الفاظ مدھم چاندنی کی طرح
تے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن کی تاثیر دیرپا اور
تی ہے۔ فیض دراصل شعور کا ایک رچا ہوا
کھتے تھے۔ خواہ نظم یا غزل دونوں میں فیض
تے تھے بڑی سوجھ بوجھ اور بالیدگی کے ساتھ
۔ ان کی شاعری موضوعی اور ہیئتی اعتبار سے
ی اور عرق ریزی اور بے پناہ کاوش کی غمازی
۔ فیض کی لفظ شناسی کے سلسلے میں چند اشعار
یئے۔

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

پھر در دل پر کوئی دیتا ہے رہ رہ دستک
جانئے پھر دل وحشی کا طلب گار کون

دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں
دست فلک میں گردش ایام ہی تو ہے

فیض کی شاعری میں الفاظ اور اصطلاحات کا
ن انتخاب عکس ریز ہے۔ جو کہ مندرجہ بالا
سے بھی عیاں ہوتا ہے فیض ان چیدہ چیدہ
ے ایک ایسی شعری صورت حال کو تخلیق کرتے
سے قاری پر تحیر اور استعجاب کی سی کیفیت
ن ہے۔ اور وہ مختلف کیفیات و حادثات
چار ہوتا ہے لیکن ان کے احساس یا خیال
و تفہیم میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا اور
ے ان اشعار کے بنیادی مفاہیم تک پہنچنے کے
شرحی لغت کی ضرورت پڑتی ہے۔

فیض کی شاعرانہ تجربوں میں ایک مخصوص طرح پر رو نغمگی ملتی ہے۔ ان کے یہاں متغزلانہ شان اور غلامی لفظوں کی چمک دمک سے قائم ہے۔ جن میں ایک مخصوص لے، آہنگ، غنایت اور ترنم پایا جاتا ہے۔ فیض احساس اور جذبے کی شدت سے آہنگ میں مدوجزر پیدا کرتے ہیں اور رچے ہوئے علائم اور پیکروں سے اپنے جذبات کی مصوری کرتے ہیں۔ غزل گوئی میں انہوں نے جن بحروں کا انتخاب کیا ہے وہ بڑی ترنم، شگفتہ اور شاداب ہیں۔ فیض نامانوس بحروں کا استعمال کبھی نہیں کرتے۔ ان کی ردیفیں اور مصرعے ان کے جذبات کے بہاؤ اور تجربات کے موثر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اصل میں ان کے یہاں فطرت سے زیادہ انسان سے دردمندی اور غم خواری کا واضح اظہار ملتا ہے۔ اس اظہار میں غم دوراں کے حزن آلودہ فسانے عکس ریز ہیں اور غم جاناں کے پرسوز اور دھیمے گیت بھی جلوہ فگن ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض غم دوراں اور غم جاناں کی تپش سے جھلس چکے ہیں۔ پھر بھی جلنے کی کسک کو وہ لہجے کی شگفتگی سے اظہار نہیں کرتے بلکہ کسک کا فطری دھیما پن۔ لب و لہجے کی حلاوت اور پرسوز الفاظ سے برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے استعارہ سازی کے پس پشت لب و لہجے کی یہی اعتدال پسندی کارفرما ہے۔ جو وہ احساس کے طرز اظہار میں بھی روا رکھتے ہیں۔ فیض نے عشق و رومان اور محبت و انقلاب کا درد اپنے رگ و ریشے میں محسوس کیا تھا۔ اور اس کی ٹیس ان کو دھیرے دھیرے کریدتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ کرب انگیزی کی اس حالت میں ان کے یہاں سرِیلا پن ابھرنے لگا۔

اور ان کی زبان میں ایک مدھم، پرسوز اور دلنشیں آہنگ پیدا ہوا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ فیض اپنے "درد و داغ و سوز و ساز" کے اظہار میں تہذیب لفظ سے کام لیتے ہیں اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی لفظ اور استعارہ سازی میں خاموشی بہتی ندی کی پرسوز روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی لفظ سازی کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعر کے دل پر جو حادثات گذرتے ہیں۔ انہیں وہ پورے ضبط و ارتکاز کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ دل کے حادثوں کا یہ مصور، فیض چیدہ چیدہ استعاروں سے کس طرح پُرآہنگ اور دلنشیں اشعار سے منظر کشی کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

فیض کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی یہ آہنگ اور ترنم ملتا ہے۔ اصل میں ان کے یہاں غزل نما نظموں کے کامیاب تجربے نمایاں ہیں۔ جن میں خیال کے ربط تسلسل اور مخصوص آہنگ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں بھی تراکیب تشبیہات اور استعارات ایک مترنم روانی اور نغمگی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور تجربے کی داخلی ترتیب سے ایک کل وحدتِ تاثر کو پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں چھوٹی بحر والی غزلوں کی طرح مختصر نظموں کا التزام ہوا ہے۔ اور لمبی چوڑی بحر والی غزلوں کی مانند طویل نظمیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن انہوں نے ان دونوں اصناف کی تخلیق میں لفظ اور اصطلاح سازی کا عمل یکساں طور پر استعمال میں لایا ہے۔

فیض فن کے ماہر تھے۔ اور زبان کے بنیادی رموز سے آگاہ تھے۔ ان کے یہاں علامت نگاری کا برتاؤ بھی نمایاں ہے۔ ان کی علامتوں اور تمثیلوں میں توانائی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے علامتوں کی معنی آفرینی تجربے کی اندرونی سطحوں پر پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ علامت نگاری کا یہ شاداب انداز فیض کی لفظ شناسی کی ضمانت پیش کرتا ہے۔

فیض کی شخصیت میں نازک مزاجی اور عاشق مزاجی کا بڑا عمل دخل ہے۔ جس کا اظہار جا بجا ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں اعصابی، حیاتی، جذباتی، اور محسوساتی کیفیات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور ایسے نفسیاتی اور حیاتی پیکر بار بار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جو قاری کے بصری، لمسی، سمعی، شامی اور ذوقی حواس کو آسودگی بخشتے ہیں۔ فیض نے لفظوں کی بدولت حسیاتی تجربوں کی برمحل عکاسی کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان حیاتی تجربوں کی بھٹی میں خود تپ کر انہوں نے ان کا اظہار کیا ہے۔ اور قاری بھی ان کے تجربات کی گدگداہٹ سے اپنے حواس کو متحرک سا پاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہو۔

"اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی"

مجموعی طور پر فیض کی شاعری میں استعارہ اور لفظ

سازی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے شاعرانہ تجربوں میں لفظوں کا برتاؤ تعمیری اور تشکیلی نوعیت کا حامل نظر آتا ہے۔ جو شاعرانہ زبان کے پوشیدہ امکانات کو روشن کرتا ہے۔ اُردو شاعری کے صدیوں پرانے روایتی الفاظ اور اصطلاحات بھی متحرک نظر آتے ہیں بے شک الفاظ فیض کی علامت نگاری اور پیکر تراشی میں متشکل ہوئے ہیں لیکن فیض کی لفظ سازی کا عمل اس قدر جاندار اور توانا ہے کہ ان کے یہاں ہر فنی رجحان شاعرانہ روایت میں ایک قابل قدر اضافہ تصور کیا جاتا ہے جو فیض کے لفظ اور زبان کے رمز آشنائی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

٭٭

اور یہ ماں کی جیسے سب جانا ہے
تمہارے اجداد کی قبرستان ہے
اس سال پھر
کچھ نئے جھونپڑوں کا اضافہ ہو گیا
بیٹا! کچھ کرو ———
میں ان کو کیسے سمجھاؤں

عالم خورشید (پٹنہ) کراں!

بُزدل

کل پھر
گاؤں سے
ماں کا خط آیا ہے
بیٹا! کچھ کرو۔
پانی سے اونچا ہوتا جا رہا ہے
تمہارے کھیت کا، مکان پر
تمہارے چچا نے قبضہ کر لیا ہے
اس سال
بٹائی پر گئے کھیتوں سے
ایک مٹھی اناج بھی
تمہارے گھر نہیں آیا
تمہارے باغ کے
سارے آم، امرود کیلے اور پپیتے
بازاروں میں بک جاتے ہیں۔

تم نے بچپن سے
دودھ کی بوند کے ساتھ ساتھ
محبت، شرافت، سخاوت،
ایثار، صبر اور اہنسا کا
زہر پلا کر
مجھے بزدل بنا دیا ہے ——— بزدل
میں کیا کروں ———؟؟؟

شوپیس

تمہیں یاد ہے
ایک دن یہ زمین
اندھیروں کا مسکن تھی
اور تم ———
اس زمین پر
روشنی کی ایک قندیل لیکر آئے تھے
اور اس قندیل کے سہارے
تم نے اندھیروں سے
ایک لمبی جنگ لڑی تھی
اور پھر ———
مشرق
جنوب تا شمال
مغرب
اس قندیل کی روشنی
زمین کے ہر خطے پر پھیل گئی تھی ———
آج پھر ———
ہر سمت
انہیں اندھیروں کی حکمرانی ہے،
کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا
تم ———
ہر قدم پہ ٹھوکریں کھا کر گرتے ہو
مگر نہ جانے کیوں
تمہیں اس قندیل کی یاد
کبھی نہیں آتی
جیسے تم نے
خوبصورت اور قیمتی
کپڑوں کے غلاف میں لپیٹ کر
نقش جزدان کی صلیب میں
سلیقے سے اپنا سجا دیا ہو
جیسے وہ
تمہارے ڈرائنگ روم کا

اظہر نیّر

"سائے"

آج پھر
کون آئے گا اس وقت
کون آئے گا
اور دروازہ کھٹکھٹا کر کہے گا

باہر چلو
ایک پوری دنیا
تمہارے انتظار میں کھڑی ہے
اس وقت
جب گلی چلنا چھوڑ کر
سو چکی ہے
جاگنا فضول ہے
یوں تو آج صبح صبح
صبح نے آواز دی تھی تمہیں
تم سو رہے تھے تب
اب صبح تو صبح ہے آخر
کل صبح ہی آئے گی
کل صبح تک جاگتے جاگتے
تھک جاؤ گے
لیکن
کل بھی تو سائے تھے تم
اور آج پھر !!

"آواز"

سنا تم نے
ٹھیک اس وقت
جب میں نے تمہیں یاد کیا
سنی تم نے
گونجتی آواز
جس نے رات کا سناٹا چیر کر
ہمارے بیچ کی دوری
طے کی ایک سکنڈ میں
جبح ہوئے گراموفون کے توے پر
آج بھی اٹکی ہوئی
اٹکی رہی
دیر تک
سنا تم نے !!

نظام ہاتف

ساون کا اندھا

شریف خون
آخر گھر میں
گلابی گلابی
خواب ناک وادیوں میں حسرتیں
پالے کی ماری !
الفاظ کی کاشت
بے ثمر
انگلیاں سلگ سلگ کر
پگھل پگھل کر
حرف کاغذ کو کالا کر سکیں
عبارت، روشنی کی ضامن کو بھی
مگر بصارت سے محروم
آنکھیں
کاش ساون کی اندھی ہو تیں
ہرا ہرا نظر تو آتا کم از کم

عدم توازن

یہ میری بھی بے بضاعتی کیا
میں کتنا مجبور اور پابند
کبھی میں ناممکن العمل بھی
مری ہر اک یافت کتنی کم کم
بس اک تردد مطر و سا
فرار بھی جس سے غیر ممکن
شعوری سطح بھی واہم سی
نفس نفس میں عدم توازن

واحد بیگ شمسی

پھولوں کے ہنسنے کی ادا اور ہی کچھ ہے
جب آئے گلشن کی فضا اور ہی کچھ ہے
پتہ دے اسے لفظ نہ ترکیب نہ سمجھو
اس ٹوٹے ہوئے دل کی صدا اور ہی کچھ ہے
در اصل وفا میں ہے نہاں روحِ محبت
لیکن روشِ اہلِ وفا اور ہی کچھ ہے
اے عیش کے متوالو کہاں عیش میں رہ کے
آلام میں جینے کا مزہ اور ہی کچھ ہے
واحد مہ و خورشید بھی کچھ کم نہیں لیکن
ان کے رخِ روشن کی ضیا اور ہی کچھ ہے

خاور خان سرحدی

کب کاشانے میں بجلی آئی
رنگ برنگی تتلی آئی
بھول گئی سب قصے غم کے
بانہوں میں جب پگلی آئی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے
یاد تری جب پچھلی آئی
دور ہوئی تاریکی غم کی
مفلس کے گھر بجلی آئی
اس کی صورت خواب میں خاور
کچھ اجلی اور دھندلی آئی

عرفان پیرضوی

زندگی نور بھی خوشبو بھی ہے نغمگی بھی ہے
زندگی دھوپ بھی تپتا ہوا صحرا بھی ہے
باتیں ہمدردی کی کرتے ہیں یہاں سب لیکن
بانٹ لے دکھ جو کسی کا کوئی ایسا بھی ہے؟
یوں تو شیشے کئی ٹوٹے ہوئے دیکھے ہوں گے
دل کسی کا کبھی ٹوٹا ہوا دیکھا بھی ہے؟
اس کو نزدیک سے دیکھا ہے کبھی ہم نے لیکن
زندگی کیا ہے کسی نے اسے سمجھا بھی ہے؟
چاند کی مٹی پرکھنے کو چلے ہو عرفان
اپنی مٹی کو کبھی آپ نے پرکھا بھی ہے؟

اظہر نیر دربھنگوی

جانا ہے جس کا سایہ شجر وہ ببول ہے
قسمت میں میری آج بھی سڑکوں کی دھول ہے
بے جرم دار پر چڑھے قاتل ہو سرخرو
قانون کا ہمارے یہاں یہ اصول ہے
جب آئینے پہ صبح نظر اپنی پڑ گئی
تب دوسروں کے چہرے کو پڑھنا فضول ہے
دہقاں کو جلتے کھیت کی فرحت کہو ایسے
باراں جو گھیر لائے وہ اس کا رسول ہے
بس آپ سے تعلقِ خاطر کے واسطے
حسرت لئے کہ دل مجھے سب قبول ہے

خاور خان سرحدی

جو قطرے تھے سمندر ہو گئے ہیں
مقدر کے سکندر ہو گئے ہیں
جوابِ خط میں اس نے یہ لکھا ہے
ترے الفاظ پتھر ہو گئے ہیں
ہمیں ٹھکرا دیا جب سے خوشی نے
غموں کے ہم بھی خوگر ہو گئے ہیں
نگر میں باڑھ آئے گی لہو کی
یہ سن کر سب ستمگر ہو گئے ہیں
نہ کر فریاد خاور اب کسی سے
یہاں دل سب کے پتھر ہو گئے ہیں

عطا عابدی (دربھنگہ)

خانۂ خوں کے بام و در اجالوں کی انگنائی چھین
زیست میں ہر کوئی رعنائی تو تنہائی چھین
میں بھی اپنی بات اگر چاہوں تو منوا لوں مگر
مصلحت نے مجھ سے لی ہے قوتِ گویائی چھین
لاتِ تعلیم ہو گا پھر نہ کوئی در کبھی
آپ نے مجھ سے لیا گر وہ قدح پیمائی چھین
ان دنوں خلوت نشینی کی ضرورت ہے مجھے
مجھ سے تو میرا خیالِ انجمن آرائی چھین
کل شہنشاہی ہو گی سر سے تاجِ زندگی گر پڑے
اے عطا اس وقت نے آقا کو آقائی چھین

سہیلی

جبیب سوز

نیک ساعت دعا اثر کب تک
آگ میں کاغذی یہ گھر کب تک
دور جا کر سماعتیں رکھ دے
لوگ دیں گے بھلا خبر کب تک
اور کچھ روز کی یہ دنیا ہے
شاخ روکے گی یہ ثمر کب تک
کاوشوں کو سجا کے رکھتا جا
پیدا ہوں گے نہ دیدہ ور کب تک
دشت میں سوز جانے والوں کو
روک پائے گا یہ نگر کب تک

حبیب مشوان

بچپن کی رفاقتوں کے وہ احوال بھی گئے
سوچوں سے میری اس کے خدوخال بھی گئے
پہلے تو دل شہر آزاروں پہ تھے خفا
پھر یہ ہوا کہ میرے پروبال بھی گئے
ہو گی یہ شاخ خواب ثمر دار کب تلک
آثار رت بدلنے کے امسال بھی گئے
بے انت مدتوں کا ہے باقی سفر ابھی
نازاں تھے جن پہ ہم وہ مہ و سال بھی گئے
تبدیل ہو گئیں ہیں خدا کی عبارتیں
وہ کیا گیا کہ شہر کے اشکال بھی گئے

شمیم قاسمی

دل کو سب سے گلہ نہیں
ہر حسیں دل ربا نہیں
زندگی نام ہے تحفّیہ
وقت یکساں سدا نہیں
وہ مری رہنمائی کرتا
جب کوئی راستہ نہیں
وصل یا ہجر کوئی موسم
زخم دل کا ہرا نہیں
زندگی زندگی نہیں
جب کوئی حادثہ نہیں

راشد صدیقی

کوشش تو بہت کی ہے میں نے کاغذ پہ اسے لے آنے تک
ڈرتا ہوں مگر ہر بات ان کی پہونچے نہ کہیں افسانے تک
گم ہوش ہوا نبضیں ڈوبیں جن دیکھے انھیں یہ عالم ہے
کیا حالت ہو گی دل کی مرے نظروں سے نظر ٹکرانے تک
جب فصل بہاراں میں ہر گل کھلنے سے پہلے سوکھ گیا
گلشن کی فضا کیسی ہو گی اس بار خزاں کے آنے تک
مجبور رہو لاچار رہو ہر حال میں غیرت لازم ہے
پھیلاؤ ضرور اپنا دامن تم دوست مگر پھیلانے تک
کس درجہ محبت رکھتے ہیں یہ اہل خرد دیوانے سے
ان کی ہی بدولت اے راشد ہم دیکھ آئے ویرانے تک

عمران عظیم

دیوانوں کی راہ میں کوئی طلب
طوفانی شوق تھا کبھی آنکھوں میں اب
کس آس پہ اندھیرے اجالے کو دو دن
کوئی کبھی دن برا نہیں کوئی بھی شب
پھیلا کے ہاتھ دل میں یہ کیا سوچتے ہیں
لب پر دعا نہیں کہ دعاؤں پہ لب
مصروف کار رہتے کئی دن سے
دشوار ہو شناخت بھی اپنی عجب
دیوانگی عظیم اسے کہہ رہے ہیں
صحرا نورد ہوں تو کوئی بے سبب

نسیم جہاں آسی
پتھارا، مغل سرائے، بنارس

کیا جواب دوں؟

بڑے لیڈروں کے مرنے کے فائدے کئی ہیں۔ ایک فائدہ یہ ہے کہ ان کے نام پر ہسپتالوں، کالونیوں، سڑکوں اور بچوں کے نام رکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں اچھے ناموں کا ٹوٹا ہے۔ جلدی کوئی اچھا نام ملتا ہی نہیں۔ بانس پھاٹک ـــ کچہری، لہورابیر...... نہ جانے ان ناموں کو کس لیڈر کا ہے یہ پوسٹ شاستری کراسنگ سے پہلے گونا ہاتھ رہتا تھا۔ سارے کوڑا کرکٹ یہیں پھینکے جاتے تھے۔ پاس ہی نگر پالیکا کا دفتر ہے جسے موڑ میں آ جائے تو رُک پایا جا سکتے ہیں۔ چھٹی کے گھنٹوں میں سارے لٹ کے بیکار ہی شامل ہو جاتے ہیں اس وقت بھیڑ زیادہ ہوتی ہے گاہک کم نظر آتے ہیں۔

کافی اوپری منزل پر کریم بھائی کی ہمدرد کی دکان ہے استعفون ہو گئے کریم بھائی اپنے آپ کو ابھی کوڑا بھنڈار میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ گاہک بہت کم اوپر پہونچ پاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ نیچے ہی کی دکانوں سے دوائیں لے لیتے ہیں۔ گاہک کو نیچے ہی ضرورت کی چیز مل جائے تو اوپر کی چیز کون پوچھتا ہے۔ کچھ لوگ ڈاکٹروں کے ساتھ جانے سے کچھ بکری ہو جاتی ہے۔ یہی بکری سے دکان کا کرایہ اور کریم بھائی کی تین سو روپے ماہوار تنخواہ کسی طرح آ جاتی ہے۔

نجمہ کی شادی ہوئی تو کتنی خوشی ہوئی۔ ایک بوجھ سر سے اترا تھا۔ لیکن شادی کے بعد معلوم ہوا، لڑکی ہمیشہ سر کا بوجھ رہتی ہے، جو کبھی نہیں اترتی۔ چھ ماہ سے نجمہ کریم بھائی کے یہاں رہ رہی ہے کاروبار مندہ ہے اگر داماد نے اسے یہاں پہونچا دیا۔ چھ مہینوں میں وہ اس کی خبر لینے بھی نہیں آیا۔

دوپہر کے گیارہ بج گئے ہیں، سورج کا رخ کریم بھائی کی دکان کی طرف سیدھا پڑ رہا ہے۔ سورج بھی ان کا لہو چاٹ رہا ہے جبکہ کریم بھائی کے جسم میں لہو ہی نہیں ہے انہوں نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا ہے وہ سامنے ہمدرد کی دواؤں کو دیکھ رہے ہیں ۱۰ دنوں میں کتنے کمزور ہو گئے ہیں انہیں کوئی معجون مقوی مزید لینا چاہئے۔ معجون مقوی لیتے ہیں اس کی بھی قیمت تنخواہ سے کٹ جائے گی...... پھر مہینے بھر کا خرچ بھی تو چلانا ہے۔ کاروبار نہیں چل رہا ہے۔ تو یہ کیا شرافت ہے نجمہ کے ساتھ اپنے کو بھی یہاں پہونچا دیا ـــــ یعنی اپنے چار بچوں کو بھی۔

لوگ کہتے ہیں داماد حرامی ہے لیکن جس کا باپ زندہ ہے وہ حرامی کیسے ہو سکتا ہے؟

"ہو سکتا ہے۔"

"کیسے؟"

اگر اس کا باپ اپنے پانچ بچوں میں سے صرف چار ہی کا

باپ ہو۔

کتنی بار ماں بیٹی میں جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا صاحب تک پہنچا
آخر تجمہ کا کیا قصور ہے؟ لڑکی ہے نا، لڑکی کی قسمت میں دربدر
ہی لکھا ہوتا ہے۔ ایک بار باپ اسے دربدر کرتا ہے پھر شادی
کے بعد شوہر جب چاہے اسے دربدر کر سکتا ہے ——
لیکن ماں بھی کیا کرے۔ تین سو روپیوں میں وہ اپنے پانچ بچوں کو
پالے یا تجمہ اور اس کے بچوں کو دیکھے۔

کریم بھائی نے کاؤنٹر کی دراز سے اپنا معمولی سا آئینہ
نکال لیا ہے۔ جب جی میں آتا ہے وہ کبھی کبھی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ
لیتے ہیں۔ جو چہرہ ہی نہیں۔ داڑھی کے بال بڑے ہونے سے معلوم
ہوتا ہے جیسے وہ بیمار ہیں۔ چہرے پر جھریوں کا انہیں پہلی بار
احساس ہوا ہے۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر آئینہ رکھ دیا
ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔

اب تو سمجھ بھی کبھی کبھی بیمار رہتا ہے تجمہ کو بھائی کی
بیٹی [illegible] طرح محسوس ہوتی ہے۔ تجمہ سے تو وہ ادھم کے
منہ سے بول بھی لیتا ہے لیکن اس کے بچوں سے اسے نفرت سی
ہوتی ہے وہ اکیلے ہی انہیں ڈانٹ بھی دیتا ہے۔ وہ انہیں کتنی ہی
حقیر نظروں سے دیکھتا ہے وہ بھی جیسے مہینہ صاف سو روپے کا کر
لاتا ہے۔ لیکن اس کے بچے تو تین بچے ہیں۔

کریم بھائی نے کس طرح ایک چھوٹا سا مکان بھی بنا
لیا ہے۔ ایک کمرہ انہوں نے کرائے پر دے دیا ہے۔ بیس روپے
ماہوار مل جاتے ہیں۔ اس سے گھر کا خرچ چلانے میں کچھ مدد مل
جاتی ہے۔ دو کمروں میں وہ خود رہتے ہیں۔ پہلے بھی وہ جب
کرائے کے مکان میں رہتے تھے دو ہی کمرے تھے۔ اس لئے کرائے
کے مکان کی عادت اب بھی پڑی ہوئی ہے۔

بیوی کے [illegible] خاص [illegible] سی
تو رہتا ہے کہ وہ گھر میں ہے۔ انہوں نے دروازے پر ایک
پردہ لگا دیا ہے۔ یہ وہ احساس کہ گھر میں داخل ہوتے ہیں تو بیوی
کا ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ساتھ کا خوشگوار احساس پیدا کرتا تھا
بیوی نے کتنی بار کہا ہے، ہائے سب یہاں ہیں نے میرا نام
نفیس جیسے ہی رکھا ہے۔ جبکہ اس گھر میں کبھی نفیس والی نہیں
رہی۔ بیوی کی یہ بات سن کر کریم بھائی کو محسوس ہوتا ہے انہیں
کسی [illegible] کا تالا یاد لگا دیا ہے۔ جس کے نشان اس کے جسم پر تو
نہیں ہیں، دل میں بے شمار ہیں۔ جنہیں وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتے۔

ابھی ابھی پوسٹ مین کاؤنٹر پر ایک خط رکھ کر چلا گیا
ہے۔ خط تجمہ کے شوہر کا ہے۔ کریم بھائی کو ایک عجیب خوشی
ہو رہی ہے۔

شاید داماد کا دل وہاں قابو میں آ گیا ہے ——
اور وہ تجمہ کو لینے آ رہا ہے۔ خط میں آنے کی تاریخ مقرر کی ہے۔
اس کی رخصتی کے لئے بھی تو کچھ انتظام کرنا ہوگا اسے اور اس کے
بچوں کو رخصت کرانے ہوں گے۔

[illegible] ایک بہت سا جبر نکالا اور کریم بھائی کو سمجھ میں آ
گیا —— سب سے پہلے بچوں کے کپڑے جو پھٹے ہوئے
لیکن وہ انہیں محسوس نہ کر سکے تھے لیکن آج یہ جھونکا.....

خط کیا آگیا ہے وہ خود آ گیا ہے۔ اُف! کتنے انتظار
کے بعد! انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا۔ خط پڑھ
ڈالا۔ جیسے جیسے رنگ زرد ہوتا گیا۔ جو خون جسم میں تھا وہ بھی
جانے کہاں چلا گیا خط میں لکھا ہے، وہ کبھی جانا چاہتا ہے وہاں
وہ کوئی کام تلاش کرے گا۔ جواب دیں وہ جائے یا نہ جائے۔

کمبخت جواب —— ؟ انہوں نے [illegible] جیتے
کس طرح گذارے۔ وہ سب ایک تصویر کی طرح ان کی آنکھوں
کے سامنے پھرنے لگی —— انہیں اس وقت کیا بات یاد آ گئی۔
جب [illegible] بیوی نے کہا کہ منا دو دن سے بخار میں [illegible] ہوتا جا رہا ہے
جو [illegible] کے بچوں کے لئے بسکٹ کا ایک پیکٹ بھی نہیں

...بچے تو تھک کے بھی بسکٹ کے لئے رونے لگتا ہے اور اسے
...سے چھپ کر لانا پڑتا ہے۔ اتنے دنوں سے گھر میں ایک
...چیز بھی آ رہی ہے۔ کوئی بھی یا نئی چیز نہیں بکی۔ بچہ کا
...لگتا ہے وہ اپنے بھائی باپ پہ ایک ناجائز بوجھ ہے۔
...پو کر بھی نہیں سکتی۔

کریم بھائی نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی —— وہ
...سے گندے کپڑے پہن رہے ہیں۔ صابن آتا ہی کتنا ہو
...کہ سب کپڑے نہیں دھل سکتے۔ وہ پریس کیا ہوا کپڑا
...سکتے تو صرف دُھلا ہی سہی لیکن نجمہ کے آنے کے
...سے گھر کا خرچ بڑھا ہے وہ بغیر پریس کے کپڑے بھی نہیں
...اور انہیں صاف کپڑے پہننے کا کتنا شوق ہے ——
...جو کا مدیں تو یہ شوق پورا ہو سکتا ہے۔ کپڑے صاف
...انسان کا اپنا وجود کتنا خوب صورت، کتنا اچھا
...لگتا ہے۔ بدن کا حسن صاف ستھرے کپڑوں میں ہے
...لیکن بھائی کیوں نہ جانے انہیں محسوس ہوا جیسے وہ
...انسان ہوں جس سے دوسروں کو کاٹ... تو صاف ہو رہے

ہیں لیکن ان کا اپنا وجود گھٹتا جا رہا ہے۔

شادی ہونے سے کوئی لڑکی پرائی نہیں ہو جاتی۔ خون کا رشتہ ختم نہیں ہو جاتا۔ صرف گھر بدل جاتا ہے۔ بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر کو چلی جاتی ہے۔ وہ ایک گھر چھوڑ آتی ہے۔ دوسرے میں مرتی رہتی ہے۔ کریم بھائی نے نجمہ کو سب سے زیادہ پیار دیا ہے۔ لیکن آج وہ پیار ایک بوجھ بن گیا ہے شاید اس لئے کہ اس میں دوسروں کا بھی بوجھ شامل ہے۔

وہ خدا کی عبادت پر غور کرنے لگے —— یعنی جانے کا مطلب، وہ [illegible] —— ان کو یہاں چھوڑ کر —— اور وہ کب تک اکیلا ان کا بوجھ برداشت کرتے رہیں، کب تک —— ؟

کریم بھائی نے اپنا سر پکڑ لیا ہے —— سورج کا منہ سیدھا کریم بھائی کے چہرے پر پڑ رہا ہے۔ وہ تپتے ہوئے سورج کا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں —— اور وہ کہہ رہے ہیں ——
خدا کا کیا جواب دوں —— ؟؟

●●

پرچھائیں

دیویندر ٹھواری

جانے کیوں لوگ اپنے ہی سائے سے ڈرتے ہیں۔؟۔!! میں تو نہیں ڈرتا ہوں۔ کیوں ڈروں بھلا؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ مگر کیا یہ سائے بھی کسی سے ڈرتے ہوں گے ؟

ہاں !۔ ہاں !! تاریکیوں سے۔ تاریکیاں سایوں کو دبوچ ڈالتی ہیں نا۔ مگر تاریکیوں میں تو ہم بھی کہیں نظر نہیں آتے ـــ! اُف۔ ڈراؤنا اندھیرا۔ بھیانک تاریکی!! بھگوان بڑا مہربان ہے جو رات میں ہم سب کو سُلا دیتا ہے ورنہ جانے کیا ہوتا ـــ لوگ آنکھ بند کر کے خواب دیکھنے کے بجائے رات کو کالے بھوت دیکھ لیتے مگر یہ سائے ہیں کیا؟ ـــ؟ شاید اسی ڈراؤنے اندھیرے کے چند ٹکڑے جو کبھی آگے نظر آتے ہیں۔ کبھی پیچھے نظر آتے ہیں اور کبھی دائیں نظر آتے ہیں اور کبھی بائیں نظر آتے ہیں۔ کبھی چھوٹے کبھی بڑے۔ یہ سائے دیکھ کر اپنا آپ قطب مینار نظر آتا ہے اور کبھی بت کے کسی ٹکڑے کی طرح بونا! مگر ایک انسان کا ایک ہی سایہ ہوتا ہے نا؟ پھر میرے دو سائے کیوں ہیں؟؟ نہیں نہیں تب نہیں جب روشنی پیچھے سے آ رہی ہو۔ فقط اس وقت جب روشنی سامنے ہو ـــ چڑھتے سورج کی طرح ـــ! صبح سویرے جب میں مندر جاتا ہوں تب ایک لمبا سایہ میرے آگے آگے چلتا ہے۔ گویا باپ اپنے بیٹے کو انگلی پکڑ کر مندر لے جا رہا ہو۔ لیکن جب میں گھر لوٹتا ہوں تب مجھے اپنے پیچھے دو سائے نظر آتے ہیں ـــ! ایسا کیوں ہے؟ ـــ؟ ہاں ہاں سمجھ گیا ـــ یہ دوسرا سایہ شاید اسی شخص کا ہے جو نہ جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے پہلے یہیں تو کبھی کبھار تنگ کیا کرتا تھا مگر اب روز ہی تنگ کرتا ہے۔ وہ دفتر میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے یا میرے ساتھ چلا کرتا ہے اور اچھل کر میرے پیچھے کھڑا رہتا ہے؟ یہ کوئی بھوت پریت تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان کا سایہ ہوتا ہی نہیں۔ ہاں ! ہاں !! یہ میرا وہم ہو سکتا ہے۔ مگر کیسے؟ ـــ ؟

ہا۔ ہا۔ ہا ـــ ارے وہم کمزور دل والوں کو ہوتا ہے۔ میں بہت مضبوط دل کا آدمی ہوں۔ عزم ہے ارادہ ہے ـــ ورنہ جو کچھ میں دن بھر یہاں بیٹھا بیٹھا کر رہا ہوں یا کرتا رہا ہوں کیا کوئی دوسرا کر سکے گا؟ ـــ! ـــ؟؟

ـــ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں !۔ لیکن ایک بات ہے۔ اگر یہ میرا وہم نہیں ہے تب تو مجھے اس شخص کی موجودگی کو قبول کرنا چاہئے۔ اور اب تو یہ ثابت بھی ہو چکا ہے!

بے شک اس کی آواز ایک سرسراہٹ کی طرح سنائی دیتی ہے ۔ مگر آواز تو ہے ۔ بے شک اس کا وجود ایک جنبش کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر کوئی تو ہے جو میرے پیچھے ، کبھی فائلوں کو ادھر ادھر کرکے بڑبڑاتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں ان فائلوں کو دراز میں رکھنا چاہئے۔ پرانی فائلیں ہیں ـــ خواہ مخواہ بڑبڑاتی رہتی ہیں۔ نئی فائلیں آجائیں گی تو شاید یہ روز روز کی پریشانی دور ہو جائے۔ مگر نہیں !! ـ ہائے میرے ربا ـــ کون ہے یہ شخص ؟ ـــ ؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے ؟ آخر کوئی کسی کے پیچھے کیوں پڑ جاتا ہے ۔ حکمران پارٹی کے پیچھے مخالف پارٹی ۔ چور کے پیچھے سپاہی ـــ سپاہی کے پیچھے افسر ـــ افسر کے پیچھے منسٹر اور منسٹر کے پیچھے اخبار ـــ ! ہاہاہا ـــ اخبار کے پیچھے معاشرہ ـــ معاشرے کے پیچھے سیاست ـــ اور سیاست کے پیچھے ۔ ؟ ؟ کون ہے سیاست کے پیچھے ؟ خیر مجھے کیا ـــ ذکر اپنا فکر اپنی خیال اپنا کہانی اپنی ۔ مگر ! مگر ! مگر ؟ ؟ ـــ یہ ـــ یہ اخبار میں ملتی جلتی کہانی کیسے آگئی ۔ کیا وہ سب کچھ جانتے ہیں ۔ ؟ کیا وہ شخص میرے پیچھے چھپ کر کہیں بیٹھا ہے ۔ کیا وہی خبر رساں ہے ؟ اسے تو کیا ہوا ۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر کیا ہوا ۔ ؟ کچھ نہیں ہوا ۔ یکسانیت کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے ـــ عام انسان کا کیسے بھلا ہو سکتا ہے ۔ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ گویا کارل مارکس ہی تھا جو یکسانیت کے بارے میں سوچ سکتا تھا ۔ ارے مجھ سے پوچھ لو ـــ میں بتاتا ہوں ۔ اور بھی تو طریقے ہیں ـــ آزمودہ فارمولے ہیں ۔ اکائی کا قاعدہ کس کو نہیں آتا ۔ ذرا غور فرمائیے اگر ایک ہزار روپے تنخواہ والے افسر کی ایک لاکھ کی کوٹھی کسی کی آنکھ میں کھٹکتی ہے تو بھائی جان ـــ مہربان ـــ قدردان ذرا سوچئے کہ پانچ ہزار روپے تنخواہ لینے والے کی بیس لاکھ کی کوٹھی کیوں نہیں کھٹکتی ؟ ارے رہنے بھی دو پدرم سلطان بود ـــ پندرہ سال پہلے تو وہ منسٹر کا پی اے تھا ۔ اب سکریٹری بن گیا تو کیا ہوا ـــ آمدن دیکھو ـــ خرچہ دیکھو ـــ ان کے اثاثے دیکھ لو کیا وہ ہوا اور پانی پر گزارہ کرتے ہیں ۔ خیر ہمیں کیا ـــ اخبار والے نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا ۔ ورنہ ہم ہی اس جہان کی فکر کیوں کریں ۔ ؟ اپنا کام کریں تو بہتر ہے ـــ ہاں یاد آیا ۔ کم بخت فائل نہیں مل رہی ہے ۔ کہاں ہے وہ ؟ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ایسی فائلیں خزانے کی طرح کیوں گم جاتی ہیں ۔ جی ہاں آپ کو شاید معلوم نہیں ۔ صدیوں سے یہی چلا آرہا ہے ۔ خزانہ یہاں دفن کر لو ۔ نشان بھی رکھ لو مگر تلاش کرو تو وہ یا تو ملتا نہیں اور اگر مل بھی گیا تو کسی اور جگہ ۔ وہ فائل بھی کسی دوسرے میز پر تو نہیں چلی گئی ہے ۔ ؟ جا تو سکتی ہے ۔ ایسی فائلوں کے پر لگے ہوتے ہیں نا !۔ مگر میں نے تو پر کاٹ کر جیب میں ڈالے تھے ۔ کمبخت کہاں گئی ہے کہاں گئی ؟ ـــ یہ کون ہنس پڑا ؟ کون ہے ؟ کون ہے وہاں ـــ ؟ ہونہہ ـــ ہوگا وہی ـــ مگر نہیں یہ تو فون کی گھنٹی ہے ۔ اُف ـــ بچا لو میرے مولا ـــ یہ گھنٹیاں بھی پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہیں ۔ ملک میں آندھی طوفان آتے رہتے ہیں اور بیچارا فون کی گھنٹیاں ـــ ہونہہ ـــ ہیلو ـــ بیٹا تم ؟ خیریت تو ہے نا ۔ ارے ارے یہ تم بات کر رہے ہو یا اعلان جنگ ۔ کیا زیورات کس کے لئے ؟ مگر تمہارا باس تو ـــ ارے بیٹی اس کی بات چھوڑو وہ ۔۔ اس کا

؛ب کمشنر ہے ۔ اچھا بابا چلاؤ مت ۔ چیک نہیں
دوں گا، کیش ۔۔ کہہ دو کل آجائے۔ بیٹی دس ہزار
، رقم بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ بول کہاں سے رہی ہو؟
یہ بیچ میں کس کی آواز آرہی ہے۔ ہاں کرائی اور نمبر
ٹ تھ مل گیا ہوگا ۔ کہاں سے؟ فردوس جیولرز ۔۔ سب
بیں نہیں اور کچھ مت لینا۔ ارے پھر کیا ہوا جو قسطوں
.مل رہا ہے۔ تم بہت ضدی ہو ۔۔ اپنی ماں کی طرح.
ف یہ ریسیور بھی کبھی کبھی یوں نظر آتا ہے جیسے ہاتھ
ں ایک کالا ناگ ہے۔ پھن پھیلائے ۔ خون کا
یا قصور ۔۔ خون کرنے والے ہی تو کٹھور ہیں ۔۔
،راصل یہ تاجر لوگ بھی تو بڑے کٹھور ہیں۔ کھٹملوں
.طرح گدوں میں گھس جاتے ہیں۔ اچھا ہوا جو ان
دانت نہیں ہوتے ورنہ خون چوسنے کے ساتھ ساتھ
ناید ہماری ہڈیاں بھی دبوچ ڈالتے۔ ان لوگوں
پالیسی تو دیکھ لو ۔۔ ساڑیاں لو تو قسطوں پر ۔۔
یورات لو تو قسطوں پر۔ فرج VCR اور بھی
،ائش کی چیزیں دستیاب ہیں تو قسطوں پر۔ مگر بھلے
،ذ کیا کبھی کسی نے مریض کو خون کی بوتل قسطوں پر
ہے؟ کیا کبھی کسی ڈاکٹر نے آپریشن کی فیس قسطوں
،لی ہے؟ ہونہہ ۔ مگر میں کیوں سوچ رہا ہوں ان
یزوں کے بارے میں۔ میرا بھی کیا قصور، وہی شخص
یا اپنا ٹیپ آن کر کے مجھے ایسی باتیں سناتا رہتا
ہے تا ۔۔ میرا برین واش کر رہا ہے کیا؟ مگر میں بھی
ان ماننے والا ہوں اس کی باتوں کو ۔۔ ارے
نم میں جائے وہ ۔۔ یہ ۔۔ یہ جہنم کیا ہوتا ہے؟
، جہنم وہ ہوتا ہے جو جنت نہیں ہوتا۔ اور اگر
بند کمرہ جنت ہے تو ظاہر ہے چلچلاتی دھوپ

جہنم ہے۔ مگر میں کیوں سوچ رہا ہوں جہنم کے بارے
میں ۔ جہاں جانا نہیں وہاں کے بارے میں سوچنا بے کار
ہے۔ ہے کہ نہیں ۔۔؟ بھگوان تو بڑا مہربان ہے مگر
کیسا بھاگیہ لکھا ہے میرا ۔ تمہارا بھی کوئی قصور نہیں۔
جان گیا ہوں تمہیں ۔ بیوی کو کہتا ہے فون کرو ۔۔
ایرکنڈیشنر منگوالو ۔ اور مجھ سے کہتا ہے کہ فائل والے
کو فون کرو ۔ یہ کیا لکھا ہے تم نے میری جنم پتری میں؟
ارے بتا دے؟ شرماتا کیوں ہے؟ نہیں کیوں لگا کر مجھے
ٹاٹا یا برلا کیوں نہیں بنایا ۔ مگر ایک بات بتا دے۔
لوگ ہاتھی کی چنگھاڑ سے کیوں ڈرتے ہیں بیوی
کے فون سے کیوں نہیں۔ خیر جنم پتری میں جانے کیا
لکھا ہے مگر اس فائل میں یہ مزید لکھا ہے کہ میں
ہاتھی خرید سکوں گا ۔ ہا... ہا... ہا.... ہا....
ارے یہ کون گھور رہا ہے مجھے ۔ وہی ہوگا ۔ کم
بخت اب دریچوں سے جھانک کر دیکھ رہا ہے۔
کچھ بھی ہو ۔۔ ہے یہ شخص کوئی مشکوک کردار ۔۔!
ہوتے ہیں بھلا ایسے لوگ ۔ بس میں بیٹھے بیٹھے خواہ
مخواہ آپ کو گھورتے رہیں گے۔ آپ گھبرا کر پوچھیں
گے کہ بھئی کیا بات ہے تو وہ جواباً کہہ دیں گے۔
آپ کے پاس ماچس ہے۔ کیا معلوم یہ شخص بھی
کہہ دے میں خون کرنا چاہتا ہوں ۔ کر لوں ۔ ہاں
ہاں کر لو بھئی ۔ سامنے رکھا ہے ۔ مگر ذرا ٹھہرو۔
ایک فون آنے والا ہے ۔ جی ہاں فائیل والے کا۔
دیکھو بھئی یوں ملتجی نظروں سے مجھے مت دیکھو۔
میں جانتا ہوں کہ تم میری کیفیت بھانپ گئے ہو۔
اور یہ جان گئے ہو کہ میں جذبات کی رو میں بہہ
جاتا ہوں ۔ مگر یہ تو ہے تمہارا ۔ چند چھوٹے آنسوں

کو روکنے کی خاطر میں اپنے احساسات کا خون نہیں کرتا تا؟ — ارے کبھی اونچے لہجے میں کوئی بات اونچی نہیں ہوتی۔ ہاں تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو بھئی کہ پھر مجھے جذبات کی صداقت میں سیلاب کا پانی کیوں نظر نہیں آتا۔ جنون کی دکھاوٹ اور گفتگو کے کھوکھلاپن میں بھیانک عکس کیوں نظر نہیں آتے۔
ہاں ہاں۔ میرے خاموش چہرے کو دیکھ کر سبھی سمجھ لیتے ہیں کہ مجھ پر حاوی ہو چکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بہہ جاتا ہوں ایک بے سہارا پتھر کی طرح جو ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے کسی چٹان سے ٹکرا کر — مگر تم کیوں ہنس رہے ہو میرے حال پر۔ لو۔ تمہارے قہقہوں کو بھی فون کی گھنٹیوں نے دبوچ ڈالا ہے۔ ہا۔ ہا۔۔ ہا۔۔۔ ہیلو۔ لو کٹ گیا — کس کا فون تھا؟ میری بیوی کا ہوگا — یہ تو فائیل بھی مل گئی۔ ارے واہ۔ یہ تو سونے کی کان ہے۔ لگتا ہے میری بیوی کو الہام آجاتا ہے۔ اسی کا فون ہوگا۔ پھر آئے گا۔ آنے دو — فکر کس بات کی۔ یہ پربھو حساب وکتاب برابر رکھتا ہے نا۔ ایک سے لے کر دوسرے کو دیدیتا ہے۔ یعنی فائیل والے سے لے کر مجھے دے گا۔ مگر پربھو ایسا کیوں کرتا ہے؟ جیسے نمک کے پہاڑ بنائے ہیں کاش ویسے ہی سکون کا پہاڑ بھی بنایا گیا ہوتا۔ ایک تو ساری دنیا میں ایک ہی کرنسی ہوتی۔ نقلی نوٹ بنانے والے نمک بیچتے اور مزدور جتنی محنت کرتا اتنے ہی سکے نکال دیتا۔ ہائے کیا بات ہوتی تب! دعائیں دیتے سب لوگ — مگر نہیں۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا — اگر ایسا ہوتا تو لوگ بکے غم چننے کی بجائے شہد لگا کر کھا جاتے۔ سکون کی دیواریں بن جاتیں۔ اور میرے پیچھے کھڑا شخص بھی بھر بھر کے سکون کی ٹوکریاں اٹھاتا ہوا نظر آتا۔ تب نہ تو وہ بڑبڑاتا اور نہ ہی گاہے بگاہے جنتری بجا دیتا۔ لو۔ گھنٹیاں کب سے بج رہی ہیں اور میں سکون کے پہاڑوں کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ دیکھ تو لیں کس کا فون ہے۔ پہلے لوگوں کی برداشت کا مادہ تو دیکھ لیں۔ دس منٹ تک بیشک گھنٹیاں بجتی رہیں۔ مگر لین دین کی بات ہو تو ریسیور اٹھانے کا انتظار کر لیتے ہیں — مگر یہ شفاخانے والے بہت چالاک ہیں۔ ریسیور آف کر دیتے۔ سنکی رہتے ہیں۔ میرے خیال میں ریسیور اٹھا کر رکھ دینا چاہئے۔ مگر۔ اگر فائیل والے کا فون آگیا تو — نہیں۔ نہیں — یہ کس کا فون ہے؟ — ؟ ہیلو۔ جی ہاں۔ کہاں سے؟ بمبئی سے! — ملایئے۔ فوراً ملایئے — کیا؟ کیا؟ کیا؟ کہاں ہے میرا بیٹا —؟ دیکھئے آپ ہوٹل کے منیجر ہوں یا مالک۔ بات اتنی سی ہے کہ میرا بیٹا فضول خرچ ضرور ہے مگر کسی سے اتنی بڑی رقم ادھار نہیں لے سکتا۔ اپنے ساتھ وہ دس ہزار روپے لے گیا تھا۔ پھر لوٹا ہوگا آپ لوگوں نے — غصہ تو آپ دلا رہے ہیں مجھے۔ ٹھیک ہے مجھے میرے بیٹے سے ملایئے۔ ہاں۔ بیٹے یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا؟ — گھر میں نصف درجن کیمرے موجود ہیں اور خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ دس ہزار کا T.M.O نہیں جا سکتا۔ ڈرافٹ تو بھیجوا دوں گا مگر یہ تم کیمرے کی بات کر رہے ہو یا کیمرے کی —؟ ہیلو۔ ہیلو — نالائق۔ نامعقول۔ بے ہودہ۔ بے مروت۔ ڈرافٹ کی بات سنتے ہی ریسیور چھوڑ دیا۔ گویا شہنشاہ کا ولی عہد ہے۔ اور اس کی ماں بھی عجیب۔ بیوی نا ہوئی مہابھارت جودھا بائی ہوئی۔ بھلا اچھے گھروں

کے لڑکے بھی کیا کیبرے دیکھے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے۔ جن کی بھوک، مٹتی ہے ان کو کھانا نہیں ملتا اور جن کا کھانا میزوں پر پڑا رہتا ہے ان کو کھانے کی خوشبو کی بجائے بدن کی مہک اور کمر کی لچک دیکھ کر بھوک لگتی ہے۔ ہونہہ۔ پریشان کر رکھا ہے گھر کے ہر فرد نے ۔ اوف یہ عینکیں بھی ناک پہ کے اوپر بوجھ لگ رہی ہیں۔ نظر کی عینکیں تو نہیں ہیں ہاں شیشے اور فریم میرا بیٹا پچھلی بار بمبئی سے لایا تھا۔ مگر یہ میرا چپراسی یہ عینکیں دیکھ کر حیران کیوں ہو رہا ہے؟ غالباً اسلئے منسٹر صاحب نے بھی ایسی ہی عینکیں پہن رکھی ہیں۔ ارے اسے کون سمجھائے کہ یہی تو ہے اس جمہوریت کی دین۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ مگر یہ غریب طبقہ کہاں سے آٹپکا ہے بیچ میں ۔؟ ۔!! ہا۔۔۔ہا۔۔۔ ویسی ہی جیسے کسی خوبصورت باغ کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپی شہد کی مکھیاں اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے تو کوئی ڈر کے مارے ان پر پتھر نہیں مارتا۔ مگر ان غریبوں سے کوئی کیوں نہیں ڈرتا ہے۔؟ ہاں! اس لئے کہ وہ پتھر مارنے والے پر ٹوٹ نہیں پڑتے۔۔۔! حالانکہ پڑنا چاہئے ۔!! مگر مجھے کیا۔۔۔ اب کس کا فون آگیا ۔۔ ہیلو ۔ جی نمسکار ۔ سویرے سے آپ ہی کے فون کا انتظار کر رہا تھا ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ فائیل پڑھ لوں گا ۔ کام ہو جائے گا ۔ نہیں۔ نہیں چیک نہیں۔ کیش۔ ہاں کسی وقت ۔۔ ہیلو ۔۔ یہ کس کی آواز ہے۔ ہاں! ایسا اکثر ہوتا ہے یہاں ۔ فون والوں کی بات ہی نہ کریں ۔ کوئی دوسرا نمبر اوور لیپ کر جاتا ہے۔ مگر ہیلو۔ ہیلو ۔ آپ کون ہیں؟ آپ فون رکھ دیجئے ۔ میں کسی سے بات کر رہا ہوں۔ کیا کہا۔ کون ہیں آپ ۔۔ ؟ ۔ Shutup شٹ اپ ۔ گستاخ ۔۔ تم آخر ہو کون؟ بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے سادھو سنت ۔ بکواس بند کرو ۔ نہیں نہیں آپ کو نہیں کہہ رہا ہوں ۔ کوئی دوسرا درمیان میں آگیا ہے ۔ ہاں تو یہ میں کہہ رہا تھا کہ کام ہو جائے گا ۔ آپ آ تو جایئے ۔ ہاں بال بچوں والے آدمی ہیں ۔ جی نہیں کیش ۔۔ ٹھیک ہے کل صبح ۔۔ ہو جائے گا ۔ O.K ۔ ہونہہ ۔ جانے کون تھا جو درمیان میں آگیا ۔ سالا کباب میں ہڈی ۔۔ آج کل بلیک میل کرنا روپے بٹورنے کا ایک آسان طریقہ بن گیا ہے۔ بس کھل جا سم سم اور آپ بٹوے کی چین کھول دیجئے مگر کیوں ؟ کس لئے ؟ ورنہ کیا کریں گے وہ ۔۔۔ ارے بلیک میلنگ تو آخر بلیک میلنگ ہی ہے کوئی ڈرا دھمکا کے کرے یا فون پر بات کرنے والا ہاں مانا کہ صحافت ایک آئینہ ہے جس میں معاشرہ اپنا عکس دیکھتا ہے ۔ مگر تب کیا دیکھیں جب آئینہ ہی دھندلا گیا ہے ۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔ گویا اس حمام میں سب ننگے ۔ ارے بڑے لوگوں کی آمدن آتی کہاں سے ہے ۔ منسٹروں کی آمدن کہاں سے آتی ہے ۔ نہ کوئی ارتھ ٹرسٹ دیتا ہے اور نہ ہی لوگ چندہ دیتے ویسے زکوٰۃ بھی غریبوں کو دی جاتی ہے ۔ لیڈروں کو نہیں ۔ کوئی رعب سے مانگ لے یا جھولی پھیلا کر مال تو مال ہے آخر ۔ یعنی لٹیرا پستول دکھا کے لے لے یا کوئی دلال سرگوشیانہ انداز میں کہہ دے مال نکالو ۔ مال آخر مال ہی ہے نا ۔ لاؤ کرسی ایک سیٹھ سے نوٹوں بھرا الیکشن فنڈ میں دیں ۔ بات ایک ہے نا ۔ یہی تو میں بتا دینا چاہتا ہوں، اس شخص کو ۔

میرے پیچھے کھڑا رہتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ میں کچھ کہہ دیتا ہوں تو میرے سوالات کے جوابات دینے کی بجائے کہانیاں سناتا ہے۔ بار بار رشی بالمیکی کا ذکر کرتا ہے۔ ہاں۔ اب سمجھ گیا۔ فون پر بھی وہی تھا۔ لیکن وہ بار بار رشی بالمیکی کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ ارے بھئی واہ — کیا مجھے معلوم نہیں کہ وہ ڈاکو تھا۔ لٹیرا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ وہ رشی تب بن گیا تھا جب چند سنتوں نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مگر ایک بات میں دم ہے۔ بالمیکی کے بیوی بچے احسان فراموش تھے ورنہ کیسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے گناہوں میں شریک نہیں ہیں دراصل ایسے ہی ناشکروں کو دیکھ کر احسان فراموش کا لقب وجود میں آگیا ہے۔ ہونہہ — میرے بیوی بچے تو ایسے نہیں ہیں — لو — اب کس کا فون آگیا۔ کون۔ ارے تم۔ کہاں سے بول رہی ہو۔ تم تو محترمہ کے ساتھ ٹور پر گئی تھیں نا۔ کیا کتابیں اور کپڑے خریدنے ہیں؟ کسی دھرم شالا کو دینے کے لئے؟ مگر محترمہ خود کیوں نہیں خرید لیتی۔ ارے بھئی چندہ تو تم دے ہی چکی ہو۔ دیکھو — ارے — تم میری بیوی ہو کسی کروڑ پتی سیٹھ کی نہیں۔ ارے محترمہ کو منسٹر تو بن جانے دو پھر اس کی پولیٹیکل سکریٹری بن جانا۔ تم سے بحث کرنا چٹانوں کے ساتھ باکسنگ کرنا ہے۔ ٹھیک ہے۔ خرید لو۔ کہاں ہے پارٹی — ہمارے گھر —؟ مگر وہسکی کس لئے۔ عورتیں بھی شراب پی لیتی ہیں کیا۔؟ اچھا اچھا محترمہ کے روٹھے ہوئے شوہر آرہے ہیں! میں صلح صفائی کے لئے — اچھا فون رکھ دو میں ایک بہت ضروری فائیل پڑھ رہا ہوں۔ ارے بابا کیا کروں گا۔

الیکشن میں فیسٹو سن کر — ہونہہ — بس چپک جاتی ہے تارکول کی طرح — مینی فیسٹو —! ایک ہی جیسے ہوتے ہیں یہ مینی فیسٹو۔ گویا پلاسٹک کے برتن۔ فقط رنگ جدا جدا — کسی کو گروی رنگ پسند ہے تو کسی کو سبز — کوئی چرخے کے پیچھے پڑ گیا ہے تو کوئی چاند کے — کم بخت لیڈر بھی تو ایک جیسے ہیں۔ پانی کی طرح برتن کا رنگ اپنا لیتے ہیں۔ کل یگ کے ڈاکو ہیں یہ — بالمیکی تو ڈاکو سے سادھو بن گیا اور یہ لوگ سادھوؤں سے ڈاکو بن گئے ہیں۔ سُن رہے ہو تم — میرے پیچھے کھڑے ہو کر کیا کر رہے ہو —؟ سامنے آؤ تو میں تمہیں سمجھا دوں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے — میں کیوں پوچھ لوں اپنے بیوی بچوں سے؟ میں نے گناہ بھی نہیں کئے تو ان کو شریک کیسے بنا دوں —؟ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں بوڑھا ہوں۔ سٹھیا گیا ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ بہت ہوشیار آدمی ہوں میں — نہایت چالاک — ورنہ زندگی کے ان منحنی راستوں پر چلنا کیا آسان کام ہے۔ میں نے اپنے تمام راستے صاف رکھ دیئے ہیں۔ کسی کے ساتھ جب بھی بات کرتا ہوں تب تم درمیان میں بول پڑتے ہو۔ اب بولنا مت۔ بس سُن لینا۔ اور سمجھ لینا کہ میں کیا چیز ہوں — لو سُن لو — ہیلو — پیمپوکش وائن — جی ہاں آپ میری آواز نہیں پہچان لیں گے تو بھلا اور کون پہچان لے گا۔ ہاں۔ کیا میرے نام پہ گیا ہے۔ کوئی بات نہیں دو اسکاچ کی بوتلیں میرے بہت بڑے کھیت میں آبیاری کر سکتے ہیں — ورنہ بنجر زمین اور سرکاری ملازم میں کیا کوئی فرق ہوتا ہے ارے بھئی پولس والوں کا ہاتھ بھی تو سر پہ ہونا چاہیئے — ہا... ہا... ہا — ہاں پھر گھی میں آلو ڈالو یا آلو میں گھی بات ہے ایک ہی نا — اور وہ بھی بڑے مزے کی — ہیلو — ہیلو۔

یہ کون بول رہا ہے — میں نے تمہیں خاموش رہنے کو کہا تھا۔ کچھ کہنے کو نہیں بلکہ کچھ سننے کو کہا تھا۔ چھوڑو دو ریسیور — ہاں ۔ ہاں — پمپیوٹش وائن سے ہی بول رہے ہیں نا آپ ؟ اچھا اچھا وہ آپ کے پاپا تھے ۔ پاپا کو فون دو ۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیا ہوگا اس ملک کا جہاں فون تم کرو اور بل کوئی اور دے ... ہا ... ہا ... ہا ... اس کو کیوں ؟ — یار ایک دو بوتلیں دو ۔ ایک کریٹ کیوں ۔ اب تو وہ پارلیمنٹ کا ممبر بھی نہیں ہے ۔ ہاں ۔ اسکو ضرور دو ۔ نقد بھی دیں گے ۔ چھ ہزار یا چھ سو — چلو چھ ہزار ہی سہی ۔ مگر اس کو بتا دو کہ میری اگر ٹرانسفر ہوگئی ہے تب رکوا دو ۔ اور اگر نہیں ہوئی ہے تو ان کو آگے کے لئے بتا دو ۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا ہوں ۔ ہاں مکان بن رہا ہے ۔ بچے ضد کر رہے ہیں کہ دیوالی میں شفٹ کر دوں ۔ ارے تنخواہ یا مکان کا قرضہ تو Survival Allavance ہے یعنی زندہ رہنے کے لئے دیئے ہیں جیسے پانی اور ہوا ۔ کھانا پینا نہیں ۔ مکان اور آرائش نہیں ۔ کیا وہ جلبنس والے ؟ ہاں یار ماہواری ہی ٹھیک ہے ۔ کوئی ان سے تو پوچھے کہ ان کے پاس کیا کیا ہے ۔ اچھا — ہاں آؤں گا شام کو — O.K

کیا زمانہ آگیا ۔ پہلے دادا لوگ ماہواری لیتے ہیں اب — چلو ہمارا کیا ہے ۔ جوں یا توں قیمت فروخت قیمت خرید سے زیادہ ہونا چاہئے ۔ منافع اس کو کہتے ہیں نا — شُن سے ہونا تم — اس میں منہ بنانے کی کیا بات ہے ۔ اچھا اچھا یہ پھر فون کی گھنٹی ہے ۔ ہیلو ۔ جی نہیں میں نے آپ کی آواز نہیں پہچان لی ۔ ہاں ... ہاں .... گاندھی نگر میں ۔ پرانا مکان شہر کے اندرون حصے میں ہے ۔ جی ہاں ۔ بالکل نائی کی دوکان کے سامنے — مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ؟ ہیلو ۔ ہیلو ۔ کون — ! اُف — سائنس کی ترقی دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ کب فون پر دوسرے آدمی کی شکل بھی دکھائی دے گی — اور جب وہ شخص جو ایک بے شکل خوف کی صورت میں ہمیشہ میرا تعاقب کرتا ہے یا میرے پیچھے کھڑے ہو کر میری نقل و حرکت دیکھتا رہتا ہے ۔ یا درمیان میں بول پڑتا تب میں اس کی شکل دیکھتا ۔ کیسا ہوگا یہ شخص ، کسی کالے دیو کی طرح خوفناک ؟ رہنے بھی دو کیا بات کرنی اس کی ! کم بخت پریشان کر رہا ہے ۔ لوگوں کو روپے دینے ہیں اور میں یہ فائیل بھی نہیں پڑھ سکا ہوں گویا بیج بویا ہی نہیں ۔ اور فصل کی بانٹ شروع کر دی ہے ۔ ہونہہ ۔ فائیل ہے مزیدار ۔ مگر کیس ہے بڑا پیچیدہ — ارے تو کیا ہوا ۔ ؟ لوگ موت کے کنویں میں کود کر موٹر سائکل چلاتے ہیں ۔ میں نے تو بس قلم چلایا ہے ۔ میرے قلم چلانے سے ایک اور شراب کی فیکٹری چالو ہوگی ۔ موٹر سائکل والے کو سبھی دیکھ لیتے ہیں ۔ مجھے قلم چلاتے وقت کوئی نہیں دیکھے گا ۔ اور پھر ایک ثواب کا کام بھی تو کر رہا ہوں میں ۔ کتنے لوگوں کو روزگار ملے گا ۔ ہونہہ — ایک تو میری فراخ دلی اور غریب پروری کا جذبہ دیکھ لیجئے اور دوسری طرف میرے پیچھے کھڑے اس شخص کی نا سمجھی جان لیجئے ۔ کہہ رہا ہے کہ بالمیکی ڈاکو تھا تب وہ خود لوگوں کو لوٹ کر ان کے گھر اُجاڑ دیتا تھا جبکہ میں کسی کی معرفت گھروں کو اُجاڑ رہا ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے مگر یہ تو بتا دو یہ سب جھوٹ ۔ کالا دھندہ ۔ رشوت خوری بے ایمانی کیا میں ہی کر رہا ہوں ؟ اور کوئی نہیں — ؟

سب کر رہے ہیں میں بھی کر رہا ہوں۔ بیوی بچوں کو سکھ دینے کے لئے۔ کسی کو سکھ دینا بھی تو ایک سادھنا ہے۔ ایک عبادت ہے — جانتے ہو میں اناتھ آشرم کے بچوں کو ہفتے میں ایک بار کھانا کھلاتا ہوں۔ اب بتاؤ — خاموش کیوں ہو گئے۔ ہو گئی نا بولتی بند — مگر — مگر —؟ یہ کیا؟ کون ہیں آپ —؟؟ کیوں میرے کمرے میں چلے آئے۔ کیا آپ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں؛ کیوں؟ کیا کیا ہے میں نے؟ یہ دیکھئے اس فائیل پر میں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی ہے۔ رُک جائیے! وہیں رک جائیے! آپ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ میں بہت طاقتور آدمی ہوں۔ ایک مضبوط قلعے میں رہتا ہوں۔ آپ ان اونچی اونچی فصیلوں کو پار کر کے اندر نہیں آسکتے۔ میری جان پہچان ہی ایک لشکر ہے۔ منسٹر کے ساتھ بھی میری بات چیت ہے۔ نہیں یقین آتا نا —؟ ٹھیک ہے میں اپنے گھر فون کروں گا۔ کیا آپ ان سے مل کر آئے ہیں؛ کیا کہا انہوں نے؟ نہیں۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ سب میرے گناہوں میں شریک ہیں۔ پھر پکڑ لیجئے ان سب کو۔ کیا؟ وہ میرے کردار کے بارے میں جان کر شرمندہ ہو چکے ہیں۔ ان کی گردن جھک گئی ہے شرم سے۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں ایک چھوٹا افسر تھا۔ ارے کیسے نہیں معلوم جناب۔ دو سال پہلے ہی تو ہم سب کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ سب کیپوشن والی کی اُپرستانی ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میں نے اب آپ کو پہچان لیا تو آپ ہیں وہ جو بار بار فون کرتے کرتے نمودار ہو جایا کرتے تھے آپ ہیں وہ جو ہمیشہ میرا پیچھا کرتے تھے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کسی سرکاری افسر کو پریشان و حراساں کرنا ایک جرم ہے؟ میں اپنی یونین کو آواز دوں گا۔ آپ دھوکے باز ہیں۔ مجرم ہیں۔ سزا ہوگی تو سب کو۔ کلرک کو بھی اور منسٹر کو بھی۔ مگر تم اس وقت مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ کیسے معلوم ہے آپ کو کہ میں فائیل میں کچھ لکھنے والا تھا۔ کہاں ہے ثبوت؟ کہاں ہے وارنٹ؟ کہاں ہے وارنٹ؟؟ اور ہاں کہاں ہے تمہاری وردی۔؟ ہا… ہا… ہا… ڈر گئے نا تم بھی بلیک میلنگ سے۔ اب آگئے نا سیدھے راستے پر۔ مگر تمہاری آواز اچانک سریلی کیسے ہو گئی؟ نہیں۔ نہیں۔ تمہارا چہرہ ڈراؤنا ہے۔ مت دو مجھے فریب تم کون ہو؟ تم پولس افسر نہیں؛ میرے افسر بھی نہیں؟ منسٹر بھی نہیں؟ اخبار والے بھی نہیں۔ تم وہ بھی نہیں جو دریچوں سے جھانک کر مجھے دیکھتا ہے یا میرے پیچھے کھڑے ہو کر بڑبڑاتا رہتا ہے۔ تم ایک بہروپئے ہو! ہاں اب بھلا تمہاری شکل ہو بہو میری جیسی کیسے ہو سکتی ہے؛ ہا۔ ہا۔ ہا۔ بے وقوف بنا گئے نا مجھے۔ ہا۔ ہا…… میں میز پر رکھے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں۔ اور سامنے کوئی نہیں ہے۔ ہا… ہا۔ ہا۔ دیوار پر اچھلتا ہوا میرا اپنا سایہ ہے۔ اور — اور — اس فائیل کی پرچھائیں ہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اب میں اس فائیل کو بعد میں پڑھ لوں گا۔ اور پہلے اپنی بیوی بچوں سے پوچھ کر آؤں گا کہ کیا وہ میرے گناہوں میں شریک ہیں —

اور اگر انہوں نے نہیں کہہ دیا تب میں رامائن تو نہیں لکھوں گا مگر رامائن ضرور پڑھ لوں گا۔ کہتے ہیں گیان اور کتابیں وہ دریچے ہیں جو من کے بھیانک اندھیرے کو مٹا دیتے ہیں۔

لیکن اگر انہوں نے ہاں کہہ دیا تب کیا کروں —؟؟

★

شبیہہ عبّاس جارچوی
کراچی (پاکستان)

کاشی گر

کاشی گر کی زندگی ہی کیا ہوتی ہے؟

پریل سوچ رہا تھا۔ ساری عمر مٹی کے برتنوں اور کھلونوں کو بنانا، ان میں نقش و نگار بھرنا اور آخر میں جب موت آتی ہے تو اسی مٹی کے نیچے دفن ہو جانا۔ پریل جس کے ماں باپ نے بڑے چاؤ سے اس کا نام محمد پریل رکھا تھا اور اسے گوٹھ کے مدرسے میں جس میں صرف ایک ہی ماسٹر تھا۔ داخل بھی کرا دیا تھا لیکن پریل کو تو جیسے پڑھنے سے چڑ تھی۔ گاؤں کے مدرسے کا ماسٹر اکیلا پرائمری تک کے سب بچوں کو پڑھاتا تھا۔ ہفتے میں تین دن تحصیل کا ڈاکیہ پریل کے گاؤں کی ڈاک اسکول کے استاد کو دے جاتا تو وہ استاد سے ڈاک لے کر گاؤں کے ان گھروں میں چلا جاتا جہاں کی ڈاک ہوتی اور اس طرح اپنا وقت گھر گھر پھرنے میں گزار دیتا۔ اور بھی وہ ہزار طریقوں سے پڑھنے سے بھاگتا۔

جب باپ نے دیکھا کہ پریل کسی طرح پڑھ کر نہیں دے رہا تو اسے صاحب داد کمہار کے پاس کام سیکھنے کے لئے بٹھا دیا۔ وہ اس کے پاس کام بھی سیکھتا رہا اور، اور تھوڑے عرصے کے بعد اسے کچھ آمدنی بھی ہونے لگی۔ جب جوان ہوا تو اس نے لوگوں سے سُنا کہ باہر کے ملکوں میں بہت کمائی ہے۔ اور یہاں اچھے سے اچھا کاریگر بھی اتنا نہیں کماتا جتنی کہ باہر کے ملکوں میں عام مزدور کما لیتا ہے۔ یہ سُن کر پریل نے بھی باہر جانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ پریل نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ "آؤ آؤ حبیب آج بہت دن بعد آئے۔" پریل نے آنے والے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہاں بھئی آج کل وقت ذرا کم ہی ملتا ہے" حبیب نے جواب دیا اور پریل کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پریل نے سردی سے بچنے کے لئے اپنے پیروں پر پڑی ہوئی چادر حبیب کے پیروں پر بھی ڈال دی۔ پریل اور حبیب دو بوڑھے جنہوں

نے بچپن اور جوانی ایک ساتھ گزاری تھی اور اب
دونوں بڑھاپے کی منزل سے گذر رہے تھے.
اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے
کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اور ماضی کی بہت سی
دوپہروں، شاموں اور رات کے پہلے پہروں کی طرح
آج بھی پریل کی دس بائی بارہ فٹ کی نیم پختہ کوٹھری
جس میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی اور صحن
وغیرہ کوئی نہیں تھا میں آج پھر آمنے سامنے تھے.
حبیب نے دیکھا کہ پریل آج غیر معمولی طور پر خاموش
ہے۔ خاموشی توڑنے اور کوئی بات شروع کرنے
کی خاطر حبیب نے کہا۔ "سائیں کھڑکی کھول دو"
"نہیں حبیب ٹھنڈی سی ہوا چل رہی ہے۔ کھڑکی
بند ہی رہنے دو،" پریل نے جواب دیا۔

"سائیں آج بہت زیادہ خاموش ہو گیا
کوئی خاص بات ہے۔ آخر حبیب نے براہ راست
سوال داغا۔ "نہیں کوئی خاص بات تو نہیں مگر آج
میرے دماغ میں بہت سی باتیں آرہی ہیں۔
ہمارے ماحول میں دو چیزوں کی قدر نہیں ایک
تو محنت اور دوسرے اصول اور میں نے اپنی
ساری عمر انہیں دو باتوں میں خرچ کر دی اور
میں اب تک یہ نہ جان سکا کہ میں ایک کامیاب
انسان ہوں یا ناکام۔" "چھوڑو یار یہ تو بڑی اونچی
باتیں ہیں تم کسی چکر میں پڑ گئے۔ حبیب نے پریل کو
موضوع بدلنے کی نیت سے ٹوکا۔

پریل جب جوان ہوا اور اس نے کاشی گری
کا کام شروع کیا تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے
والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور وہ اس
بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ جس گاؤں میں پر
اس کے والدین رہتے تھے۔ اس میں ان کا کوئی
رشتہ دار نہیں تھا۔ شادی کے بعد میں کبھی کسی
اور کبھی کسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور کبھی کبھار ا
چلی بھی تو کبھی کسی وجہ سے رشتہ نہ ہو سکا
علاقے میں پریل رہتا تھا وہاں کا یہ رواج تھا
ساز کا کسی مخصوص دکاندار سے عہد ہوتا تھا او
تمام برتن اسی مخصوص دکاندار کو دیتا تھا او
دکاندار بھی اپنی تمام ضروریات کے لئے اسی
کاریگر سے برتن خریدتا تھا۔ اور کسی اور سے نہ
سکتا تھا۔ قریبی شہر میں سیٹھ رمضان کی بر
دکان تھی۔ یہ سیٹھ پریل کے باپ کو بھی اچھی
تھا۔ ایک دن پریل شہر گیا اور سلام و دعا
سیٹھ سے اپنی آمد کا مطلب بیان کرتے
کہ وہ اچھا کام کرتا ہے۔ لیکن اس کے مال
کوئی نہیں اگر سیٹھ اس کا مال خرید لیا ک
اس کی مشکل آسان ہو جائے۔ سیٹھ نے کہا ک
عرصے اس کا مال آزمائشی طور پر رکھے گا ا
اس نے اچھا اور مستقل مال دیا تو وہ اس
مستقل معاہدہ کر لے گا۔ اور تھوڑے ہی عرصے

اس نے پریل سے مال لینے کا مستقل معاہدہ
اب پریل کو اطمینان نصیب ہوا۔ وہ اپنا کام
محنت سے کرتا، کچے برتن بنانا، ان کی صفائی
استر چڑھانا، گل بوٹے بنانا، گلیز چڑھانا،
سب کام توجہ سے کرتا۔ اس کے ہاتھ کی بن
مٹی کی چیزیں پائیدار، مضبوط اور جاذب
ہوتیں اس لئے کہ وہ اپنے کام میں بے ایما

کرتا تھا وہ رنگ میں ملاوٹ نہیں کرتا تھا اور سامان کھپانے میں جلد بازی نہیں کرتا تھا۔ سیٹھ رمضان اور پریل کے درمیان معاہدے کے بعد سیٹھ پینتالیس سال زندہ رہا اور اس عرصے میں پریل نے اتنے اچھے اچھے ظروف بنا کر سیٹھ کو دیئے کہ سیٹھ کی دکان بھی چمک اٹھی اور آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔ سیٹھ نے پریل کے سامنے ہوئے ظروف میلوں نمائشوں، محکمہ سیاحت کے دفتروں میں دینے شروع کر دیئے۔ غرض اس نے ہر طرح دولت کمائی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پریل کی شہرت بھی دور دور تک پھیل گئی کبھی کبھار اس کا ذکر اخباروں رسالوں وغیرہ میں بھی آنے لگا۔ لیکن پریل معاہدے کے مطابق اپنے تمام برتن سیٹھ کو فروخت کرنے کا پابند تھا۔

پینتالیس سال اگر کوئی فرد ایک طرح کی زندگی گزارے تو اس کے لئے وہی زندگی ہو جاتی ہے۔ پریل سیٹھ رمضان سے علیحدہ ہونے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پریل کچھ شاہ خرچ بھی تھا اور جتنے اچھے برتن وہ بناتا تھا اس کے حساب سے اس کو رقم نہیں ملتی تھی اس لئے وہ کچھ پس انداز نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ چونکہ اکیلا فرد تھا اس لئے اسے اکیلے ہی سب کام خود کرنے پڑتے تھے جبکہ دوسرے کاسگر اپنے بیوی بچوں کو بھی مدد کے لئے کام میں لگا لیتے تھے۔ پھر ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیٹھ رمضان کو دل کا دورہ پڑا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ سیٹھ کے بیٹوں نے دو تین سال تک تو پریل سے کئے گئے معاہدے کا لحاظ کیا مگر بعد میں پریل سے مال لینا چھوڑ دیا۔ جب اس کے بدن میں طاقت تھی اور وہ زیادہ سے زیادہ مال بنا کر دے سکتا تھا۔ اس وقت مختلف دکانداروں نے زیادہ رقم اور مال کی اونچی قیمت دے کر پریل کو توڑنا چاہا لیکن اس نے اپنا عہد نبھایا اور جب اس کی طاقت کم ہوئی اور ضعیفی نے اس پر حملہ کیا تو سیٹھ رمضان کے بیٹے اسے دھوکا دے گئے۔

اپنے عروج کے زمانے میں اس نے بڑے بڑے آرڈر ٹھکرا دیئے۔ کسی قسم کے لالچ میں نہیں آیا۔ اور مال صرف اور صرف سیٹھ رمضان کو دیتا رہا۔ ضعیفی میں اس طرح دربدر ہونے سے پریل کو زبردست دھچکا لگا۔ صبر سے سب کچھ سہہ گیا۔ اس عالم میں پریل کو اپنے مال کے لئے جگہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ جو دوکاندار مال لیتے وہ احسان کرتے۔ محنت و مشقت کی قیمت وقت پر نہ دیتے قسطوں میں رقم دیتے۔ ناقدر لوگوں کی وجہ سے اس کی صحت اور مالی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ بدن پر پتلی میلی سفید قمیض اور سفید شلوار، خستہ جوتی جس کی ایڑی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بال روئی کی مانند سفید بکھرے اور الجھے ہوئے داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی گال پچکے ہوئے، دانت اب تک سالم، چہرے پر بے شمار جھریاں، اس کے پاس بڑے بڑے حاکموں اور نمائشوں کی سندیں تھیں جنہیں وہ اپنے سے زیادہ عزیز رکھتا۔

پریل اٹھا اور اس نے حبیب کے لئے

مٹی کے تیل کے چولہے پر چائے بنائی اور چائے دیتے ہوئے کہا۔" جب گورا سیاح کل میرے پاس آیا تھا وہ دونوں میاں بیوی ساتھ تھے اور کہتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ چلو تمہارے ملک میں تمہارے کام کی قدر نہیں ہے ہم تمہیں اپنے ملک لے جائیں گے اور تمہیں وہاں کام کرنے کے لئے ہر طرح کا سامان اور باقی زندگی گزارنے کے لئے ہر طرح کا آرام دیں گے۔ لیکن میں نے منع کر دیا وہ میرے بچپن کے دوست سلوک کو بھی ساتھ لائے تھے سفارش کے لئے۔ وہ گورا سیاح اور اس کی بیوی کہہ گئے ہیں کہ وہ پاکستان سے ایک ہفتے کے بعد واپس جا رہے ہیں اور جاتے وقت پھر میرے پاس آئیں گے۔

• تو انگریزوں کے ملک چلے جاؤ نا یہ موقع تو کسی کسی خوش قسمت کو ملتا ہے" حبیب نے کہا۔

"نہیں حبیب ساری عمر اپنے وطن میں گزار دی اور اب مرنے کے لئے گوروں کے وطن چلا جاؤں۔ نہیں تو پتہ ہے کہ اس سے پہلے بھی تین چار گورے سیاح مجھے ساتھ لے جانے کے لئے زور دے چکے تھے لیکن میں نے ان سے بھی یہی کہا تھا کہ میں اپنے ماں باپ کا شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ پیسے کی لالچ میں اپنا ملک اپنا وطن اور اپنا شہر نہیں چھوڑوں گا جو کچھ بھی مجھے دیا ہے میرے ملک نے مجھے دیا ہے۔ میں اس سے بے وفائی نہیں کروں گا۔ مجھے میرا ملک اور شہر بے حد عزیز ہے اور اس عزیز شے کو تم چھوڑنے کے لئے کہتے ہو۔

اچھا سائیں پریل جو تمہاری مرضی اب وقت زیادہ ہوگیا ہے تم آرام کرو میں بھی گھر چلتا ہوں

اور حبیب یہ سوچتا ہوا گھر چل دیا کہ قدرت کے کھیل نرالے ہیں جب جوانی میں کمائی کرنے کے لئے پریل کو گوروں کے ملک جانا چاہتا تھا تو اس وقت اسے کوئی لے جانے والا نہیں تھا اور اب جب گورے خود اس کی خوشامد کرتے ہیں تو وہ خود نہیں جاتا۔

سردیوں کا موسم کڑاکے دار سردی دانت سے دانت بج رہے تھے۔ پانی کا ایک گھونٹ پیو تو ایسا محسوس ہوتا کہ حلق سے لے کر سینے تک کوئی چیز بدن کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ حبیب کو پریل سے ملے ہوئے ابھی دو دن ہوئے تھے کہ پھر اچانک صبح اس کی یاد آگئی۔ حبیب کا معمول تھا کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے کنویں سے پانی بھر کر لاتا اور پھر اس کے بعد دوسرے کاموں میں لگتا۔

حبیب نے سوچا کہ چلو پریل کو ایک آواز دیتا چلوں، اگر جاگ گیا ہو تو تھوڑی گپ شپ رہے گی پریل کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس گاؤں کے دو آدمی ملے جو باتیں کرتے جا رہے تھے کہ اس سردی کا موسم ضعیفوں اور کمزوروں کے لئے بہت نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ کچھ اور آگے گیا تو مسجد کے مؤذن علی نواز کی آواز سنائی دی کہ محمد پریل کا گذشتہ رات انتقال ہوگیا آواز سنتے ہی حبیب سکتے میں آگیا اور پریل کے دو دن پہلے کہے ہوئے الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے کہ پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی محبت بہت عزیز شے ہے۔

نئی کتابوں کا تعارف

خواہشمندان تبصرہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نام کتاب :- تفہیم العروض
مصنف :- شارق جمال ناگپوری
ضخامت :- ۱۰۰ صفحات ۔ قیمت :- ۱۵ روپے
پتہ :- ادارۂ غالب، تکیہ معصوم شاہ، مومن پورا، ناگپور ۔ ۴۴۰۰۱۸

عروض سے متعلق مشکل اور آسان بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا جا سکتا ۔ نئی ضرورتوں کے تحت اور نئے لسانی اور شعری تغیرات کے پیش نظر ہمیشہ اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ عروض کے مسائل نئے تناظر میں حل کئے جائیں ۔ مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ

"میں نے اس کتاب کو تفہیم کے اعتبار سے آسان تر بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس کے ساتھ یہ اعتراض بھی ہے کہ اس کتاب کو عروض کی مکمل کتاب نہ سمجھا جائے آپ بھی اسے آسان بنانے کی اور بھی کئی تفصیل میرے ذہن میں ہے ۔ جو کچھ اس کتاب میں ہے وہ محض اختصار سے اس لئے ہے کہ اسے حاصل کرنے والا تفصیل کی توضیح دیکھ کر گھبرا نہ جائے ۔"

یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی تفصیل سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی اور اس سے صحیح تفہیم بھی نہیں ہو سکتی لیکن اجمال بھی رہی مستحسن ہو سکتا ہے جس سے تفصیل کی خواہش ہو اور کوئی اہم بات چھوٹ نہ جائے

ابتدائے کتاب میں مصنف نے علم عروض کی ضرورت پر زور ڈالا ہے اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

"ہر شاعر کے لئے علم عروض کا جاننا ضروری ہے ۔ ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے ۔"

یہ کلیہ محل نظر ہے ۔ شاعری ایک الگ ملکہ ہے اور عروض دانی الگ ۔ کوئی ضروری نہیں کہ ایک شاعر عروض کے قواعد و ضوابط سے واقف ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک عروض داں شاعر ہو جائے ۔ شاعری کے لئے ذوق سلیم اور طبع موزوں درکار ہے ۔ بقول شاعر

شعر می گویم بہ از آب حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

اس لئے عروض کا علم شعر گوئی کے لئے نہیں تنقید شعر کے لئے لازمی ہے ۔

مصنف کتاب نے "شعر کسے کہتے ہیں" کے عنوان سے شعر کی جو تعریف بیان کی ہے وہ اگرچہ قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے مگر آج اس پر آنکھ بند

کر کے یقین کر لینا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا جس کلیہ سے خود ہم مطمئن نہ ہوں اس سے دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ آج کے لسانی، شعری اور فنی تجربات و تغیرات کی روشنی میں ہمیں ایسی تعریفوں پر از سر نو غور کرنے کے لئے اپنے ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے۔ شاعری کی اصطلاح میں جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے "شعر اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو با معنی اور با وزن بحر میں ہو اور یہ بھی کہ قصداً کہا گیا ہو"۔ اس تعریف پر تو بہت سے نثری ٹکڑے بھی صادق آ سکتے ہیں۔ خصوصاً قدیم نثری کارناموں میں تو متعدد ایسے فقرے ملیں گے جو موزوں بھی ہیں با معنی بھی اور انہیں لکھنے والے نے قصد و ارادہ سے بھی لکھا ہے۔ بہر حال! میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا، صرف اتنا کہوں گا کہ ایسی تعریفوں سے کوئی بات نہیں بنتی —— اور کیا خود جناب شارق جمال شعر کی اس تعریف سے مطمئن ہیں؟

"شعر کا وزن یا بحر" کے باب کے تحت مصنف نے دس ایسے الفاظ بتائے ہیں جن سے ارکان بنتے ہیں ان میں فاعلاتن بھی ہے اور "فاع لاتن" [illegible] مستفعلن بھی ہے اور مستفع لن بھی، سمجھ میں بات نہیں آتی کہ اس ٹکراؤ کے کیا معنی ——

—— فاعلاتن اور فاع لاتن میں حرکت و سکون کا نظام یکساں ہے۔ بس ادائیگی کے وقت ایک "فاع" کے بعد اور دوسری جگہ "تاع" کے بعد تھوڑی دیر کے لئے توقف کرتے ہیں۔ فاعلاتن ہو یا فاع لاتن، رکن تو بہر حال ایک ہی رہتا ہے۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن کو مفاع لن، فعلاتن، مفاع لن فعلن لکھا

جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ ا[...] طریقہ پر لکھنے سے ارکان کی تعداد ایک [...] چار اور دو میں آٹھ بدیہی طور پر نظر آجا[...] دوسری صورت میں تعداد ارکان میں اک[...] ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں مختلف بح[...] زحافات کی مثالیں بھی دی ہیں۔ قوافی و رد[یف] سے بھی آگہی بخشی ہے۔ اس کے علاوہ ان [...] پر گفتگو کی ہے جو عروض کے لئے بنیادی ا[...] ہیں۔ آزاد غزل اور آزاد نظم کے اوزان [...] مصنف نے اپنا وقت برباد کیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے جناب شارق [...] کاوش لائق تحسین ہے اور یہ کتاب عرو[ض کے] ابتدائی نکات کی اچھی تفہیم کرتی ہے۔

نام کتاب :۔ حقائق و بصائر

صنف :۔ تنقید و تحقیق

مصنف :۔ شمس بدایونی

صفحات :۔ ۳۳۶ قیمت :۔ چا[...]

پتہ :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر نئی [دہلی] روشن پبلیکیشنز، روشن محل، سوتھا۔

شمس بدایونی اولاً شاعر کی حیثیت [سے متعارف] ہوئے۔ اب چند برسوں سے انہوں نے تنق[ید] کے میدان میں بھی قدم رکھا ہے۔ اور یہاں [بھی] شمس بدایونی کی کاوشیں قابل ستائش [ہیں۔] انہوں نے متفرق موضوعات و عنوانات کے مطالعہ پیش کیا ہے۔ تحقیق میں جس تلاش [و] کثرت مطالعہ، محنت شاقہ، یادداشت ا[...]

کی ضرورت ہے وہ سب جناب شمس کی شخصیت میں موجود ہیں۔ وہ محنت سے گھبراتے نہیں، جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اس سے متعلق تمام ضروری مآخذ اور حوالہ جات کو سامنے رکھتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں کئی اہم مقالے ہیں۔ ان میں تنقیدی بصیرت بھی ہے اور تحقیقی دقت نظر بھی۔ پہلا اور طویل ترین مقالہ "شعرائے بدایوں —— دربار رسولؐ میں" ہے۔ ۱۲۵ صفحات پر پھیلا یہ تحقیقی مقالہ خود ایک کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں بدایوں کے نعت گو شعراء کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے اور ماضی و حال کے ۹۱ شعراء کا ذکر ہے۔ شعرا کا ذکر ان کے تخلص کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ عام طور پر مختصر حالات اور انتخاب کلام پیش کر دیئے گئے ہیں۔ تفصیلی تنقید کی یا تو گنجائش نہیں تھی یا طوالت کے پیش نظر اس سے اجتناب برتا گیا۔ مقالہ کے آخر میں حوالہ جات اور حواشی رقم کر دیئے گئے ہیں۔ مقالہ کی تمہیدی سطروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں تو بدایوں میں کم و بیش پانچ سو شعراء صاحب دیوان ہیں اور ان میں سے بیشتر نے نعت بھی کہی ہے، مقالہ نگار نے ان میں سے ۹۱ صرف ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جنہوں نے یا تو صرف نعت گوئی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے یا اس صنف میں بھی اپنے مجموعہ کلام شائع کر لئے ہیں۔ یہ مقالہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے خاصا اہم ہے۔

دوسرا مقالہ "غالب کے سہوانی شاگرد" اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ سہسوان ایک ایسی جگہ رہی ہے جہاں غالب کے مخالفین کی کثرت رہی ہے۔ مقالہ نگار نے اس حقیقت پر روشنی تو ڈالی ہے مگر اس سلسلے میں بعض اہم مسائل کو ما ئے ثبوت ، نہیں پہنچا سکے ہیں۔ مثلاً

نمبر ۱ غالب کے جنون بریلوی کے نام اپنے خط میں ایک سہسوانی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قاطع برہان کا جواب لکھنا چاہتے تھے —— یہ کون صاحب تھے۔ سید محفوظ الرحمٰن اپنے مقالہ 'دید و دریافت —— ایک مطالعہ' میں ان سہسوانی بزرگ کا پتہ لگانے سے قاصر رہے۔ جناب شمس بدایونی نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اسے یونہی چھوڑ دیا۔

۲ ان سہسوانی صاحب نے قاطع برہان کا جواب لکھ کر شائع بھی کرایا تھا یا نہیں۔ وہ اسے لکھ بھی پائے تھے یا نہیں —— اس سلسلے میں بھی شمس بدایونی کی تحقیق سید محفوظ الرحمٰن کی تحقیق سے ایک قدم بھی آگے نہیں نکل سکی ہے۔

بہرحال! جناب شمس نے غالب کے جن چار سہسوانی شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ خاصا تفصیلی ہے۔ اس میں انہوں نے ان شاگردوں کے متعلق حالات رقم کئے ہیں اور ان کے نمونہ ہائے کلام بھی درج کئے ہیں۔

"معرکۂ چکبست و شرر" مختصر سہی لیکن اچھا مقالہ ہے اس طرح کے بعض دوسرے تحقیقی مقالے بھی زینت کتاب ہیں، جن میں جوش اور نیاز کے سلسلہ کے مضامین خاصے معلوماتی ہیں۔

حقائق و بصائر میں چند مختصر تنقیدی مضامین بھی ہیں، ان میں کہیں جناب شمس نے غالب کی شخصیت کا مکالمہ پیش کیا ہے کہیں مجاز کا، کہیں اختر انصاری کے شاعرانہ سفر —— کا جائزہ [illegible]

صنفی نوعیت کا، ان متفرق اور متعدد موضوعات
پر لکھے گئے مقالات سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے
کہ جناب شمس کثیر المطالعہ آدمی ہیں۔ وہ دوران
مطالعہ جن علمی، ادبی اور شعری و تحقیقی مسائل کے
بارے میں غور و فکر کرتے ہیں انہیں مقالہ کی شکل
میں بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالات اپنے
موضوعات سے متعلق وافر مواد کے حامل ہیں۔ متذکرہ
مقالات کے علاوہ "میر محفوظ علی۔ کچھ غیر معروف
حالات" اور "ڈاکٹر محمد ایوب قادری" نامی مقالات
بھی خاصے وقیع ہیں۔ جناب شمس کے یہ تحقیقی مقالات
ان موضوعات پر توسیعی کام کی دعوت دیتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے "حقائق و بصائر" ایک
کامیاب پیشکش ہے۔ ادھر اردو میں ایسے تحقیقی
مقالات کے مجموعے بہت کم شائع ہو رہے ہیں۔ اہل
ذوق کے لئے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔

مہا

نام کتاب :۔ تذکرہ نعت گویان بریلی
مصنف :۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب
صنف :۔ تحقیق
ضخامت :۔ ۱۴۰ قیمت :۔ بیس روپے
پتہ :۔ مصنف ۔ ۲۰، پھول والان، بریلی (یو پی)

یہ کتاب بریلی کے ۲۷ نعت گو شعرا کے
احوال و افکار اور ان کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔
نعت گوئی اردو شاعری کا ایک مضبوط پہلو ہے۔
مضبوط اس لئے کہ اس کا تعلق محبت رسولؐ سے ہے
لہذا اس نوع کی شاعری میں جذبہ کی شدت، بیان
کی بے ساختگی، الفاظ کی روانی، خیالات کی تقدیس
تطہیر وغیرہ کی گوناگوں خصوصیات ملتی ہیں لیکن جس
طرح دوسری اصناف سخن میں بہت سے غیر تخلیقی
افراد در آتے ہیں اس طرح نعت گوئی کو بھی non
genuine افراد کی کمی نہیں۔ دوسری اصناف میں
تو ایسے افراد کسی طرح چھپ چھپا کر رہ جاتے ہیں مگر
نعت میں اس کی گنجائش نہیں اس لئے کہ نعت میں
جذبہ کا دلیا لیہ پن ایسے افراد کو فوراً بے نقاب کر
دیتا ہے

مؤلف نے شعراء کے ذکر سے پہلے جو مقدمہ
رقم کیا ہے وہ اہل تحقیق کے لئے خاصا اہم ہے اس
لئے کہ اس سے بریلی میں اردو شاعری کی تاریخ مرتب
ہوتی ہے۔ یہ مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے اور مؤلف
کو اس کی داد ملنی چاہئے۔

شعرا کا ذکر تخلص کو سامنے رکھ کر بہ اعتبار
تہجی کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کے بارے میں مختصر حالات
بھی جمع کئے گئے ہیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ہر شاعر کے
ذکر کے بعد ان مآخذ کا حوالہ دیدیا گیا ہے جہاں سے
اس کے حالات حاصل کئے گئے ہیں۔ مقدمہ میں مؤلف
نے دوسرا اہم مآخذ کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہیں دیکھنے
سے پتہ چلتا ہے کہ "آئینہ مغفرت" (مرتبہ سید حسین
شاہ تسنیم بریلوی) مؤلف کے لئے اہم ترین مآخذ رہا ہے
ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کے دوسرے
علمی اور تحقیقی کام تو میرے سامنے نہیں ہیں لیکن پیش
نظر تالیف کے حسن ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ
جناب ادیب، پختہ کار، بالغ نظر اور دشوار پسند طبیعت
کے حامل ہیں۔

ترتیب و تنظیم اور اصول پسندی سے کام لے سکتا ہے وہ یقیناً ایسے پراجکٹ میں بھی تحقیق کے جدید ترین طریقہ کار اپنا کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

نام کتاب :۔ ہر بار کہا دل نے
مصنف :۔ ڈاکٹر اودے سرن ارمان
صنف :۔ کہانی
ضخامت :۔ ۲۲۴ قیمت :۔ ۳۵ روپے
پتہ :۔ ماہنامہ شان ہند، فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر اودے سرن ارمان سیدھی سادی چھوٹی موٹی کہانیاں لکھ کر سب سے پہلے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور جب قاری ان کے قریب آجاتا ہے تو پھر وہ اسے کچھ بتانا چاہتے ہیں، ایک پیغام دیتے ہیں، اچھے برے کی تمیز بتاتے ہیں۔ گویا ان کی کہانیاں اسلوب کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں اور موضوع کے لحاظ سے بھی،

لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ انہوں نے اردو کہانیوں کے موجودہ اسالیب میں کیا اضافہ کیا ہے۔ کون سی تبدیلی لانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بھی کہ موضوع کی سطح پر وہ اپنے متقدمین اور معاصرین سے کس حد تک مختلف ہیں۔

ارمان کی کہانیاں روایتی اسلوب کی حامل ہیں چونکہ کہانی پر مقصد کا قبضہ ہو جاتا ہے اس لئے انہیں تخیلات، لطیف ترین محسوسات اور وسیع تر مشاہدات کے ان گوشوں پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں رہتی جو ایک نو کلیدی فنکار کا شیوہ کار ہے۔ اچھائی کی تبلیغ کے جذبے نے انہیں اس بات کی فرصت نہیں دی ہے کہ وہ زندگی کو اس طرح دیکھ سکیں جیسی وہ ہے۔ مثالیت نے انہیں پریم چند سے قریب کر دیا ہے۔ پریم چند کا زمانہ اور تھا اور اب اور ہے، خود اردو افسانہ بھی اس وقت وہ طفل تھا جو گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ پریم چند نے اسے باقاعدہ چلنا سکھایا تو یہ فطری بات ہے کہ وہ اس وقت کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ بار بار گرے گا بھی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مگر آج، آج ہم اس روش پر نہیں چل سکتے، ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔ پھر اسے سطح کے کیا معنی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ استحصال، عصبیت، طبقاتی امتیاز، ظلم و جبر، توہم اور خام خیالی، عورتوں کی مجبوری اور معاشرہ کے غلط رسوم و رواج کی تباہ کاری آج بھی انسانی قدروں کی شکست و ریخت کی طرف مائل ہے اس لئے ہمیں ان سے آج بھی برسر پیکار رہنا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ مگر آج کے لڑنے کا ڈھنگ وہ نہیں رہا جو ماضی میں تھا۔

ڈاکٹر اودے سرن ارمان بھی روایت پسند ہیں، وہ اصلاح کی کوشش تو کرتے ہیں مگر انقلاب لانے کی ہمت نہیں رکھتے، وہ پرانے اصولوں اور آدرشوں کے ہم نوا ہیں — یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر لبالہوس نے حسن پرستی شعار کی ہے اور پرانے ادھروں، مذہبی عقائد، قدیم اقدار حیات کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ ایسے میں احیا سے کام نہیں نکل سکتا ہے۔ پرانے آدرشوں کی نئی اخلاقی تعبیر کر دینے سے توہم پرستی دور نہیں ہو سکتی۔ کیا آج بھی کوئی مراد نہ ملنے کے باعث کسی کھڑکی سے ...

کہ کہ معاشرہ میں باعزت اور خوش و خرم نہیں رہ سکتی؟ کیا اب بھی ان کے مل بیٹھنے کی جگہ مقبرہ ہی ہے اور کیا پرانی کہاوتوں کی طرح یہ مقبرہ کوئی چمتکار دکھاتا رہے گا۔ (کہانی دیوؤں کا استھان) انقلاب یہاں کہیں نہیں ــــ غالباً اصلاح بھی نہیں ہے۔ آج بھی سرداری حالات سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا اور جبر کا نشانہ بن جاتا ہے۔ آج بھی اسے گنگا مل جانے کو سماج کے لوگ اس کا معراج سمجھتے ہیں۔ (کہانی گنگا گھاٹ) عبادت، پوجا پاٹ، مذہبی رسوم، نماز اذان، بھگوان، قرآن، ضمیر، پرانی عزت و شرافت کا ماحول ارمان کے بیشتر افسانوں پر ہنوز طاری ہے۔ رحم و ظلم کا پرانا تصور ان کے یہاں سبز ہو جانے کی تلقین کرتا ہے (کہانی جیو ہ کبوتر ہی) ارمان کی نرم دلی، اعتدال پسندی، قدامت نوازی اور روحانیت ہمیں کمزور کرتی ہے۔ آج کے معاشرہ میں جرأت اور اعتماد ذات کی جن خصوصیات کی ضرورت ہے وہ ارمان کے یہاں بس کہیں کہیں ملتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے افسانے لغزش اور بوڑھے پیرمن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

افسانے میں اتنے تجربات ہوئے ہیں اور ان تجربات کے ذریعہ لوگوں نے اتنی ہڑبونگ مچائی ہے کہ اب طبیعت گھبرا گئی ہے۔ ایسے ماحول میں جناب ارمان کی کہانیاں پناہ گاہ کا کام کرتی ہیں۔ Pop . Song کی اس دھما چوکڑی میں لگتا ہے کہ بانسری کی پرانی تان ہی بھلی ہے۔ مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر اودے سرن ارمان کی کہانیاں بھلی لگتی ہیں اور ان کہانیوں کے ذریعہ جو فنکار متعارف ہوتا ہے وہ اور بھی اچھا لگتا ہے۔

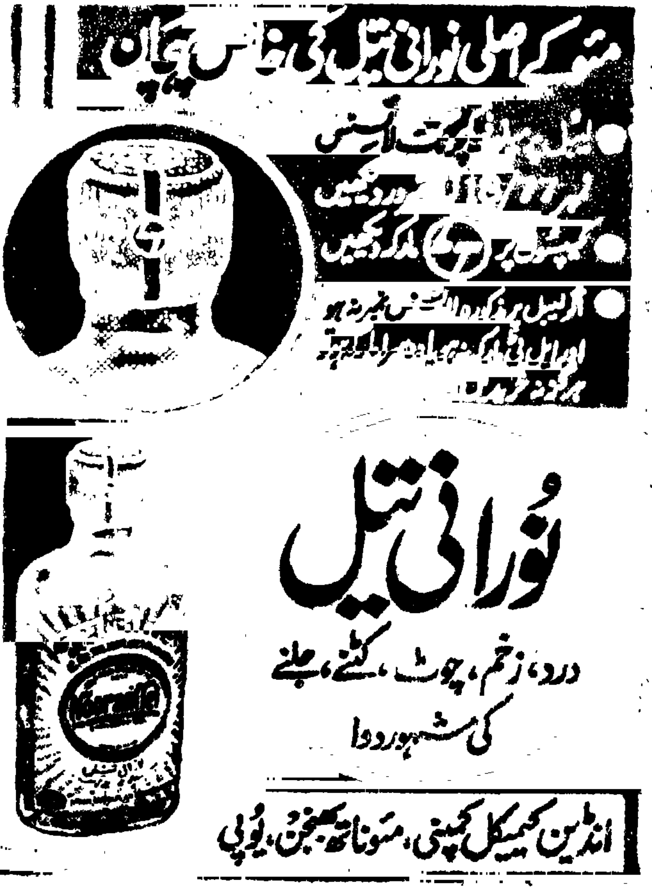
بقیہ: خواجہ احمد عباس

اختر: اپنے علاوہ افسانہ نگاروں میں آپ کس کو سب سے اچھا سمجھتے ہیں؟

خواجہ: کرشن چندر کو

اختر: وقت کی قربانی اور مہربانیوں کا شکریہ۔

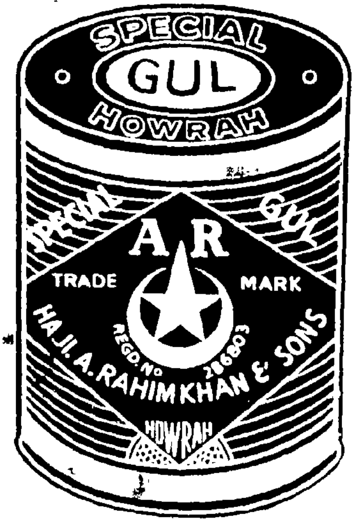
آداب۔



مشہور کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی

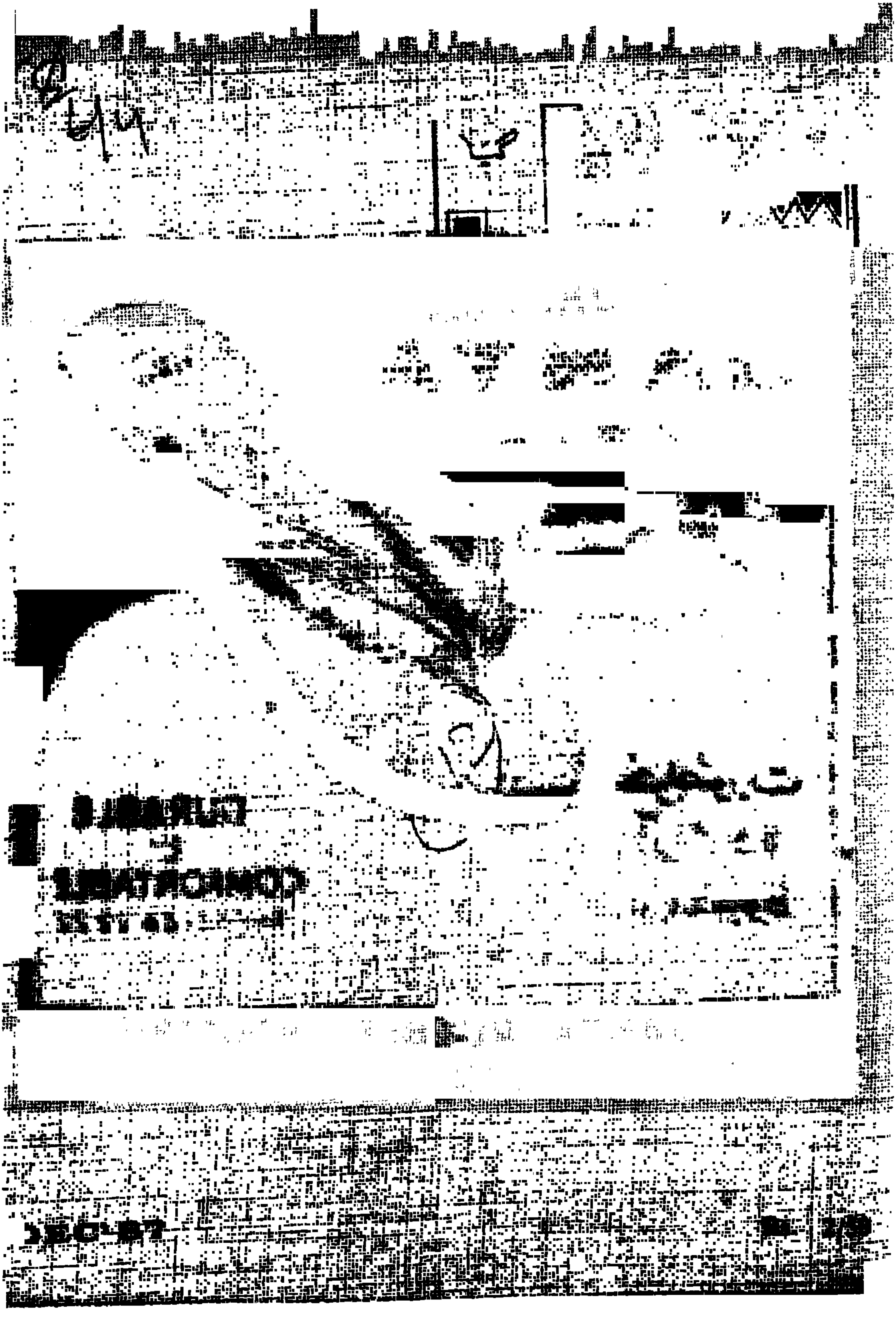


TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰


SPECIAL
GUL
HOWRAH
SPECIAL GUL
A R
TRADE MARK
REGD. No. 286803
HAJI. A. RAHIM KHAN & SONS
HOWRAH

Regd. No. Gay-4
Phone : 21573
THE SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya-823 001

Regd with the R. N. P. at R. No. 3520/57
49 Years of Publication




JANTA

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ★ بیادگار :- زین العابدین احمد ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

دسمبر ۸۷ء

فون نمبر ۲۱۵۷۳

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر	مجلس مشاورت	شمارہ ۱۲	جلد ۱۹
ایڈیٹر :- جمیل منظر	ڈاکٹر تاراچرن رستوگی	بدل اشتراک فی شمارہ	۲/۵۰
معاونین :- شکیل احمد جمالی	ڈاکٹر قمر رئیس	زرسالانہ	۳۰ روپے
عبدالقیوم ابدالی	اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر برج پریمی	لائف ممبری	۵۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ سہیل ریو رساڈ روڈ گیا

کتابت :- کلیم ڈنگروی، اشرف گیاوی

اے وادیِ گریز

جگن ناتھ آزاد

کشمیر میں جہلم کی وادی سے ملحقہ ایک چھوٹی سی وادی "گریز" حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ چونکہ اس وادی میں داخل ہونے کے لئے چودہ ہزار فٹ اونچا درّہ "راجدھانی" عبور کرنا پڑتا ہے اس لئے یہ باہر سے آنے والے سیّاحوں کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ ورنہ جہاں تک اس وادی کے مناظر کا تعلق ہے ع "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است" دریائے کشن گنگا جو صبح و شام اپنے دونوں کناروں پر ایستادہ فلک بوس پہاڑوں کے پانو دھونے میں مصروف ہے اس وادی کی دلکشی میں ایک جادوائی اضافہ کر رہا ہے۔

چند روز ہوئے مجھے دو روز تک اس ساٹھ مربع میل وادی کی سیر کرنے کا موقع ملا۔ یہ اشعار انھی خوشگوار لمحات کی یادگار ہیں۔

دیکھ اے نگاہِ شوق! یہ دنیائے کیف ریز
یہ خاک مشکبار، یہ ماحولِ عطر بیز
تو جزوِ ارض ہے کہ جہانِ نشاط خیز
اے وادیِ گریز!

دل میرا تیری صبح، تری شام پر نثار
اے وادیِ جمیل و طربناک و پُربہار
اے بزمِ رنگ و نور، تماشائے حشر خیز
اے وادیِ گریز!

تیری فضا ہے جلوہ سینا لئے ہوئے
میری نظر ہے ذوق تماشا لئے ہوئے
ہر ذرہ ہے دیارِ دل و جاں پہ برق ریز
اے وادیٔ گریز!

ہر صبح دھوپ اترتی ہے جب کوہسار سے
نکھرتی ہے تیرا منہ گہرِ آبدار سے
اے خطۂ جمیل و حسین و نشاط خیز
اے وادیٔ گریز!

دولت عجیب دل کو ملی اور کیا کہوں
نایاب شے ہے یہ ترے ماحول کا سکوں
بہتا ہوا میرا اس میں یہ دریائے تند و تیز
اے وادیٔ گریز!

ڈاکٹر برج پریمی

مہجور اور منٹو

مہجور کشمیری زبان کے عہد ساز شاعر ہیں ہنوں نے کشمیری شاعری کی غنائیہ روایات کو ایک نئی ہت دیکر نئی منزلوں سے آشنا کیا۔ مہجور کی ابتدائی ناعری میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے روایت کی چھاپ ہے۔ لیکن وہ بہت جلد اس دور کی شاعری کی ان ھی دنیاؤں سے زینہ بہ زینہ اس دنیا میں اترتے ہوئے سوس ہوتے ہیں۔ اور ان کے یہاں ان کے گرد و پیش دنیا مچلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ پرچھائیوں کا تعاقب کرنے کے بجائے انسانوں کی دنیا میں خاک چھانتے ے نظر آتے ہیں۔ روایت کی حدود میں رہ کر بھی ایک نئے شعری مزاج کا تجربہ کرتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے عناصر کو شعر کی زبان دیکر ایک مجتہدانہ رول ادا تے ہیں۔ مہجور گل و بلبل کے عشق اور حسن میں انسانی ندگی کے تب و تاب کا فسوں جگاتے ہیں اور اپنی قوم کی ل در نسل غلامی، ان کے احساس کمتری، ان کی ناداری اور افلاس اور جاگیردارانہ نظام کے داؤ پر چڑھی ہوئی ان کی آرزومندیوں کو انہیں استعاروں میں ڈھال کر اپنے تنفس کے شعلوں سے سلگا دیتے ہیں، ایک تند، واضح اور نوکیلی آواز کشمیر کے در و دیوار میں لہراتی ہے اور جاگیرشاہی نظام کے ایوانوں کو ہلا دیتی ہے۔ مہجور کی یہ آواز اس تحریک کو قوت اور حرارت بخشتی ہے جو صدیوں کی غلامی کے خلاف کشمیر میں بلند ہوئی تھی۔ لیکن مہجور نعرہ باز نہیں تھے۔ ان کی آواز میں آگ ہے لیکن وہ فن کے حسن اور اس کی خوشبو کا سودا نہیں کرتے۔ وہ مثالیت اور رمزیت کے حسن سے اپنے اشعار میں نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ وہ غم اور غصے کو شعور اور فن کی خراد پر چڑھا کر کھری بات کہنے کے قائل ہیں۔ یہ مہجور کا شاعرانہ اعجاز تھا کہ وہ عوام کے دل کی دھڑکن کی آواز بن گئے اور انہیں اپنی حیات میں ہی بقائے دوام حاصل ہوا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مہجور کی دو نظمیں "پوشے متہ جانانو" (اے میرے

پھولوں کے شہزادے) اور گرلیتی کور (دہقان دوشیزہ) انگریزی ترجمے کے توسط سے مہاکوی ٹیگور تک پہنچیں۔ ان نظموں کے سحر نے مہاکوی کو موہ لیا۔ لفظوں میں چھپے ہوئے قوس قزح کے رنگ، جنگلی ہرنوں کی مست خرامی، نیلی جھیلوں کے گہرے سائے اور برہ کی آگ میں جھلسی ہوئی برہن کی پتھروں کو پگھلا دینے والی لے۔ مہاکوی نے دور پہاڑوں کی پنہائیوں میں چھپے ہوئے ایک غیر معروف شاعر کی آواز کے رس میں قدرت کی مہانتا روح کی آسودگی اور ازلی حُسن کے تقدس کا احساس ہوا تھا جس کا وہ خود عاشق تھا۔ اسی احساس نے اسے مہجور کو "کشمیر کا دردس ورتھ" کہلوایا ـــــ مہاکوی ٹیگور کے احساسات میں مہجور کی پہلی شناخت کا احساس ہوتا ہے ـــــ اس کے بعد آہستہ آہستہ مہجور کے جشن کا احساس کشمیر کے پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں میں جاگ اٹھا۔ یہ مہجور کی شاعری کا سر آغاز تھا۔

برسوں بیت گئے۔ مہجور کی شاعری جغرافیائی حصاروں کو توڑ کر پورے برصغیر کو اپنی خوشبو سے معطر کرنے لگی۔ ان گیتوں میں نئے کشمیر کے ان خوابوں کی تفسیر تھی جنہیں مہجور نے احساس اور شعور کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ ایک نئی آواز تھی جس میں کتنی ہی ناآسودگیوں کی تپش تھی۔ کتنی ہی ٹیسیں تھیں اور غم اور ملال اور غصے کی آنچ تھی۔ اس نظام کے خلاف جس نے کشمیریوں کے ارمانوں کو خاکستر کیا تھا اور انہیں مسلسل در مسلسل غلامی کا طوق پہنایا تھا۔ حتیٰ کے پاکستان میں رہنے والا بدنام اور معتوب افسانہ نگار، جسے شاعری کے شعبے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس آواز کی حدت سے پگھل گیا۔ یہ حساس شخص ایک اور کشمیری تھا ـــــ سعادت حسن منٹو! جسے شاعر کشمیر مہجور کو ساری عمر نہ دیکھنے کی محرومی نے اظہار ملال پر مجبور کیا تھا۔

"کشمیر میں نے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن
کشمیری دیکھے ہیں۔ لیکن افسوس اس
بات کا ہے کہ میں نے مہجور کو نہیں
دیکھا ہے........"

منٹو کی سب سے بڑی کمزوری کشمیر تھا۔ اسے زندگی بھر یہ احساس تڑپاتا رہا کہ اس نے کبھی کھلی آنکھ سے اپنا آبائی وطن کشمیر نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف ایک بار بٹوت تک ہو آیا تھا۔ جب اسے دق کا مریض قرار دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ کشمیر سے اس کی دلچسپی کا سبب۔ بڑا سبب یہ تھا کہ وہ کشمیری الاصل تھا۔ کوئی پانچ پشت پہلے ان کے جد امجد خواجہ رحمت اللہ سکھوں کی عملداری میں اپنے دوسرے بہت سے اہل وطن کی طرح کشمیر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر قیام ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے خواجہ جمال الدین کچھ عرصہ کے بعد امرتسر چلے آئے تھے۔ اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن وہ منٹو ذات کو بھول نہیں سکے جو ان کے کشمیری پن" پر دال تھا۔ منٹو ـــــ ڈیڑھ سیر کا بٹہ! اس لئے کشمیر کے تعلق سے جب بھی کوئی بات ہوئی تو منٹو کہتے تھے۔

"میں کشمیری ہوں ـــــ ایک ہاتو"
میں بھی کشمیری ہوں، بہت عرصہ ہوا ہمارے آباد
اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے۔"

"میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا ہمارے آباؤ
اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے۔"

یہی سبب ہے کہ کشمیر کا ذکر آتے ہی منٹو جذباتی ہو جاتے تھے۔ اس سرزمین کے ساتھ یہی تعلق انہیں "بیگو" "ایک خط" "مصری کی ڈلی" "لالٹین" جیسی کہانیوں کے بعد "ٹیٹوال کا کتا" اور "آخری سلیوٹ" جیسی کہانیاں لکھواتا ہے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو کے بزرگ سکھ عہد میں، سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر ترک وطن پر آمادہ ہوئے تھے۔ منٹو اس واقعے کو بھول نہیں سکے تھے۔ اس کے تحت الشعور میں یہ بات محفوظ تھی کہ مہجور نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ظلم و ستم کو برداشت کیا تھا اور اس کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ مہجور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے منٹو رقم طراز ہیں:۔

"مجھے ندامت ہے کہ میں آباد اجداد نے
ہجرت کی جور و ستم سہنا بڑی بات ہے
لیکن ہجرت بہت بڑا مزا ہے۔ مہجور نے
ظلم و ستم سہے اس نے سب سے بڑی
اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے۔ برداشت
کی مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی
اس کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ وہیں رہا
جہاں کا وہ تھا۔۔۔۔۔

(شاعر کشمیر۔ مہجور کاشمیری)

تقسیم منٹو کے لئے ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی مصنوعی تقسیم کو دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کا ایمان تھا کہ مذہب ماورا سیاست کے نام پر کھینچی ہوئی کوئی لکیر دلوں کا بٹوارہ نہیں کر سکتی لکھتے ہیں

"اب اس خطۂ زمین کے نئے نام نے کیا
بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی
حکومت کیا ہوتی ہے۔ اس کی تصویر بھی
کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں
آتی تھی ۔۔۔۔"

(گنجے فرشتے)

اس لئے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوئے تو منٹو بے چین ہو گئے۔ اس دور کی بعض کہانیوں میں منٹو نے اپنا غم انڈیل دیا ہے۔ ان کے پس پشت ایک انسان دوست افسانہ نگار کا درد اور ملال ملتا ہے ۔۔۔

"سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان
اپنا وطن ہے یا پاکستان"

(گنجے فرشتے)

اس لئے جب تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تناؤ بڑھتا ہی گیا تو منٹو اپنے جذبات پر پہرہ نہ بٹھا سکے۔ وہ شاعر کشمیر مہجور کو یاد کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ مہجور کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نغموں کا رس نفرت اور کدورت کے زہر پر تریاق رکھ دیتا ہے ۔۔۔ لکھتے ہیں:۔

"کاش مہجور زندہ ہوتا!
اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم
کی ضرورت پیش نہ آتی وہ اپنے قلندرانہ انداز میں
جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی
کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو، انسان کا خون
پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ ۔۔

مسلمان ہو یا ہندو ہو ہر حالت میں کشمیری ہے۔
تم جواہر لال ہو ـــــ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو۔ لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔ تم گوگجہ اور بھتہ (شلغم اور چاول) کو ایسے دسترخوان سے کبھی نکال نہیں سکتے پھر تم کیوں لڑتے ہو۔ شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ ـــــ کیا تم ایک دوسرے کے گریباں میں ہاتھ ڈال سکتے ہو ــ؟

(شاعر کشمیر ــــ مہجور کاشمیری)

یہ مضمون منٹو نے ۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا تھا۔

مہجور اور منٹو میں بہ ظاہر کوئی مماثلت نہیں۔ ان میں مماثلت کی تلاش دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی باک نہیں کہ دونوں کے یہاں آزادیٔ وطن کی آرزو ہے دونوں کے یہاں جبر اور ظلم کے خلاف بغاوت کی آگ ہے۔ دونوں کے یہاں انسان دوستی اور فرقہ واریت کا پیغام ہے۔ دونوں مذہب کے نام پر ہوئے مظالم کی قلعی کھول دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر دونوں کا وطن کشمیر ہے۔

آزادی کے بعد مہجور کا لہجہ کچھ ناامیدانہ ہو جاتا ہے وہ آزادی" لالو لالو ہا گل لالہ" (اے گل لالہ) "پوشہ نوبو" (اے پوشنول) وغیرہ نظموں میں طنز آمیز لہجہ اختیار کرتا ہے اور منٹو پاکستان جاکر آنکھیں ملتے ہوئے رہ جاتا ہے اور "چچا سام کے نام خطوط" کے سیریز میں اپنی تمام بصارت کے ساتھ اپنے غم اور ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا لہجہ بے حد زہرناک ہو جاتا ہے۔ اور اپنے شعور کی تمام بالیدگیوں کے ساتھ اس نظام پر وار کرتا ہے جو مغربی سامراج کی کٹھ پتلی بن چکا ہے۔

منٹو کے یہاں رومان نہیں ملتا۔ زندگی کے تلخ حقائق ملتے ہیں۔ لیکن مہجور کے کلام میں جو "رومانیت" انہیں نظر آئی تھی اس سے محظوظ ہوئے تھے۔ اس لئے کہ مہجور کے ہجر میں انہیں وصل کا حظ ملا تھا۔ اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہجر ہماری رومانوی شاعری کا ایک
اہم جزو ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا بلا ہے
کیونکہ اس سے مجھے آج تک واسطہ نہیں
پڑا لیکن مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے
کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال
تھا ــــ۔"

منٹو نے مہجور کا مکمل طور سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کا مطالعہ ناقص ترجموں کے توسط سے نامکمل مطالعہ تھا۔ اگر انہیں مہجور کی حقیقی جینیون (GENUINE) شاعری کا راست یا اچھے ترجموں کے ذریعے مطالعہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اختصار پسند سعادت حسن منٹو اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب میں اپنے مخصوص استعاروں کی تمام صباحتیں اور تمام دوشیزگیاں نچھاور کرتا ـــ

▲▲

سہیل گیا کے اداریے

بالخصوص غفران مآب ادریس شنہاروی کے تناظر میں

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
پرد باڑی، گوہاٹی۔

صحافت، بالخصوص ادبیاتی صحافت معمولی تنظیم نہیں ہے۔ گذشتہ سال شاعر بمبئی کے ایک ارے میں میرا مضمون "اداریہ نگاری اور تبصرہ نگاری۔ ایک مطالعہ" شائع ہوا تھا۔ غالباً ان دونوں نو عات۔ ملتزمات ومقتضیات کیا ہیں ان پر ہی روشنی ڈالنے کی ایک کاوش کی گئی تھی۔ جس کے محرکات و رسائل وجرائد میں مشمول وہ تبصرے اور وہ اداریے تھے جو محض جذباتی بکر کود ہی پر مبنی معلوم ہوتے ے۔ ہنوز صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور مستقبل قریب میں اُمید کیا بلکہ شعاع امید بھی نظر ں آتی کہ ادبیاتی صحافت خردمند اور باہوش ہو جائے گی

سہیل ہنوز فسیٹ پر نہیں آسکا ہے مگر اس کا خاص مقام رہا ہے۔ یہ باموقف پرچہ ہے۔ ادب کو ی کا آئینہ دار سمجھتا ہے۔ اور اس کو زندگی کا علمبردار بھی بنا دینا سہیل کا مقصد رہا ہے۔ سہیل اپنے ین کو درون ملک اور بیرون ملک میں رونما ہونے والے تاریخی نوعیت کے واقعات سے غافل نہیں ہونے ۔ رام جنم بھومی مندر ہو یا بابری مسجد، وغیرہ مسائل کوئی اہمیت کے حامل نہیں ہیں مگر وہ ظلمت زدہ یت اور وہ فرقہ واریت جو ایسے مسائل کو پیدا کر رہی ہے سہیل کی نظر میں موجب توجہ بھی ہیں اور قابل انسداد ۔ مذہب کو کہاں اور کس طرح منشیات ومسکرات کے بطور استعمال کیا جاتا ہے، اس حقیقت سے ادارت ل ہمیشہ واقف رہی ہے۔

امن عالم، درون ملک سیکولر نظام کا فروغ، اقتصادی فلاح وبہبود، ہر زبان وادب کا راہ ترقی پر ن ہونا، وغیرہ مسائل ہی در خور اعتنا رہتے ہیں۔ طبقاتی سماج میں انسان، انسان نہیں رہتا ایک شے بن ہے، ایسی شے بن جاتا ہے، ایسی شے جس کی بازار میں خرید وفروخت ہو سکتی ہے۔ جمہوری طرز نظام اگر لست خطوط پر استوار نہ ہو تو بس اس کو نام نہاد جمہوری نظام کہا جا سکتا ہے۔ ایسے جمہوری نظام

میں فقط دو آزادیاں (LIBERTIES) ہی عوام کو ملتی ہیں، ① بھونکنے کی آزادی (جس کو آزادئ تقریر کہا جاتا ہے) اور ② بھوکوں مرنے کی آزادی (LIBERTY TO STARVE)

مودودیت، ہندو راشٹروادیت وغیرہ ایسے زہر آگیں تحریکات کا انسداد ضروری ہے۔ منفی رجحانات کی پشت پناہی بیرون ملک میں سرگرم کار سی۔آئی۔اے جیسی ایجنسیاں کررہی ہیں۔ اور ان ایجنسیوں کا جال بین الاقوامی سطح پر بچھا ہوا ہے۔ غائر نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پہلے پہل متعدد چرچوں (گرجا) سے وابستہ جماعتیں ہر ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی آڑ میں مصروف استحصال ہیں۔ آج کل جو کچھ کیا جارہا ہے وہ مذاہب کو وسیلہ بناتے ہوئے ہی کیا جارہا ہے۔ ہرے رام، ہرے کرشن، کرشنا کونشینسیس (Kirishna Conscionsness)، جماعت اسلامی، مسلم لیگ، شیوسینا وغیرہ سی۔آئی۔اے کے کھولے نئے محاذ ہیں، جذبات کو منافقاتی ومسکراتی سطح تک برانگیختہ کرکے ہر جگہ انتشار پیدا کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بھولے بھالے ہندو مسلم عوام دام ہمرنگ زمیں کو دیکھنے کے لئے بصارت سے بیگانہ ہیں۔ سیاست کاروباری سطح پر آچکی ہے اور موروثی جائداد سی ہوگئی ہے۔ باپ کے بعد بیٹا، اور بیٹا نہ ہو تو بیٹی یا زوجہ محترمہ وغیرہ علی الترتیب ایم۔ایل۔اے اور ایم پی وغیرہ بن رہے ہیں۔ اور یہ بڑی مہلک حقیقت ہے۔

غرض کہ ایسے منفی رجحانات وتحرکات کے خلاف ادبی محاذ کھولنے والا اردو میں سہیل کے علاوہ اور کوئی جریدہ مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ ادریس مرحوم کے سپرد قلم کئے ہوئے اداریوں سے انتخاب ستمبر، اکتوبر ۸۶ء کے شمارے میں مشمول ہے۔ سماجی اور اقتصادی فلاح وبہبود کے خواہاں مرحوم کے رشحات قلم سے آج بھی رشد وہدایت حاصل کرسکتے ہیں۔

ایک بات اور توجہ کے قابل ہے۔ مرحوم کے بعد بھی، سہیل کی ادارت انہی صالح سطور پر استوار ہے۔ سرورق پر سماجی اور ادبیاتی رہنماؤں کے فرمودات وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ مثال کے لئے نومبر ۸۶ء کے شمارے پر روسی شاعر مایاکوفسکی (Mayakowsky) کی نظم کا ایک حصہ سرورق کی زینت بنایا گیا ہے۔ شاعر کی گھن گرج مردہ دلوں کو پیغام زندگی دیتی ہے اور منفی قوتوں کے خلاف عوامی محاذ کھولتی ہے۔ جمیل منظر نے سہیل کی روایت کو قائم ودائم رکھا ہے بلکہ سہیل کو جمال وجلال دونوں سے قارئین کو روشناس کرانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔

سہیل عقل ودانش کو مستقیم ومتوازن بنانے کی راہ پر گامزن ہے۔ جمیل منظر نے اس کے گام وخرام میں مزید گرمی اور توانائی لانے کی جو سعی جمیل کی ہے وہ ایک شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے اور اس حقیقت کی بھی آئینہ دار ہے کہ وہ اپنی وراثت، یعنی صحافتی اقدار، وراثت کے مستحق ہیں۔

خاک شد فطرت بہ پستی لیک مژگاں ورنہ داشت
ورنہ از ما تا بہ بام آسماں یک زینہ بود (بیدل)

سردار شفیق

"دریوزہ گر اندھیرا"

افق کی جانب
عجیب حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا ہے
سکوتِ شب کے دریدہ دامن سے اپنا زخمی بدن چھپائے
شکستہ محراب کو پناگاہِ غم بنائے
اداسیوں، نامرادیوں کی یہ کہنہ تخلیق، چاک دل، سر برہنہ دریوزہ گر اندھیرا
خلا کی وسعت میں نابصیرت کا بوجھ اٹھائے
تھکا تھکا سا ہے
گردِ بے سمتیِ سفر سے ہے خاک برسر
قدم میں بوجھل، کمر خمیدہ
زباں پر المدد کا نعرہ
نظر میں بے خواب دائرے سے
سپیدیِ صبحِ نو سے کہدو کہ اپنے اس بیکراں سمندر سے چند قطرے اسے بھی دیدے
کچھ اس میں اپنے شکستہ حالات دیکھنے کا شعور جاگے
سمجھ سکے راستوں کے تیور
سجھائی دے موڑ زندگی کا

نیا ہندستان

علی باقر زیدی

مجھے اے اہلِ دل سوزِ وطن کی بات کرنا ہے
خزاں خوردہ تمنائے چمن کی بات کرنا ہے
جو شعلوں میں جلا اس گلبدن کی بات کرنا ہے
جو خوں میں تر ہوا اس پیرہن کی بات کرنا ہے
خموشی ہے گنہگاری کہ حق گوئی کی منزل ہے
نظر بھی اہلِ دل ہے اور قلم بھی صاحبِ دل ہے
یہ سناٹا، یہ وحشت، یہ اداسی کی فضا کیوں ہے
ہر انساں شاہراہِ زیست میں سہما ہوا کیوں ہے
فضا میں ہر طرف بکھرا ہوا شور و بکا کیوں ہے
میرے ہمسائے میں لرزاں نوائے کربلا کیوں ہے
یہ شہرِ خوش نوا، شہرِ خموشاں بن گیا کیسے ؟
نیا سورج بھی یوں شامِ غریباں بن گیا کیسے
کہیں بے گور بے کفن مظلوم انسانوں کی لاشیں ہیں
کہیں اشکوں سے دامن تر، کہیں بے نور آنکھیں ہیں
کہیں انسانیت کے خون کی پیاسی فضائیں ہیں
کہیں شعلہ بداماں بغض و نفرت کی ہوائیں ہیں
یوں ہی بڑھتے رہے نفرت کے یہ شعلے تو کیا ہوگا
یوں ہی جلتے رہے تہذیب کے کعبے تو کیا ہوگا

اسی فرقہ پرستی نے ہنسی کلیوں کی چھینی ہے
اسی فرقہ پرستی نے خوشی پھولوں کی چھینی ہے
اسی نے روشنی عشرت بھری آنکھوں کی چھینی ہے
اسی نے سرخیٔ رنگِ حنا ہاتھوں کی چھینی ہے
یہی فرقہ پرستی بانٹتی ہے زہر کا پیالا
اسی دیوانگی نے گاندھی جی کو قتل کر ڈالا
چلو انسانیت کے قصر کی پھر سے بنا ڈالیں
اٹھو نفرت کے بام و در جہاں بھی ہوں گرا ڈالیں
بڑھو نقشِ کہن سارے تعصب کے مٹا ڈالیں
چلو افسانۂ شامِ غمِ ہجراں بھلا ڈالیں
شہیدوں کے لہو سے داستانِ بے خزاں لکھ دو
وطن کے ذرے ذرے پر نیا ہندوستاں لکھ دو

غزل

پروفیسر عنوان چشتی

یہ سچ ہے شہر میں آتش بجاں نہیں ہے کوئی؛
مگر سکون سے یار دیہاں نہیں ہے کوئی۔

دل و نگاہ یہ اک دوسرے سے پوچھتے ہیں
نہاں نہیں ہے کوئی یا عیاں نہیں ہے کوئی

بچھی ہوئی ہے ازل سے عجب بساطِ وجود
ہے میزبان مگر میہماں نہیں ہے کوئی

نہ دھوپ کا کوئی پیکر نہ سائے کا آسیب
یہ دشت، دشتِ انا ہے یہاں نہیں ہے کوئی

خود اپنی ذات پہ اس کے وجود کی صورت
یقین ہو نہ ہو، لیکن گماں نہیں ہے کوئی

ضمیر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکاں نہیں ہے کوئی

یہ زندگی ہے اسے لوٹ کر نہ کیوں چاہوں
کہ اس کے بعد، بہار و خزاں نہیں ہے کوئی

میں اپنے قتل کے محضر پہ دستخط کر دوں
ترے خلوص پہ مجھ کو گماں نہیں ہے کوئی

ہر ایک دل ہے تہی، کاسۂ نظر کی طرح
مگر غضب یہ ہے خالی مکاں نہیں ہے کوئی

دلوں کے بیچ ہے "دیوارِ گریہ" مانتا ہوں
محبتوں کے مگر درمیاں نہیں ہے کوئی

دلوں کا قحط ہے عنوانؔ آج دنیا میں
مکیں ہزار ہیں، لیکن مکاں نہیں ہے کوئی

غزلیں

بدیع الزماں خاور

قفس سے چھوٹے ہیں یا گلستاں سے آئے ہیں
پتا نہیں، یہ پرندے کہاں سے آئے ہیں
ہیں جتنے وار جگر پر، تری نگاہ کے ہیں
جو تیر آئے ہیں تیری کماں سے آئے ہیں
یہاں تک آ تو گئے ہیں مگر بتائیں کیا ؟
گزر کے کتنے کڑے امتحاں سے آئے ہیں
عجب نہیں، وہ ترے در پہ پھر پہنچ جائیں
جو اُٹھ کے آج ترے آستاں سے آئے ہیں
لکھا ہے سب میں یہی، دشت سے چلے آؤ
مراسلات جو ہم کو مکاں سے آئے ہیں
ہے میرے سامنے منظر نئی بلندی کا
فرشتے لینے مجھے آسماں سے آئے ہیں
خزاں کے ہیں کہ بہاروں کے، کیا کہیں خاورؔ؟
پیام چند نئے گلستاں سے آئے ہیں

سرولق شہری

دیدۂ حیراں کے آگے خود پسندی آگ جیسی
سارا جذبہ کوئلہ سا، ساری نیکی آگ جیسی
میرے سر پر پھر دہکتے مسئلوں کے دن ہیں روشن
میری آنکھوں میں ہے باقی رات ساری آگ جیسی
اس رُخِ دو طرفہ میں بھی کون یکتائے ہنر ہے
برف ہے میرا تغافل ہوش مندی آگ جیسی
موم کے پتلوں سے یہ لمحے بدل سکتے نہیں ہیں
شہر میں چاروں طرف ہے شر پسندی آگ جیسی
قربِ آتش کی کوئی خواہش نہیں سیراب ہو گی
مت عطا کر اب کسی کو سربلندی آگ جیسی
سرد موسم کی ہواؤں سے بھی پودے سوکھتے ہیں
شکر ہے کہ ذہن میں چلتی ہے آندھی آگ جیسی
سمتِ موجِ آگہی آواز دیتی ہے مجھے اور
لفظ ہیں تشنہ معانی فکر میری آگ جیسی

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری (بھدوہی)

پریشانی میں بھی پھولوں کو ہنستا چھوڑ آئے ہیں
ترے گلدان میں ہم نقش اپنا چھوڑ آئے ہیں
کسے آواز دیتے ہو ضمیر اب ہے یہاں کس کا
اسے تو راستے میں لوگ کب کا چھوڑ آئے ہیں
ہمیں یہ دور تک پھیلا ہوا صحرا بتاتا ہے
کہ جس رستے پہ منزل ہے وہ رستا چھوڑ آئے ہیں
پرائے شہر میں ہر شخص کی نظریں یہ کہتی ہیں
کہ ہم اپنے وطن میں اپنا چہرا چھوڑ آئے ہیں
تمہیں ہم سے شکایت ہے فقط ترکِ محبت کی
ارے ہم زندگی کا ہر سلیقہ چھوڑ آئے ہیں
ہمیں اب وہ بھی ساقیؔ لائقِ نفرت سمجھتے ہیں
کہ جن کے واسطے ہم ساری دنیا چھوڑ آئے ہیں

غزلیں

نجم عثمانی

تعلق دیکھئے کیا رہ گیا ہے
اکیلا میں، وہ تنہا رہ گیا ہے

مکمل ہو گئی اس کی کہانی
مرا قصہ ادھورا رہ گیا ہے

ہمارے شہر میں ہر اک قدم پر
فقط خطرہ ہی خطرہ رہ گیا ہے

بچھڑ کر خود سے مل جاؤں جہاں سے
یہی بس ایک رستہ رہ گیا ہے

نتیجہ، امتحاں، تعلیم، کالج
تماشہ ہی تماشہ رہ گیا ہے

وہ سب قدریں پرانی بھول جاؤ
نئی تہذیب میں کیا رہ گیا ہے

عبدالمتین نیاز

سب موڑ راستوں کے ہماری نظر میں ہیں
ہم زندگی کے ساتھ مسلسل سفر میں ہیں

چلتے ہوئے ہی ملتے ہیں کوئی مقام ہو
احساس آگ جیسے چراغوں کے سر میں ہیں

بستی جلی تو اوروں پہ الزام کس لئے
چنگاریاں تمام تمہارے ہی گھر میں ہیں

آنسو یہ بس کے نہیں اپنے حال پر
طوفان خواہشوں کے مری چشم تر میں ہیں

اِن سے ہمارا رشتۂ جبار، ہے بندھا ہوا !
روزن ذرا، ذرا سے جو دیوار و در میں ہیں

تم جن کو حسن فکر بتاتے ہو دوستو
یہ حسرتوں کے داغ ردائے ہنر میں ہیں

صحبت بھی اہل علم کی کرتی ہے سر بلند !
ہم یوں مہک رہے ہیں کہ خوشبو کے گھر میں ہیں

حرفِ نوا سے اس نے نوازا ہے اس لئے
"ہم بے ہنر بھی حلقۂ اہل ہنر میں ہیں"

پرواز کا جنون ابھی جاگا نہیں نیاز
ورنہ بلندیاں تو مرے بال و پر میں ہیں

شمیم قاسمی

دل کے اندر غبار سا کیوں ہے
اور باہر خمار سا کیوں ہے

جب مکمل ہے خاک کا پتلا
آدمی پھر بھی پارسا کیوں ہے

بے وفائی تو ایک فیشن ہے
پھر ترا انتظار سا کیوں ہے

چاند کے رُخ پہ داغ کیسا ہے
پھول کے ساتھ خار سا کیوں ہے

جب زمانے پہ اعتبار نہیں
آپ پر اعتبار سا کیوں ہے

تو نے کب کی وفا زمانے سے
زندگی مجھ سے پیار سا کیوں ہے

جو عمل میں رقیب جیسا ہے
دیکھنے میں وہ پارسا کیوں ہے

کیا کوئی زخم پھر نیا دے گا
ان دنوں دل بہار سا کیوں ہے

قاسمی کس کی یاد آئی ہے
آج تو اشکبار سا کیوں ہے

پشو دھن ہے دھرتی کے پران
پشو پالن ہے کرم مہان

انیمل ہسبنڈری کے سائنسی طریقے کو اپنائیے
سفید انقلاب کو کامیاب بنائیے

- دودھ زمین پر آب حیات کی دھار ہے
- دودھ انسان کے لئے قدرتی مقوی غذا ہے
- دودھ ہر فرد کے لئے متوازن غذا کی بنیاد ہے
- دودھ کی پیداوار فائدہ مند روزگار ہے ـــــ اس لئے

جانوروں کا سنکر پرجنن کرائیے ـــــ اور

زیادہ سے زیادہ دودھ دینے والے جانوروں کی تعداد بڑھائیے ۔ آسانیاں اے ا—

1. ریاست کے کونے کونے میں کل ۱۶۲۵ مراکز پر جانوروں کے سائنسی اور تکنیکی پرجنن کی سہولیات دستیاب
2. دور دراز مقامات پر اعلیٰ غیر ملکی نسلوں کے سنکر سانڈھوں کی تقسیم
3. ہیمی کرت شکر سے پرجنن کے ذریعہ مویشیوں کے مستحکم حاملہ ہونے کی سہولیات
4. چارہ دانا کی پیداوار بڑھانے کے لئے کئی نکاتی پروگرام
5. سنکر باچھیوں کے پالن پوشن کے لئے غریبوں کو قرض اور گرانٹ
6. پشو پالن کی سائنسی تکنیک میں پشو پالکوں کو تربیت
7. جانوروں کے نسل سدھار کے طریقوں کی تشہیر
8. حاملہ ہونے سے متعلق امراض کا نبٹارا اور علاج
9. ماہرین کے ذریعہ جانوروں کی حاملہ جانچ کی آسانیاں اور سستی جانچ کی آسانی

ان آسانیوں سے فائدہ اٹھائیے ـــ اور ـــ پشو پالن کو فائدہ مند صنعت بنا۔

خصوصی معلومات کے لئے ـــ اپنے ڈویژنل انیمل ہسبنڈری آفیسر سے رابطہ قائم کیجئے

پشو پالن اطلاعات و نشریات سروس کے ذریعہ جاری

पी० आर० डी० बि० 459 पट (पु-210)/87-88

شبیہہ عباس جارچوی

پیوستہ شجر

بستی سے ایک میل دور کھیتوں اور باغوں کے درمیان لگ بھگ ۱۴ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا کالج، ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، سکنڈری اسکول، ہوسٹل، لائبریری، ایڈمن بلاک، کینٹن وغیرہ کا نظارہ ایک منفرد منظر تھا۔ حدِ نظر تک کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ تھے یا کیکر اور ببول تھا۔ کچھ آم کے درخت بھی تھے۔ کچھ زمین پر سبزیاں کاشت ہوتی تھیں اور کچھ خالی پڑی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن اور مرکزی شاہراہ سے یہ جگہ تقریباً ایک میل دور تھی۔ اور طلبا مین شاہراہ سے پیدل، تانگوں میں یا حسب حیثیت اپنی ذاتی سواری میں کالج اور دیگر تعلیمی اداروں میں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک کچی لیکن خاصی کشادہ سڑک تھی۔ جو مرکزی شاہراہ کو کالج سے ملاتی تھی۔ شدید گرمی اور دھوپ میں طلبا اور طالبات بجائے سڑک کے، درختوں کے سائے میں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سے جایا کرتے تھے اور ایسا ہی بارش کے دنوں میں ہوتا۔

محمد کامل انسپکٹر آف اسکولز آج اس تعلیمی ادارے میں واقع سکنڈری اسکول کا معائنہ کرنے اپنی موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ یہ وہی کچی سڑک تھی جس پر آج سے تیس سال پہلے وہ بحیثیت طالبعلم کالج میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ وہ عجیب قسم کا جوش، ولولہ اور سرور و انبساط محسوس کر رہے تھے۔

محمد کامل کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج طالب علمی کے زمانے کی طرح اس سڑک پر سیٹیاں بجائیں اور کھجور کے درختوں سے کھجوریں گرا کر کھائیں لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ ایسا کرنے میں نا رہے تھے۔

زمانے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد وقت گزر جانے کے باوجود آج جن طالب علم ساتھیوں اور استادوں کے نام کامل صاحب کو یاد رہ گئے تھے وہ انہیں بہت یاد آ رہے تھے۔ سارے چہرے نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے، موٹا حمید نے ایک مرتبہ تانگوں کے اڈے پر لڑکیوں کی موجودگی کے سبب کئی تانگے چھوڑ دیئے تھے، کلاس ٹیچر ظفر صاحب نے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔ ظفر صاحب جب کلاس میں گئے تو حمید غیر حاضر تھا۔ پریڈ ختم ہونے سے چند لمحے قبل جب حمید کلاس میں آیا تو ظفر صاحب نے حمید موٹے سے کالج لیٹ آنے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا تھا، "آج گھر پر دیر ہو گئی۔" ظفر صاحب نے تانگہ اسٹینڈ پر لڑکیوں کے کھڑے ہونے کے سبب تانگے چھوڑ دینے کا واقعہ سنا کر حمید موٹے کی بھری کلاس میں بے عزتی کر دی تھی۔ علیم لمبا جو تمام استادوں کی نقل اتارنے کا ماہر تھا، رئیس جو ہر لڑکی کو بہن بنانے کے لئے تیار رہتا تھا، شوکت جو کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا۔ فہیم جو

سے مشہور تھا کیونکہ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اور پنج وقتہ نمازی تھا، محبوب اور عالیہ چپ چاپ ایک دوسرے کو چاہ رہے تھے لیکن بات کرنے سے کتراتے تھے پھر بھی یار لوگوں نے ان کی آنکھوں سے لفظ چن کر دیواروں پر منتقل کر دیئے تھے اور ایسے ہی کئی سچے اور متعدد نام جو وقت گزرنے کے بعد دھندلا کر ذہن سے محو ہو گئے تھے جانے آج یہ لوگ زندگی کی کن راہوں پر مصروف سفر ہوں گے اور ان میں سے اتفاقاً آج کوئی مل بھی جائے تو انہیں اتنی فرصت نہیں ہو گی کہ آپس میں بیٹھ کر بیتے ہوئے لمحوں کو دو گھڑی یاد کر لیں۔ رسمی سا ہیلو ہیلو اور بس، فریدہ اس کی زندگی، اس کا عشق، اس کی محبت۔ اور سب کی طرح جانے کہاں ہو گی۔ فریدہ کا نام ذہن میں آتے ہی کالج میں اس کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ آنکھوں میں تصویریں بن کر لہرانے لگا۔ کتنے اچھے تھے وہ دن۔ کالج بھر میں دونوں کا نام تھا۔ دونوں پڑھائی میں بہت تیز تھے، ہزاروں مقابلوں کے باوجود کوئی تیسرا ان کی جگہ نہ لے سکا۔ اول اور دوم پوزیشنیں گویا ان دونوں کے ہی درمیان گردش کرتی تھیں۔ ساتھ مل کر پڑھنا، لان میں بیٹھ کر باتیں کرنا، ایک دوجے سے لڑنا، روٹھنا، منانا اور جب ان کی منگنی ہو گئی تو دوستوں کا چھیڑنا، سہیلیوں کے چھیڑنے پر اس کا شرمانا، کیسے کیسے لمحے اسے یاد آ رہے تھے لیکن خوش ہونے کے بجائے وہ اداس ہو گیا کہ اس کے مناظر بڑی المیہ کیفیت لئے ہوئے تھے۔

وہ کتنے اچھے دن گزر رہے تھے، شادی تعلیم ختم ہونے پر مشروط تھی کالج کا ابھی ایک سال باقی تھا۔ پچھلے دو سالوں میں انہوں نے گھر کے جتنے خواب دیکھے تھے، ہوائی قلعے بنائے تھے، ان کے تکمیل کا وقت قریب آ رہا تھا کہ اچانک فریدہ کی بڑی آپا چار بچوں کو بلکتا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ فریدہ کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ دس دن تک فریدہ کالج نہیں آئی۔ وہ گھر جا جا کر دیگر لوگوں کے ساتھ تسلیاں دیتا رہا۔ لیکن ایک دن یہ اچانک وہ ہو گیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے محل مسمار ہوتے ہوئے نظر آئے اس کے خوابوں نے اس کو دھوکا دے دیا۔ اسے ساری دنیا غیر سی لگنے لگی۔ فریدہ نے کہا کامل اب تم مت آیا کرو۔ مجھے بھولنے کی کوشش کرو، شاید وہ نہ ہو جو ہم نے سوچا۔ "کیوں فریدہ کیوں" "بس کہا نا شاید تم میرے نصیب میں نہیں ہو۔" "کچھ بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے۔" "نہیں تم بہت اچھے ہو تم سے کوئی گناہ نہیں ہوا مگر میرا نصیب شاید راستہ بدل رہا ہے" "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا فریدہ مجھے پوری بات بتاؤ شاید میں کچھ کر سکوں"، "نہیں کامل پوری بات مجھے بھی معلوم نہیں ہے لیکن یہ جانتی ہوں کہ تم کچھ نہیں کر سکتے، نہیں کر سکو گے" "لیکن معلوم تو ہو میرا قصور، میرا گناہ" "تمہارا کوئی قصور نہیں میری بھی کوئی خطا نہیں" "لیکن وہ بچے جو آپا کے بعد بن ماں کے رہ گئے ہیں ان کا بھی تو کوئی قصور نہیں نا۔ میرے خاندان والے اس خالی ہو جانے والے خلا کو تمہاری فریدہ کی ذات سے پُر کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے اگرچہ ابھی تک کسی نے کوئی بات نہیں کی ہے لیکن"، "لیکن کیا" "تم ہی بتاؤ کامل اگر انہوں نے مجھ سے ایسا چاہا تو مجھے کیا کرنا چاہیئے بولو" اور کامل کو چپ سی لگ گئی۔ "بولو کامل کیا میں خود غرض بن جاؤں، چار معصوم بچوں کو کسی انجانی سوتیلی ماں کے آسرے پر چھوڑ دوں۔ میں یا میرا خاندان میرے بہنوئی کو دوسری شادی سے روک سکتے ہیں؟ بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ ماں کے بغیر پرورش ناممکن ہے اور میرے بہنوئی بھی ابھی عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں بیوی کی اشد ضرورت ہے۔ تم بتاؤ کامل اگر میرے خاندان نے یہی فیصلہ کیا تو میں انکار کر سکتی ہوں؟" کامل دیر تک خاموش رہا۔

آخر پھر فریدہ نے ہی مخاطب کیا "کامل بولو، بولتے کیوں نہیں یہ سب غلط ہے تو مجھے راستہ دکھاؤ کوئی ایسا راستہ جو مجھے منزل تک لے جانے اور آنے والی تباہی بھی روک سکے۔ تب کامل نے صرف اتنا کہا، تم عظیم ہو فریدہ، تم سچ کہتی ہو آج کے بعد ...... " پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور خدا حافظ کہے بغیر تشا کا کمرے اٹھ گئے۔ پھر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ فریدہ کن اذیتوں کا شکار ہو رہی ہے، کب اس کی شادی ہوئی انہوں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور آج ایک زمانے کے بعد وہ پھر اپنے آبائی شہر کی طرف لوٹ رہے تھے وہ اپنی پرانی یادوں میں گم نہ جانے کہاں نکل جاتے کہ اچانک سامنے کالج کے بورڈ سے ٹکرا گئے۔ سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے بورڈ پر نظر پڑی، یہیں تو آنا تھا انہیں۔ انہیں آج اس اسکول کا انسپکشن کرنا تھا۔ جو کالج کے احاطہ ہی میں تھا۔ انہوں نے خود کو الرٹ کیا جیسے پیشہ وارانہ کیفیات پیدا کیں، اور اسکول میں داخل ہو گئے سامنے ہی کمرے پر پرنسپل کے نام کی تختی لگی دیکھ کر سیدھے وہیں چلے گئے۔ پرنسپل کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے لگے عجیب سادگی کا نمونہ تھا کمرہ، ہر شے صاف ستھری اور روشن، لیکن ہر شے میں کسی نہ کسی حوالے سے آسمانی رنگ موجود، انہیں ایک بار پھر فریدہ یاد آئی، کتنا پسند تھا اسے یہ رنگ، [illegible] اسی رنگ کا خریدتی تھی۔ تو شش قائل اسی رنگ کا [illegible] اور قرار دیا کا [illegible] پر کوئی تک بھی کوشش کرتا کہ آسمانی رنگ کے کاغذ سے مجھے جلائے، " آہ، فریدہ [illegible] تم! اچھا خدا تمہیں خوش رکھے۔ [illegible] سمجھ لیا وہ [illegible] عمر سے ملک سلسلے بھی سنبھل گئے۔ پرنسپل جہاں تھیں وہیں ٹھٹھک گئیں

کامل کو تو آنکھیں جھپکانا بھی یاد نہ رہا۔ جانے کتنے جگ بیت گئے کتنی صدیاں گزر گئیں۔ کتنے زمانے درمیان میں آ گئے۔ اور پھر دونوں کی زبانوں کے تالے ایک ساتھ ٹوٹے "کامل تم" "فریدہ تم" دونوں کے چہروں پر عجیب تاثرات تھے ——— بہت مسرتوں کے، بہت دکھ کے، کچھ پا لینے اور کچھ کھو دینے کی کیفیات ایک ہی وقت میں حملہ آور ہو گئی تھیں۔ جانے کتنے لمحے بیت جاتے اگر ایک ٹیچر کو پرنسپل آفس میں کام نہ پڑ جاتا۔ فریدہ نے خود کو نارمل کیا اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کامل سے بیٹھنے کو کہا، گھنٹی بجائی، چپراسی آیا۔ تو اس سے پانی منگایا اور ٹیچر کا مسئلہ طے کرنے لگیں۔ اس کے جانے کے بعد بہت رکھ رکھاؤ سے پوچھا "جی کامل صاحب کیسے زحمت کی؟ آپ ٹھنڈا لیجیے گا یا گرم؟" "نہیں کچھ نہیں، میں دراصل اس اسکول کا انسپکشن کرنے آیا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ ...... یہاں تم ......"

کوئی بات نہیں، ہم ایک دوسرے کے مجرم نہیں ہیں تم نے میری مجبوریوں کے ساتھ نباہ کیا ہے۔ تم بہت عظیم ہو میں تمہارا احترام کرتی ہوں۔ "فریدہ تم خوش ہو نا" "مگر کیوں؟ جب آدمی قربان ہوتا ہے تو خوشی اور رضا بھول جاتا ہے۔ کیا خیال ہے" فریدہ نے زخمی مسکان کے ساتھ کہا۔ "ہاں!" کامل نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا، "تم کہو تم خوش ہو نا کامل؟" فریدہ ایک ایسی جوت نے جلا دیا کیا صرف تمہارے لئے ہے؟" "او نہیں کامل یہ ایک حقیقت ہے عالمی حقیقت" اپنے گھر کی بچوں کی سناؤ، خوش ہو نا! بچے کتنے ہیں؟ "ماں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے، "میرے دو ہی چار بچے تھے جن کی ماں مجھے دنیا نے بنا دیا اور بس" "میں نے اللہ سے دعا کی کہ تیرے ہی بندوں نے مجھ پر بڑا بوجھ ڈالا ہے تو مجھ پر رحم کرنا، اس نے میری دعا سن لی لیکن ......"

لیکن کیا ...... ؟" بچوں سے ان کا باپ چھین کر" اوہ کیسے ہوا یہ سب۔ بس نکاح کے دوسرے دن جب ابھی میں نے آپا کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، میرے بہنوئی جو نکاح نامے کی رو سے اب میرے شوہر تھے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گئے اور دوسرے دن انہوں نے سب سے ناتا توڑ لیا۔ پھر...... پھر تم نے شادی نہیں کی؟" "کیا کرتی قدرت شاید یہ بچے مجھ سے پلوانا چاہتی تھی۔ میں نے انہیں پالا۔ جوان کیا اب ماشاءاللہ سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میرا کیا ہے میں نے سمجھ لیا میری قسمت میں سکھ گھر نہیں ہے، جب کبھی کوئی تمنا کی تھی کب پوری ہوئی کہ اب خواہش کرتے۔ خیر چھوڑو جو بیت گئی سو بیت گئی تم سناؤ کہاں ہو، گھر بیوی بچے کیسے ہیں۔ خوش ہو؟" کامل جانے کہاں کھو گیا تھا۔ "اوہو ۔۔۔ کیا؟" "میں تمہارے گھر کے بارے میں بیوی بچوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟" "میں نے تو شادی ہی نہیں کی، میں ہوں اور میرا ماضی بس" "کیوں؟" "کیونکہ میرے ساتھ کوئی مجبوری نہیں تھی تمہاری جیسی، اور کسی بھی قسم کی شادی کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا تھا میں کسی بھی خاتون سے شادی کر سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ منافقت ہوتا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں تو خود اپنا ہی نہیں تھا۔ اسے کیا دیتا میرے پاس اسے دینے کے لئے کوئی خوشی نہیں تھی۔؟" "کامل یہ تم نے کیا کیا زندگی برباد کر دی" "نہیں فریدہ کہاں برباد ہوئی ہے، کسی کام میں اگر دیر ہو جائے، راہ میں رکاوٹیں آ جائیں تو کیا زندگی برباد ہو جاتی ہے؟ کیا میں اب بھی تمہارے لئے وہی کامل نہیں ہوں؟ اگر میں تمہیں کالج کی اسٹوڈنٹ فریدہ سمجھنے لگوں تو کیا غلط ہوگا؟" "فریدہ پہلے مجھے اسکول کا انسپکشن کراؤ، بولو ...... بولو نا فریدہ ......

اور بربادی کی فریدہ سنجیدہ سی پرنسپل نے سر جھکا لیا: پہلے مجھے اسکول کا انسپکشن کراؤ۔ اور پھر ہمیں اب جانا ہے، چلو گی نا میرے ساتھ، میرے گھر، تمہارے ہمارے گھر ———— فریدہ نے اثبات سر ہلاتے ہوئے شرما کر منہ پھیر لیا۔ کامل کو ایسا لگا وہی کالج کا زمانہ ہو، کالج کا لان ہو، اور فریدہ کامل کسی شریر جملے پر شرما گئی ہو۔

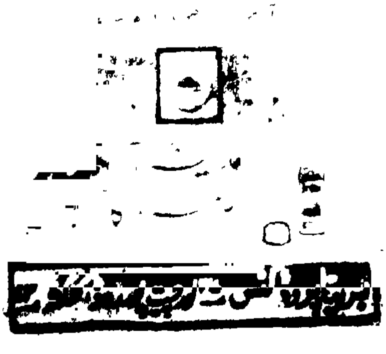
بقیہ: ہندوستان زندہ باد

رکھا ہوا تھا کہ

میں ایسے عہد میں زندہ ہوں میری ہر سچ

دوسرا مصرع سنائی نہیں دیا کیونکہ ٹرانسسٹر سے کی آواز آنے لگی تھی جیسے اس آزاد اور جمہوری ہندوستان میں امن اور یک جہتی کی جگہ روزانہ دنگا، فساد، لوٹ کھسوٹ کے نقارے بجتے رہتے ہیں۔

نعرہ لگانے کو جی چاہا۔ مگر ہم چپ رہے پیا، چائے کو حلق کے نیچے اتارا، اور کاؤنٹر پر پیسے باہر آیا۔ اور جب باہر آیا تو میرے منھ سے نکلا: ہندوستان، زندہ باد!



لباس

مبین صدیقی

آنکھیں دھوکہ کھا جاتی ہیں یا کھلائی جاتی ہیں حقیقت کی پہچان میں۔ خوشی، غم، بیل، بوٹے، پھول پھل، خوشبو، بدبو، صحرا، سمندر، روشنی، تاریکی، چمن کھنڈر، پرند وچرند یا دوسری چیزوں کے وجود اور اس کی حقیقت۔ مبین کو سمجھنا آسان ہے بہ نسبت ــ ایک انسان کے ــ کیونکہ انسان اور اس کے ماحول کی ترتیب اتنی پیچیدہ، ایسی پہلودار واقع ہوئی ہے کہ اکثر وبیشتر خود انسان جسے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اور اگر کسی پہلو کی حقیقت تک کوئی انسان پہنچتا بھی ہے تو ایسی پہنچ، ایسی کھوج، ایسی حقیقت پر ہر دور میں انسان ذہنی وقتی اور تغیر پزیر لیبل اس طرح چسپاں کر دیئے جاتے ہیں کہ آنکھیں دھوکہ کھا جاتی ہیں یا کھلائی جاتی ہیں حقیقت کی پہچان میں اور بس! ــ

ابھی میں کمپاؤنڈ میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ لوگ مجھے گھور گھور کر ایسے دیکھے جا رہے ہیں جیسے وہ مافوق الفطری باتوں پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہوں۔ وہ گھورے جا رہے ہیں اور میں ــ سیدھا جا رہا ہوں۔ چیمبر کی طرف، تیز تیز قدموں کے ساتھ! لیکن اس سے پہلے کہ میں چیمبر میں انٹر کرتا گیٹ پر ہی بہادر مجھے روک لیتا ہے۔ میں نے سمجھا وہ مجھے سیلوٹ کریگا، مگر یہ ــ وہ تو مجھے اوپر سے نیچے تک متذبذب انداز میں گھور رہا ہے۔ جیسے لوگ لڑکی دیکھنے جاتے ہیں۔ پھر اسے جیسے کچھ یقین آگیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں ایک طرف ابھر گئیں اور اس نے کڑک کر پوچھا ــ "اے کون ہو تم۔ ادھر کہاں جانا ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اندر ــ صاحب سے ملنے" اور بہادر کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ "ایں ــ تم جاؤ گے ــ اندر؟" ــ وہ ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا ہے۔ جیسے دنیا کا سب سے بڑا جوکر میں ہی تو ہوں۔ اور میں گڑگڑاتا ہوں ــ "دیکھو بھائی! مجھے بہت ضروری کام ہے۔ ذرا جلد اجازت طلب

کرو۔" اس نے میری اَن سنی کر دی۔ اور مونچھ پر تاؤ پھیرتے ہوئے۔ "جاجا، تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ آئینے میں کبھی اپنی صورت دیکھی ہے؟" بس پھر کیا تھا۔ میں برس پڑتا ہوں اس پہ اور وہ بھی انگریزی میں۔ جی ہاں! ہندستانیوں کو اگر سمجھانا ہو تو انگریزی جھاڑیں۔ سو بہادر میرے منہ سے انگریزی سن کر ایسے اچھلتا ہے جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اور وہ ایک بار پھر مجھے گھورنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ ابھی گھور ہی رہا تھا کہ ایک شخص اچھے خاصے معیاری لباس میں ملبوس گیٹ پہ برآمد ہوتا ہے۔ بہادر فوراً اندر جاتا ہے۔ اندر سے آتا ہے اور اس کے اندر بھیج دیتا ہے۔ اور پھر چونکتے ہوئے مجھ سے پوچھتا ہے "ہاں! کام ــــ؟" میں جھنجھلا جاتا ہوں "ارے کہا نا کہ ــــ" وہ جملہ کاٹتا ہے ــــ "مگر تم اس حالت میں نہیں جا سکتے کیونکہ تمہارا لباس، تمہارا حلیہ، مینرز ــــ" میں بھی تلخی سے جملہ کاٹتا ہوں ــــ "مارو گولی لباس ــــ کو ابھی ہندستان کی یہی پوزیشن ہے۔ حالانکہ میں ایم۔ اے ہوں۔ ٹیلینٹ ہے میرے پاس اور زبان و بیان وغیرہ بھی ــــ" "پھر بھی تم اندر نہیں جا سکتے کیونکہ تمہارا ــــ" اور اس سے قبل کہ میں اسے پھر ایک بار جھاڑتا ــــ انگریزی میں ــــ انگریزی حلیہ کا ایک ہندستانی چیمبر سے باہر آتا ہے، اس کے ہاتھ میں گلاب کا اک پھول ہے۔ وہ بڑی نزاکت سے چلتا ہوا ایک طرف کو مڑتا ہے۔ اسے دیکھتے بہادر جھٹ اسے سیلوٹ کرتا ہے۔ اور پھر اسے آگے جاتا دیکھ کر میرے کان میں کہتا ہے ــــ "یہی صاحب ہیں ــــ" کہ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا صاحب تک پہنچ جاتا ہوں۔ انگریزی میں اسے فریاد کی ٹھانی تھی مگر یہ کیا ــــ ابھی ٹھیک سے جملے بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ سر اٹھاتا ہے۔ پھر اپنے ہاتھ میں جھولتے گلاب کو اک مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جیسے میرا موازنہ کر رہا ہو۔ اور پھر اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل جاتی ہے ــــ پھول سونگھتا ہوا میری پرواہ کئے بغیر بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی اس حرکت سے ذہن بھٹے کی طرح سلگنے لگتا ہے۔ اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں آگے بڑھتا جاتا ہوں۔ سوچے سمجھے بغیر اندر پھر صاحب کے بالکل قریب پہنچ کر صاحب کو ایک ایسی نرم دھکا دیتا ہوں کہ صاحب کے ہاتھ میں جھولتا نرم و نازک گلاب زمین پر آ گرتا ہے۔ وہ مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہے۔ میں بڑے پیار سے "سوری" کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں۔

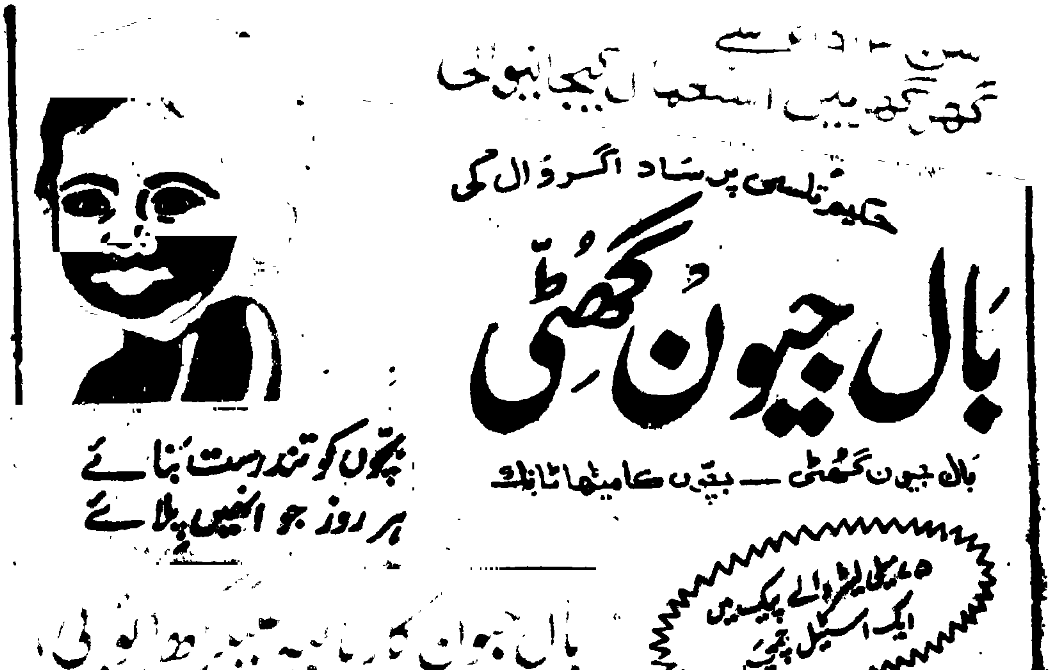
بہادر شاید میری یہ حرکت دیکھ چکا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور پوچھا "ارے۔ یہ صاحب کے پھول کیوں گرا دئے؟" ــــ میں نے اطمینان سے کہا "کیونکہ بھائی وہ ــــ پھول کے قابل نہیں ــــ" وہ سٹپٹا کر میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر میں ــــ آگے بڑھ جاتا ہوں بڑی تیزی سے ــــ

گھر پہنچ کر میں متضاد کیفیتوں کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میں الجھا ہوا ہوں کہ یہ مینٹینیس، یہ لباس، یہ طبعہ ہی ہے شاید جس کی وجہ کر دوستوں کو بھی کچھ دلوں سے کھنچا کھنچا سا پاتا ہوں۔ پہلے ہی وہ بہادر کی طرح کھل کر کہتے نہیں۔ جو بھی ہو یہ ہندوستان کی طرح میری بھی بدنصیبی ضرور بن گئی ہے۔ اور میں بھی اس میں ایسے ہی لاعلاج ہوں جیسے ہندوستان کے ۷۰ فی صد لوگ!

میں انہیں افکار میں ڈوبا تھا کہ دروازے سے صدا آتی ہے۔ "بابو ——" میں نے چونک کر دیکھا۔ کوئی عورت پھٹے پرانے لباس زیب تن کئے کھڑی ہے دوسری طرف کو —— اور میں سمجھ گیا۔ پر میرے پاس دینے کو کچھ ہے ہی نہیں سو میں معذرت چاہتا ہوں۔ "معاف کیجئے —— دوسرا دروازہ دیکھئے۔"

میرے اس جواب پر وہ جلدی سے مڑی۔ جیسے زلزلہ آنے والا ہو —— اور واقعی! جب وہ مڑی — مجھ پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں کیا بتاؤں۔ وہ جو میرے روبرو ہے ندامت اور بے بسی سے میری حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ میں دھڑپھڑا کر اٹھتا ہوں اور اس کے قریب جا کر گڑگڑاتا ہوں۔ "مجھے معاف کر دیجئے، میں آپ کو پہچان نہیں سکا — امی!"

اور وہ میرے ان حرکات پر پہلے تو مجھے غور سے دیکھتی رہیں جیسے مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ شاید ان کی آنکھیں بھی حقیقت کی پہچان میں —— اور پھر کہتی ہیں۔ "بیٹے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!" میں سوچتا ہوں کاش! وہ مجھ سے بجائے طبیعت کے لباس کو پوچھتیں —— کاش! —



نشاط الایمان

ہندوستان زندہ باد!

چالیس سال پہلے جب ہم انگریز بہادر کے غلام اور چاکر تھے تو ہم کُڑھا کرتے تھے کہ ہمارا ملک کتنا بڑا ہے لیکن ہم کتنے چھوٹے ہیں۔ ہمارے دیس کی دولت سے برطانیہ کے لوگ کتنے لال اور خوشحال ہو رہے ہیں۔ مگر ہم کتنے کالے اور کنگال بنتے جا رہے ہیں۔ ہمارا پیارا وطن آزاد نہیں جبکہ دوسرے ممالک آزاد اور خوشحال ہیں ———— ہم نے آزادی کی لڑائی چھیڑ دی۔ آخر کار ہم نے ۱۹۴۷ء میں انگریز بہادر کی، ساری بہادری دریائے ٹیمس میں بہا دی۔ دریائے گنگا میں نہیں بہائی کہ کہیں وہ اور میلی نہ ہو جائے۔ اور ہم سو فیصد آزاد ہو گئے گرچہ اس آزادی کے لئے ہم نے بڑی فراخ دلی اور کشادہ دماغی سے اپنے پڑوسیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا۔ ان کی بہو بیٹیوں کی عزتیں لوٹیں۔ اور بچوں کو دیواروں پر مار مار کر ملک عدم پہونچایا۔ کیونکہ ہماری نگاہوں میں وہ ہندو تھے مسلمان تھے اور سکھ تھے مگر آدم کی اولاد نہیں تھے۔

آزادی کی سرخوشی اور اس کی ترنگ میں ہم اتنے مگن رہے یا یوں کہیے کہ ہم اپنے محلہ ہی کے جشن آزادی کے تالاب میں اتنی ڈبکیاں لیتے رہے کہ چالیس برس ہو گئے ہم اس گھروندا سے نکل کر آزاد ہندوستان کو نہیں دیکھ پائے۔ وہ تو کہیے کل مہینوں بعد اپنے گاؤں کے للّو سے ملاقات ہو گئی اور اس سے باتیں کرتے کرتے یکبارگی خیال ہوا چلو چالیس سال کے بعد ہی سہی آزاد ہندوستان کو ہم بھی ضرور دیکھیں کیونکہ جب للّو ٹرک کا ڈرائیور ہو کر کشمیر سے لے کر نیفا تک اور نیپال کی ترائی سے لے کر کیرالا کی سرحد تک آزادی کا لطف اٹھا سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں اپنی آزادی سے حظ لے سکتے ہیں۔ لیکن شروعات ہم اپنے شہر کے جغرافیہ سے کریں گے، کیونکہ ہم نہ ٹرک ڈرائیور ہیں اور نہ سیاسی لیڈر۔ اور نہ ہوائی جہاز کے پائلٹ، ہم تو فقط ایک اسکول ٹیچر ہیں لہٰذا اپنی خواہش کے احترام کے لئے ہم نے پکا ارادہ کر لیا کہ کل سویرے سے ہی شہر کے آزاد جغرافیے سے آزاد ہندوستان کو دیکھنے کی بسم اللہ کریں گے۔

ہم بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے ہی کیونکہ ہم جس پیشے سے منسلک تھے اس کو برتنے کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ کے فاصلہ پر جانا پڑتا تھا۔ فرائض کی انجام دہی سات بجے شروع ہو جاتی تھی۔ اس لئے اتوار کو غنیمت سمجھ کر ہم آزاد ہندوستان

کے ایک آزاد شہر کو دیکھنے چل پڑے ۔ یہ شہر بھی ایسا ویسا نہیں تھا یہ آزاد ہندوستان کی ہر پہلو سے نمائندگی کرتا

ہم نے روزانہ ملازمت پر جانے کی دھن میں کبھی بھی راستہ کے زیر و زبر اور پیش پر نظر نہیں ڈالی ۔ بس نوکری مالا جپتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے ۔ اس بار جو ہم اپنی اونگھتی ہوئی گلی سے نکل کر لمبے چوڑے راستہ (جسے مہذب اا شستہ زبان میں شاہراہ کہا جاتا ہے) پر نمودار ہوئے تو دیکھا ایک جگہ گھوروں کا منی ہمالہ پہاڑ کا ایک بے ڈھب دوا تک چلا گیا تھا ۔ اور اس سے بڑے صحت ناک قسم کے بھبکے نکل رہے تھے اور اس کے ارد گرد تقریباً ایک درجن ابن آدم اور بنت حوا ، سگ اور سگ زادے استراحت فرما رہے تھے جب ہی تو کسی منطقی نے کہا ہے کہ آدمی بھی کت ہے ۔ میں نے یہ خوشگوار منظر دیکھ کر بے ساختہ کہا ——— ہندوستان زندہ باد !

آگے بڑھا اور بڑھتا گیا ۔ یکایک ایک جگہ میرے پاؤں کو بریک لگ گیا ۔ نظر ادھر گئی ، ایک میدانچہ وک پڑا ۔ پتہ نہیں میدانچہ لاوارث تھا یا میونسپل کارپوریشن کی تحویل میں تھا ۔ کیونکہ اس کے مین گیٹ پر کسی طرح کا بورڈ نہیں تھا میدانچہ کا فرش کسی کے گنجے سر کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور وہاں اس وقت ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے سایہ کرم میں ایک صاحب قدیم لوازمات کے ساتھ بھاشن دے رہے تھے ۔ سننے والے زیادہ نہیں تھے مگر جو تھے وہ بڑ ہمت اور بھگتی سے ان کی پھٹی پھٹی آواز کی طرف متوجہ تھے ۔ وہ فرما رہے تھے " اب بھارت ورش کا کلیان اسے میں ہے کہ یہاں ایک دھرم ، ایک کرم اور ایک جاتی زندہ رہے .... جب یہ سنہرا اور روپہلے بول سنے " تو دل نے کہا جب ہی تو کبھی علی گڈھ ، کبھی دہلی ، کبھی مراد آباد وغیرہم کی دھرتی کو خون سے رنگا جاتا ہے اور ایک جمہوریت کے بورڈ پر کالک ملی جا رہی ہے ۔ میری زبان سے نکلا ——— آزاد ہندوستان زندہ باد !

اب ہم ایک تجریدی آرٹ نما محل سے گذر رہے تھے وہاں جا بجا دھواں کے مرغولے چھائے ہوئے تھے محلہ کی ایک گلی سے ایک میت نکلی ، میت کے ساتھ بمشکل پندرہ بیس آدمی ہوں گے ۔ اتنی صبح صبح ، پتہ نہیں کون تھا ، میت بہرحال ہندو ہی کی تھی ۔ کیونکہ اس کی نشاندہی ارتھی سے ہو رہی تھی ۔ لیکن ارتھی کے ساتھ جانے والوں میں کچھ مسلمان بھی دکھائی دے رہے تھے ۔ رہا نہیں گیا ، پوچھ ہی بیٹھا " کون اس لوک سے جا رہا ہے بھائی ؟"

" غلط بول گئے بھائی " ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے تیکھے انداز میں کہا ۔ " کہئے کون اس نرک سے سورگ جا رہا ہے ،، سنیئے ! یہ کرشن گوپال اشک جی کی لاش ہے جو اردو ہندی کے مقبول ادیب تھے ،،

" ارے اشک جی یہاں بود و باش کرتے تھے میں سمجھتا تھا وہ کسی شاندار فلیٹ میں رہتے ہوں گے اور ان کی ارتھی میں یہ چند لوگ ؟ "

" یہ بنگلہ زبان کے مہان لیکھک شرت چندر جی کے قبیلہ کے تھے نا ! شرت جی کی ارتھی بھی اسی طرح گئی تھی ، اشک جی نے بالکل غلط راستہ اختیار کیا تھا ۔ ان کو تو کسی سیاسی پارٹی کا نیتا ہونا چاہیے تھا ۔ ہوتے تو آج لوگوں کے اژدہام میں آخری سفر کرتے اور ان کے ساتھ ریڈیو اور ٹی وی کے فوٹو گرافر بھی ہوتے اور پھر اخباروں کے رپورٹر بھی ——— ہائے کرشن جی ! اور میں نے من ہی من میں نعرہ لگایا ، ہندوستان زندہ باد

اب راستوں پر سواریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ بھی آباد ہونے لگے تھے اخبار فروش بھی نمودار ہو چکے تھے۔ میں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک اخبار والے سے روزنامہ "دندرات" خریدا۔ اور ایک کنارے کھڑے ہو کر دل و دماغ کو فرحت پہونچانے لگا۔ بڑی زوردار اور توپ اڑ اخبریں تھیں۔ ایک خبر پر میری نظر جام ہو گئی —————— کہ یونیورسٹی کے کیمپس پر مجرموں اور بدمعاشوں کا قبضہ۔ کیمپس میں شراب کی دکان اور جوا خانے کھول دیئے گئے۔ ہیروئین کا دھڑلے سے استعمال، پولس کی بے عملی اور سماج دشمنوں سے سازباز —————— میرے منھ سے یکبارگی نکلا۔ آزادی کا سیدھا مارگ —————— ہندوستان زندہ باد۔

میں جہاں کھڑا تھا وہ ایک مصروف ترین اور جدید تہذیب کی نمائندہ جگہ تھی سڑک کے دونوں جانب نئے ڈیزائن کی عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ اور وہاں رنگ برنگ کی دکانیں تھیں۔ آزادی سے پہلے یہاں کے بام و در کسی بوسیدہ ٹاٹ کی طرح لگتے تھے کیونکہ یہاں کبھی عیسائیوں کا ہاؤس فل قبرستان تھا۔

کانوں میں آواز آئی —— ابے کون حرامی کا پلا میرے سائین بورڈ پر کولتار پھیر گیا ہے سالے اپنے بچوں کو تو انگلش اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ اور ہندی کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر انگریزی بھاشا کو گالیاں بکتے ہیں۔ اور اپنے بھاڑے کے ٹٹوؤں سے رات کے اندھیرے میں انگریزی کے سائین بورڈوں پر سیاہی پھیرواتے ہیں۔ ستیاناس کر دیا کنویں کے مینڈکوں نے ...... مڑ کر دیکھا تو ادھیڑ عمر کے مارواڑی بڑی حسرت سے اپنے خوبصورت سائین بورڈ کی بدصورتی کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ذرا بلند آواز سے کہا —— ہندوستان زندہ باد

ہم آزاد ہندوستان کے نمائندہ شہر کو دیکھتے ہوئے جا رہے تھے کہ اچانک کچھ فاصلے سے تابڑ توڑ بم کے دھماکوں کی آواز آنے لگیں۔ اور لوگ بے تحاشہ کوؤں کی طرح جدھر سینگ سما رہا تھا بھاگے جا رہے تھے کچھ لوگ ہماری جانب بھی دوڑے آ رہے تھے۔

دو تین آزاد شہری تو ہمارے دائیں بائیں سے آگے نکل گئے۔ لیکن ایک صاحب کو تو ہم روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے ٹھہرنے کی وجہ ان کی ڈھیلی ہوتی ہوئی دھوتی، اور نقاہت بھی تھی۔ ورنہ شاید وہ بھی ہاتھ نہیں آتے۔

ارے آزاد ہندوستان کے آزاد شہری بھائی؟ ہوا کیا جو آپ اس طرح بھاگے جا رہے ہیں۔

پہلے تو انہوں نے ہمیں یوں دیکھا جیسے سمجھ رہے ہوں کہ کہیں ہم کوئی پاگل یا سنکی تو نہیں ہیں۔ لیکن جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ ہم صحیح و سالم دماغ والے ہیں تو انہوں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔" ہوگا کیا بھائی۔ یہ سیکریٹریٹ کے لونڈے اتنے آزاد اور بے مہار ہو گئے کہ انہیں سوائے اپنی غرض اور کسی کے چھوہنے کا اور کوئی کام نہیں۔ جب دیکھو سیاسی رقابت اور سواد مشغی میں ایک دوسرے کو پاگل کتوں کی طرح کاٹنے لگتے ہیں۔ آگے ایک ہال میں ایک ناٹک کا پروگرام تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ بم برسنے لگے۔ میں ہوا خوری سے لوٹ رہا تھا کہ ان کے نرغے میں آتے آتے رہ گیا۔ ورنہ یہ کتے مجھے بھی کاٹ بیٹھتے —————— "آزادی سے پہلے ایسی رقابت اور خود غرضی کہاں تھی ؟"

"تو بولو بھائی، ہندوستان زندہ باد۔" اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اب سورج اچھی طرح جاگ گیا تھا۔ سوچا اب رُخ موڑ لیں اور گھر چلیں۔ ہاتھ منہ دھو اور بریک فاسٹ سے رغ ہولیں۔ اس کے بعد اطمینان سے ہندوستان دیکھنے چلیں گے۔ اتوار تو اپنا ہے، لہذا گھر واپس ہونے لگا۔ گھر کیا امیرا، مسجد کے زیر سایہ ایک کھولی نما کمرہ تھا۔ اور اس سایہ کی وجہ سے دہریہ ہونے سے رہ گیا تھا۔

چلتے چلتے ایک دیوار پر نگاہ گئی، اسے دیکھ کر یاد آیا کہ الیکشن کا بخار چڑھنے والا ہے یہ علاقہ ہندو بھائیوں کا تھا ہد دیوار پر بہودی کے مریدوں نے لکھا تھا ——— مسلم مطلقہ خواتین ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر رے امیدوار .... کو ووٹ دیجیے۔ دماغ زیر و زبر ہو گیا۔ آگے بڑھا اور جب مسلم علاقہ میں پہونچا تو اں بھی ایک دیوار پر الیکشنی گل بوٹے نظر آئے، وہاں بھی یہودی کی اولادوں نے لکھا تھا ——— ری مسجد کو رام جنم بھومی بنانے والی فرقہ پرست .... کانگریس کے خلاف ہمارے نوجوان امیدوار کو کثیر ِ ٹوں سے کامیاب بنائیں ——— اس بلیٹو مارکہ ذہنیت پر ہماری زبان سے نکلا ——— انقلاب زندہ د، ہندوستان زندہ باد!

بریک فاسٹ وغیرہ سے نجات حاصل کرنے کے بعد پھر اخبار کو ہاتھ میں لیا۔ ایک جگہ جناب آنسو گریہ آبادی اچھے اسم گرامی پر نگاہ اٹک گئی، یہ خبر تھی یا اشتہار، پتہ نہیں، تحریر یوں تھی۔

جناب آنسو گریہ آبادی کی شعری تخلیق "آنسو کے قطرے" کی رسم اجرا کا ایک جلسہ بے حالی خوش نگری کی دارت میں نور نگ ہال میں منعقد ہو رہا ہے مہمان خصوصی خالص بہاری ہوں گے۔ شرکت کی عام دعوت ہے ا کے بعد آج کی تاریخ اور وقت درج تھا۔

آزادی سے پہلے ایسی ریت رواج کا زور و شور کہاں تھا۔ اب تو حاکم وقت سے لے کر دو نمبر کے ادیب شاعر تک اس کھالا میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ سے کہا چلو آزاد ہندوستان ہی کو تو دیکھنا ہے اسے بھی دیکھیں۔ روپیہ کی نہیں تو کوڑی کی بات ہی پلے پڑ جائے، رسم اجرا کا وقت ساڑھے دس بجے تھا اور ا دس بجے کو آنے میں کافی ٹائم تھا۔ پھر بھی ہم آنسو بے حال اور خالص صاحبان کی دیدار کے لئے چل پڑے۔

راستہ میں ایک اسکوائر پڑتا تھا دور غلامی میں اس پارک میں بارہا گیا تھا۔ اور وہاں کے باغ و بہار سے ف لے کر آتا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد مصروفیت کی غلامی مل گئی۔ اس لئے ادھر گذر نہیں ہوا۔ آج جو اس اسکوائر یکھا تو اس کے اندر جا نکلا ——— چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ کا راج تھا۔ راستے ناہموار، لائٹ پول لب بے نیاز، اور بنچیں اپنی عمر طبعی کو پہونچ گئی تھیں۔ جابجا لوگ نہا رہے تھے اور کپڑے دھو رہے تھے تالاب سے ے جو بیٹھنے کا قطعہ تھا وہ کسی مفلس کا بوریا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت اس کے ایک گوشہ میں کچھ آدمی بیٹھے دم کا مزہ لے رہے تھے اور ایک خستہ بنچ پر دو آزاد عورتیں نظر آئیں جو اپنے قریب بیٹھے ایک مرد سے ونئی پڑے ب گاہ کے ابتدائی منظر کا ریہرسل کر رہی تھیں۔ اور دوسرا مرد ڈائرکشن کے پوز میں کھڑا انہیں ملاحظہ کر رہا تھا۔ ڈائرکٹ سرکاری پاسبان یعنی مالی کا کوارٹر سامنے ہی تھا لیکن اس نے اپنی آنکھوں پر اپنے پیشرو کی طرح کالا چشمہ

چھپالیا تھا۔

[illegible] کرتے ہوئے کہا بھائی مالی! ہندوستان زندہ باد۔

[illegible] ہوگئے۔ ایک جگہ شاہراہ سے ہٹ کر رہائشی عمارتوں کے علاقہ میں ایک فٹ پاتھ پر [illegible] مہاراج [illegible] معلوم نہیں وہ خاندانی دھوبی تھا یا بے کاری سے عاجز آکر یہ دھندا شروع کیا تھا۔ آب باقاعدہ لوہا، چولھا، تخت، اور تخت پر کھمبوں کے ذریعہ کپڑوں کی بٹ، اور دھوپ پانی سے بچنے کے لئے تمبو لگائے ہوئے تھے۔ تخت پر استری دعوت نہیں لوہا کے انتظار میں اندرون خانہ دھلے دھلائے پتلون، شرٹ، ساڑیاں، بلاوز وغیرہ لپٹے لپٹائے براجمان تھے فٹ پاتھ پر چلنے والے راہی وہاں تک آکر راستہ پر اتر آتے، ہم بھی اُتر گئے۔ اس وقت دھوبی مہاراج ایک کرتے کی استری کر رہے تھے۔

ہم نے آواز لگائی ——— آزاد ہندوستان، زندہ باد

ہم گھومتے گھامتے اور آزاد ہند کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لوزنگ ہال پہونچے، ہال میں مشکل سے پندرہ بیس بے چہرہ لوگ کو پایا۔ وقت ہوگیا تھا لیکن کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ نہ ابھی حضرت آنسو کا پتہ تھا اور نہ بے حال صاحب اب تک آئے تھے۔ ہاں ایک لق لق مارکہ کا انسان ڈائس کی ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ شاید وہ خالص بھارتی کا سایہ تھا۔

لیجئے بے حال صاحب اور حضرت آنسو تشریف لے آئے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں، لاؤڈ اسپیکر سے آواز بلند ہوئی۔

ہم بیٹھے بیٹھے سوگئے تھے۔ ہڑبڑا کر جاگ پڑے اور آنکھیں پھاڑ کر صدر دروازہ کی طرف دیکھنے لگے۔

ارے …… ہم نے فوراً اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ورنہ پھاڑا ا بجھ بھر اس ہال میں نکل جاتا۔ جو دو صاحبان ٹھسے کے مغربی [illegible] کا جلوس [illegible] رہے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور سٹہ باز اور ایک فلمی اخبار کے بھاری [illegible] مگر لیکن سماج کے خادم کی حیثیت سے مشہور تھے ان کو ہم نے محلہ میں [illegible] مگر معلوم نہیں [illegible] دیئے گئے "شہید ناز" اور "خادم" بھی تھے۔

ہم اپنی [illegible] ہوئے اٹھے، اور دل ہی دل میں کہا پتہ نہیں نہان خصوصی کس مائینڈ اور گروپ کے ہوں گے۔ اور [illegible] داڑھی کو تصور میں دیکھتے ہوئے من ہی من میں بولا۔ ہندوستان، زندہ باد اور وہاں سے باہر آگئے

[illegible] بچھیلے کی طرح چلتے گئے [illegible] کی دکانوں اور [illegible] کے [illegible] بعد فٹ [illegible] ہم بھی بد ذوق [illegible] ہندوستان [illegible] جا گھسے۔ اور ایک میز پر بیٹھے [illegible] پر ایک ٹرانسسٹر

[illegible] بقیہ صفحہ ۴۳ پر

نئی کتابوں کا تعارف

خواہشمندانِ تبصرہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں

کتاب کا نام :- "بنّے بھائی"
مصنف :- عبدالقیوم ابدالی
ناشر :- ادارہ تحریک، ہاٹن روڈ، آسنسول
صفحات :- ۱۷۶ — قیمت ۲۵ روپے
مبصر :- سرور ساجد

کتاب کا ورق الٹئے تو اوپر ایک گوشے میں "بنے بھائی" اور نیچے قیوم ابدالی لکھا ملے گا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے جان بوجھ کر اپنے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" کا استعمال نہیں کیا ہے حالانکہ یہ کتاب ان کی تھیسس کی ترمیم شدہ شکل ہے۔

صفحہ ۳ پر کتاب ترقی پسند کے روحِ رواں پروفیسر قمر رئیس کے نام معنون کی گئی ہے پھر ان حضرات شکریہ ادا کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طور پر اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مصنف کے معاون رہے ہیں۔

صفحہ ۵ پر مندرجہ ذیل چھ عناوین ہیں

۱۔ دیباچہ
۲۔ مرے پیکر تصور میں حیات تازہ ساری
۳۔ جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار
۴۔ لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
۵۔ ترقی پسند تنقید اور سجاد ظہیر
۶۔ پس نوشت

ان چھ عناوین کے تحت کتاب قاری کو ڈھیر ساری معلومات بہم پہنچاتی ہوئی اور ہماری ادبی روایات کے ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک کی ایسی تصویر جو جاذبِ نظر بھی ہے اور ایک صحت مند ذوق بھی ابھارتی ہے، دکھاتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ کتاب کو پڑھتے وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اتنی بھیانک، قابلِ مذمت اور قابلِ نفرت نہیں تھی جتنی کہ بعض انتہا پسند حضرات نے بیان کی ہے۔ "بنے بھائی" کو پڑھتے وقت ترقی پسند تحریک سے متعلق سنجیدگی سے سوچنے کی ایسی منزل بھی سامنے آتی ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ فنکاروں نے ہمیں اور ہمارے ادب کو کیا کچھ بھی نہیں دیا؟ یا پھر یہ کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے ادب کا جو رویہ تھا یا ادب جتنا وسیع تھا ترقی پسند تحریک نے اس کی مزید توسیع نہیں کی؟ نئے تجربے نہیں کئے؟ نئی باتیں نئے انداز سے کہنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے اور یہ اعتراف بھی کرنا چاہئے کہ گو کہ ترقی پسندوں نے نعرے بازی سے بھی اپنا رشتہ رکھا لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایسے لوگ جن کا مطالعہ وسیع تھا اور جو ہر مقام پر جذباتی انداز سے نہیں سوچتے تھے اس نعرے بازی کی مذمت بھی کی اور گرفت بھی۔ ایسے لوگوں

میں سید سجاد ظہیر سرفہرست تھے۔ یہ کتاب سجاد ظہیر سے متعلق ہے اور ان کے فن و شخصیت کے کئی گوشے ہمارے روبرو ایک نئے زاویے سے پیش کرتی ہے

کتاب پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے مصنف جذباتی حد تک وابستہ ہے۔ اس کے باوجود وہ یک رخی باتیں نہیں کرتا بلکہ تحریک سے وابستہ فنکاروں کی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی جاندار اور صحت مند قدروں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

یقین ہے کہ یہ کتاب "بنے بھائی" ترقی پسند تحریک اور اس کے بانی سجاد ظہیر کے صحیح خدوخال کو ابھارنے اور اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

مصنف نے یہ کتاب ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر شائع کی ہے۔ موقعے کی مناسبت کو دیکھئے تو ترقی پسند ادیبوں کی جانب سے اپنے بانی اور منتظم اول کو اس سے بہتر خراج عقیدت شاید پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ سرورق پر سجاد ظہیر اور فیض کی تصویریں اور back cover پر فیض کی وہ نظم جو انہوں نے سجاد ظہیر کی موت پر لکھی تھی۔ دامن نظر کھینچتی ہیں۔ کاتب کی مہربانیوں کے باوجود یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ کتاب عمدہ اور طباعت صاف ستھری ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ ایسی کتاب کے لئے مصنف قابل مبارکباد ہے۔

"سُہیل" مرحوم ادریس سنبھاروی نمبر

ماہنامہ گیا، ستمبر، اکتوبر ۸۶ ۱۹ء
جلد ۴۸ شمارہ ۱۰-۹
ضخامت ۱۴۴، قیمت ۱۰/- روپے
مبصر:- ڈاکٹر فریدہ کول

سہیل کا یہ خصوصی شمارہ اس کے مدیر مرحوم ادریس سنبھاروی کی زندگی، شخصیت اور صحافت کے بے شمار گوشوں کو نمایاں کرتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں مختلف اہل قلم حضرات کے مضامین، مقالات، تاثرات اور منظومات شامل ہیں۔ جو مجموعی طور پر مرحوم ادریس سنبھاروی کی علمی، ادبی اور صحافتی عظمت کو پیش کرتے ہیں۔ شمارے کا آخری حصہ بہ عنوان "سوگواران ادریس" اور "انتخاب نمود" پر مشتمل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر شمارہ صرف اس دو عنوانات پر مبنی ہوتا تب بھی مرحوم ادریس سنبھاروی کی زندگی، شخصیت اور صحافت کے وہ مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جو ان کی بڑائی، انفرادیت اور عظمت کا اثبات کرتے ہیں۔

زیر نظر شمارے کا مطالعہ کرنے کے بعد میں ادریس مرحوم کے بارے میں ضرور کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک سچے انسان تھے جو اپنے نظریات اور عقائد پر عمر بھر استقلال سے قائم رہے۔ اس شمارے کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ "سہیل" کے مدیر محترم جمیل منظر نے اس میں ایسے اصحاب کے مضامین اور مقالات کو یکجا کیا ہے۔ جو ادریس مرحوم کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سہیل کا زیر بحث شمارہ پڑھ کر نہ صرف ادریس مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشے صاف اور عیاں نظر آتے ہیں بلکہ صحافت اور سماجی خدمات میں ان کے رول اور ان کی انسان دوستی، انسانیت نوازی کی واضح تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

ہمارے ملک میں اشتراکی خیالات رکھنے والے ادباء شعراء اور صحافیوں کی کمی نہیں۔ لیکن ادریس مرحوم نہ صرف اشتراکی نظریہ پر قائم رہے ہیں بلکہ اس نظریہ

س میں لانے کے لئے مرتے دم تک کام کرتے رہے۔ اور بات اس کی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے نظریہ کی صداقت پر راسخ العقیدہ رہے۔ اور اس نے اس کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کرتے رہے۔ ادریس مرحوم بنیادی طور پر انسان دوست اور انسانیت نواز تھے۔ ان کے پہلو میں ایک سچے اور ایماندار انسان کا دل دھڑکتا تھا اس لئے وہ فرقہ پرست نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ علاقائی، لسانی یا کسی دوسری قسم کی عصبیت کا شکار نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے اپنے مضمون " میرے تاثرات پر مطالعہ" میں ادریس مرحوم کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے ادریس مرحوم کی انسان دوستی کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" ادریس صاحب نے ترقی پسندی کو نہ شہرت کے لئے اپنایا تھا اور نہ فیشن کے طور پر اور نہ انہیں اس سے کسی ذاتی فائدہ کی امید تھی دراصل بنیادی طور پر وہ انسان دوست تھے اور جو شخص تمام انسانوں کا دوست ہوتا ہے وہ جمہور کی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچتا ہے۔ اشتراکیت سے ان کی دلچسپی عام انسان دوستی کی وجہ سے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا صالح معاشرہ پیدا ہو جائے جہاں بندہ و آقا کی تمیز نہ رہے۔ جہاں استحصال اور منافقت کشی نہ ہو جہاں طبقاتی خلیج حائل نہ ہو سکے۔" صفحہ ۲۸،

مرحوم ادریس سنسہاروی نمبر ماہنامہ سہیل گیا

ادریس مرحوم کے بارے میں ان کے احباب ہمعصر ساتھیوں کے مضامین پڑھ کر غالباً میں یہ رائے قائم کرنے میں صحیح ہوں گا کہ ادب اور صحافت کے ساتھ ان کا منسلک ہونا اور پھر مختلف حالات میں بھی ادب یا صحافت کو نہ چھوڑنے میں بھی ان کی انسان دوستی کو زبردست دخل تھا۔ وہ سماج اور معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے رہے۔ نیز سیاست دانوں کی چالوں اور غلط طرز عمل کے تار پود بکھیر کر رکھنا چاہتے تھے۔ شاید اس لئے ان کا کہنا تھا کہ اپنے اندر کے احساسات و جذبات کا اظہار کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ صحافت سے منسلک رہے۔ میرا خیال ہے کہ "سہیل" کو زندہ رکھنے میں ادریس مرحوم کی تگ و دو کے پیچھے ان کا یہی جذبہ کارفرما رہا ہے کہ انسانیت اور انسان دوستی کی ایک آواز زندہ رہے۔ ایک مشعل فروزاں رہے۔

زیر بحث شمارے میں ادریس مرحوم کے کچھ اداریئے پڑھ کر معلوم ہوا کہ عوام بات سمجھانے اور مسئلہ سلجھانے [illegible] وہ دلائل و براہین سے [illegible] کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ غرض کہ ہر وہ مسئلہ جو قومی، علاقائی یا لسانی اہمیت رکھتا ہو۔ مرحوم ادریس کے صداقت پسند قلم سے اس کی خوب ترجمانی ہوتی تھی۔ اور مسئلہ الجھنے کے برعکس سلجھنے کی راہ پاتا تھا۔

[illegible] تبصرے میں ادریس مرحوم کے بارے میں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں لیکن مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادریس سنسہاروی ایک عام صحافی اور ادیب نہیں تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک سچے اور مخلص انسان تھے۔ وہ انسان دوست تھے۔ انسانیت نواز تھے۔ انہوں نے اپنی صحافتی

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

محبی، تسلیم

"سہیل" کا نیا شمارہ ملا۔ ممنون ہوں۔ اور متفرق اشعار کو صفحۂ اول پر چھاپنے کے لئے بھی۔ لیکن کاتب کی بے پروائی سے ان اشعار میں بہت سی اغلاط راہ پا گئی ہیں جن سے اکثر اشعار کا مفہوم عنقا ہو گیا ہے۔ نیچے صحت نامہ درج کر رہا ہوں۔ اگر یہ چھاپ دیں تو عمدہ بات ہو۔

مصرع	غلط	صحیح
۵	ذرائے شعلۂ دل	ذرا سے شعلۂ دل
۷	کیا کہوں	کیا کہوں
۱۴	تمر	تجھ
۱۵	گری	گری
۲۶	بہک رہا ہے	مہک رہا ہے
۱۸	پھول	پھول
۲۲	دل سنگ	دل تنگ

مدت ہوئی ہند پاک جنگ کے زمانے میں میری ایک نظم "ہم کوراہ ہندوستان" کے متعدد اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئی تھی۔ ایک شاعر نے اس کا چہرہ اتار اور چند مصرعوں میں تبدیلی کی اور نظم "سہیل" میں چھپوا دی۔ میں نے کئی بار آپ کو شکایت کا خط لکھنا چاہا لیکن مکروہاتِ دنیوی نے مہلت ہی نہ دی۔ اب اس وقت۔ یہ خط لکھتے ہوئے نہ جانے اس کا کیسے خیال آگیا ہے۔ بہر طور اب تو اس بات کو بہت زمانہ ہو گیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد، جموں

برادرم جمیل منظر صاحب، تسلیمات

سہیل کے مارچ ۸۷ء میں محترم مناظر عاشق ہرگانوی بھاگلپور نے "شہرِ خیال" میں محترم گیان چند برادر کوچک عابد پشاوری اور قاضی عبدالودود مرحوم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار انوکھے انداز سے فرمایا ہے۔ اس ضمن میں میں حقیقت اور صداقت پر مبنی چند الفاظ لکھنے کی اجازت چاہوں گا۔ ۱۹۵۰ء یا ۵۱ء میں (ڈاکٹر عابد پشاوری) نے جامعہ دلی یونیورسٹی سے اردو کے ایم۔ اے میں اول پوزیشن اپنی قابلیت کے بل پر حاصل کی تھی لیکن ان کا ہم سبق تھا مگر دفتر سے اجازت نہ ملنے کے باعث

میں نے ایم اے اگلے سال پاس کیا۔ ان دنوں خواجہ احمد فاروقی صاحب ہندوستان سے باہر تھے۔ شیام لال کالڑا کے اول آتے ہی ایک حلقے میں بڑی مایوسی کی لہر پھیلی اور جب میں نے امتحان پاس کیا تو خواجہ صاحب ہندوستان میں تھے۔ چنانچہ ایک حلقے میں بڑی خوشی کی لہر رقص میں آئی ایک ہنگامہ جب برپا ہوا جب یو جی سی سے عابد کو ریسرچ اسکالرشپ ملا۔ عابد نے بینک سے ملازمت چھوڑی اور شعبہ اردو نے تنگ کرنا شروع کیا۔ مگر مرحوم کشیپ جیندر مرحوم جوان دنوں ڈپٹی رجسٹرار (Acads) تھے، میرے دوست ہونے کے ناطے انہوں نے معاونت فرمائی۔ ہم دونوں ...... کالونی کنگ وے کیمپ میں رہتے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ قاضی صاحب مدرسہ نورالدین میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو فون پر ان سے ملنے کی تاریخ اور وقت مقرر کیا گیا۔ جب عابد وہاں پہنچے تو قاضی صاحب نے آمد کا سبب پوچھا۔ عابد نے کے بارے میں انشا معاونت چاہی تو انہوں نے وہی کلمات سنائے جو آپ کے شمارے میں چھپے ہیں۔ اور میں چشم دید گواہ ہوں۔ بلکہ قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا۔ "انشا پر میرا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو"

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا

دلیپ بادل (نئی دہلی)

جمیل بھائی! السلام علیکم

آپ نے حقیر فقیر کو اپنی محبت اور خلوص سے نوازا ہے۔ "سہیل" کے دو دو شمارے روانہ فرمائے۔ میں ممنون و سراپا سپاس ہوں۔ خواجہ احمد عباس پر آپ نے بہت جامع نوٹ دیا ہے "سلسلہ شبنمیہ ......" یہ مضمون شاید ماہنامہ "آستانہ" کے بجائے آپ کو بھیج دیا۔ ارے بھئی "سہیل" میں ایسے مضامین کا کیا کام۔ علمی ادبی مضامین ہی چھاپئے۔ کرامات، الیاس

مشاہیرین چھاپنے والے بہت پرچے نکلتے ہیں۔ آپ کیوں؟ فرماتے ہیں۔ (ویسے اگر کوئی تجارتی نقطۂ نظر پیش پردہ کا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس بھی لے سکتا ہوں)

صفحہ ۱۹-۲۰ پر عرفان عارف صاحب کا افسانہ "کون" نامکمل رہ گیا باقی حصہ پورے پرچے میں نہ مل سکا (جون ۲۰۰۷ء کا شمارہ میں)

صفحہ ۲۴ پر جو "باقی حصہ" کے نام سے چار سطریں شائع ہیں اس کا اصل حصہ ہی غائب ہے۔ کاپی جوڑنے میں شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ راج بہادر گوڑ تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور مظہر میاں دونوں کو ایک ہی آنکھ سے بلکہ ایک ہی طرح دیکھتے ہیں۔ دوسری آنکھ سیاست کے لئے وقف ہے۔ گو صاحب بڑے خلوص کے آدمی ہیں سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے ہیں وہ بندہ نوازی ہی ہو کہ بیر لال ان کے یہاں صد برابر ہیں۔ غزلیں تو کھوک کے بجا شائع کی ہیں

اور سنائیے کیا حال ہے۔ پرچہ تو خیر آپ بڑی پابندی سے شائع کرتے ہیں مگر وہ اک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ــ سہیل کے منور رانا نمبر جیسا کوئی نمبر نکالئے تاکہ "سہیل" کی زندگی کا اندازہ ہو

باقی حالات لائق شکر ہیں

رؤف خیر (حیدرآباد)

مکرمی جمیل منظر صاحب

اپریل مئی اور جون ۲۰۰۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ "سہیل" گزشتہ کئی ماہ سے بے قاعدگی کا شکار رہتا لیکن جون کا تازہ شمارہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اب وقت پر قارئین کو دستیاب ہوا کرے گا۔ ظاہر ہے یہ آپ کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے

دونوں شمارے کے مشمولات خاصے دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مقالہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی ادبی خدمات

کا اعتراف ہے۔ دیکھنا یہ درست ہے کہ کراچی میں ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی روداد فکر انگیز ہے مگر زیادہ حصہ اس کی تیاریوں کا تفصیلی ہے، سیمینار اور مشاعرے کی روداد پر بہت اختصار سے روشنی ڈالی گئی ہے جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے

حصہ منظومات کے تحت چند فروگذاشت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ ۱؎ اپریل مئی کے شمارے میں حبیب سوز کی غزل کے آخری شعر میں قافیہ "خواب" استعمال ہوا ہے۔ دماغ اور چراغ کا قافیہ خواب کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سوز صاحب کی جدت ہے؟ ۲؎ نور جمالی کی غزل کا یہ مصرعہ "دوستوں کی انجمن میں ہم اکیلے رہ گئے" "رہ" کی جگہ "ہو" ہونا چاہئے تھا۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ۳؎ جون کے شمارے میں صفدر امام قادری کی غزل کا یہ مصرعہ "فضا کے ہاتھ میں خنجر کوئی آئینہ بھی نہیں" بحر سے خارج ہے۔

نظموں میں مشرف عالم ذوقی کی نظم "کرب خود کلامی" متاثر کرتی ہے۔

اشفاق عادل (پٹنہ)

محترمی! تسلیم

تازہ شمارہ میں "قاضی عبدالودود اور تحقیق" خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر فریدہ کول کا مضمون "علیم اللہ حالی کی تنقید نگاری" مختصر مگر اہم ہے۔ گوہر امروہوی کی نظم تقدیس اور بیتاب کیفی کی نظم فصیل کرب پسند آئی۔ ایک درجن غزلوں میں اپنی غزل شامل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انشا میہ کالکشن نے متاثر کیا۔ محترم اویس احمد دوراں کا دوسرا شعری مجموعہ "ابابیل" و دیگر کتابوں پر قیصر زماں قیس صاحب کا تبصرہ اچھا رہا۔

عطا عابدی (دربھنگہ)

محترمی! تسلیمات

سہیل کے کئی شمارے ملے۔ آپ کی عنایتوں کا شکریہ! اچھی اچھی نگارشات پڑھنے کو ملیں۔ دل جھوم اٹھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی شاعری پر راج بہادر گوڑ کا تبصرہ خاصا وقیع رہا۔

فریدہ کول کے تبصرے اچھے تھے اور ان کی تنقیدی بصیرت کی غماز ہیں، قیصر زماں قیس کے تبصرے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔

خواجہ احمد عباس جیسی ہمہ جہت رنگ شخصیت پر صرف آپ کا نمبر ناکافی ہے۔ ان کے فکر و فن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سہیل کا ایک شمارہ ان کی نذر کر دیں تو بہت اچھا رہے گا۔ وہ میرے پسندیدہ ادیب، ناول نگار ہیں۔ بلٹز اخبار میں صرف ان کے آزاد قلم کی وجہ سے خرید لاتا تھا۔ ان کے سلسلے میں مزید ستائش قلم کو حرکت نہیں دے سکتے۔ امید ہے کہ میرے حرف آرزو کی آپ ضرور شرح فرمائیں گے۔ اور ان کی شخصیت کے متنوع پہلو کو اجاگر کر کے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

عبدالحق حقانی القاسمی

مکرمی جمیل بھائی، آداب و نیاز

اپریل مئی اور جون کے شمارے ایک ساتھ ملے عنایت کے لئے شکریہ۔

سہیل کا معیار اب اتنا بلند ہو گیا ہے کہ مجھ جیسا قلم کار اپنی تخلیق بھیجنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔

اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ اپنے مواد اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس شمارے میں جناب راج بہادر گوڑ کا مضمون "ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی شاعری کا ایک مطالعہ" بھرپور اور معلوماتی مضمون ہے

ویسے میں اس بات کا معترف ہوں کہ ڈاکٹر گور بچن موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ عبدالسلام عاصم کا مضمون بھی خاصا ہے، مشرف عالم ذوقی کی تقطیم "کمرے خود کلامی" اور نقیب اکبر کی نظم "اگر پسند آئیں" اس شمارے میں غزلوں کی تعداد خاصی ہے اور تقریباً تمام غزلیں معیاری ہیں۔ نوید ہاشمی کا ڈرامہ "سماج کے دشمن" بہت پسند آیا میری طرف سے انہیں مبارک باد۔

جون کا شمارہ بھی اسی آن بان سے شائع ہوا ہے اس میں جناب تارا چرن رستوگی کا مضمون "اقبالیات میں خلیل الرحمٰن صاحب کا مقام و مرتبہ" بہت اہم بصیرت افروز مضمون ہے۔ فردوس گیاوی کی نظم "قتل" قابل داد ہے اس شمارے میں بھی غزلوں کی بھرمار ہے مگر ابھی غزلیں ایسی ہیں جنھیں بھی ہوں بار نظر نہیں ہو گئیں۔ لہذا تمام تخلیقات آپ کی مدیرانہ صلاحیت کی عکاس ہیں۔

جناب نور جمالی صاحب کا یہ شعر ؎

شہر میں جو لوگ پہنے تھے شرافت کا لباس
آئینہ خانے میں جب پہنچے تو ننگے ہو گئے

اتفاقاً میری غزل کے ایک شعر سے ٹکرا گیا ہے میرا شعر یوں ہے ؎

سامنے جب آئینہ کردار کا
کتنے خوش پوشاک اس محفل میں ننگے ہو گئے

یہ غزل میں نے جنوری ۱۹۸۰ء میں کہی تھی اور پہلی بار ماہنامہ [illegible] اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے میں نور صاحب سے کسی استفسار کا متمنی نہیں ہوں تاہم قارئین کی تسکین کے لئے یہ چند الفاظ سپرد قلم کر رہا ہوں۔

ساقی [illegible] (دہلی)

مکرمی! السلام علیکم

آپ کے ارسال کردہ دونوں شمارے ایک ساتھ ملے۔ شکریہ۔ اکتوبر نومبر ۸۳ء کے شمارے میں "خواجہ احمد عباس — ایک ملاقات" "فیض احمد فیض" خاص طور پر پسند آئے۔

نسیم محمد جان (چھپرہ)

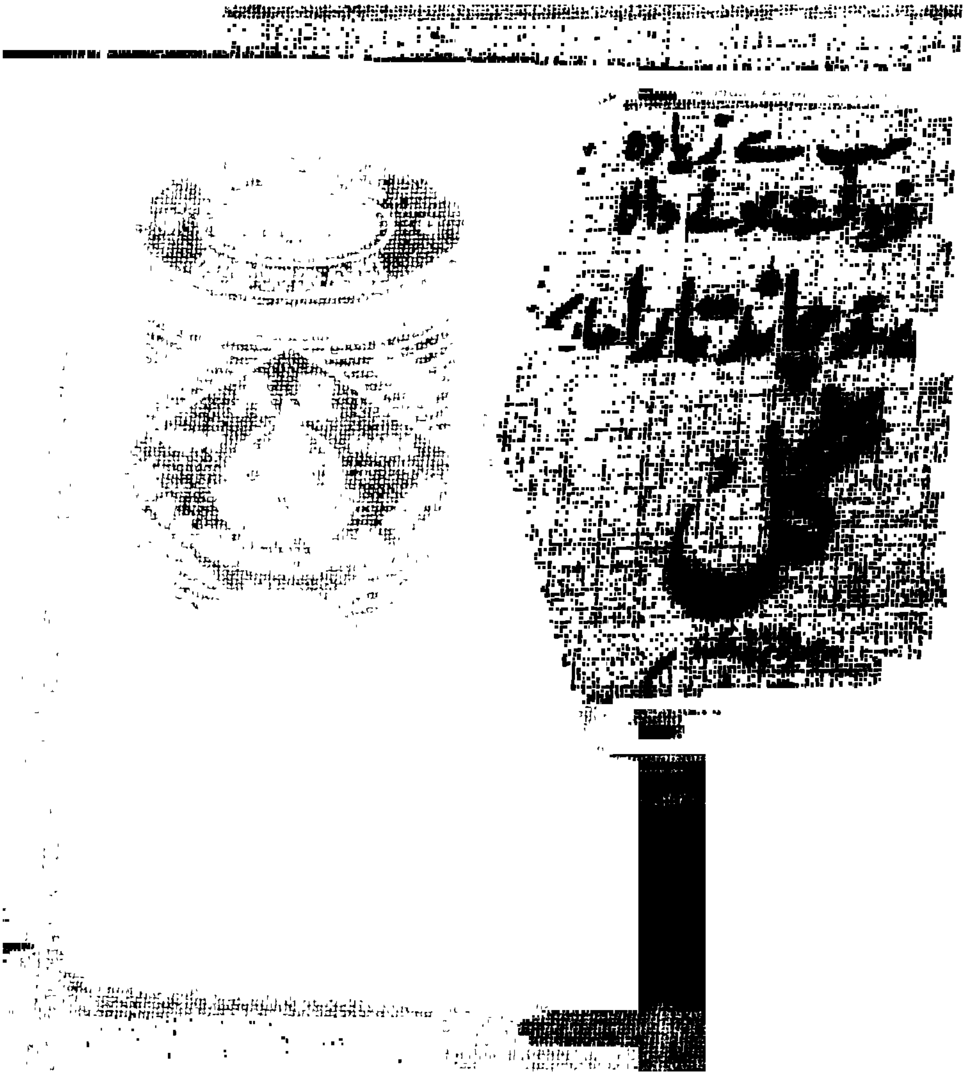
گرامی قدر تسلیمات

الحمد اگست ستمبر ۸۴ء اور اکتوبر نومبر ۸۳ء کے دو شمارے دستیاب ہوئے ابھی پہلا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اختر نگار کا انٹرویو خوب ہے۔ قوی ایک جیتی اور پریم چند خاصا معلومات افزا مضمون ہے ابھی ایسے میں مزید پہلو کی گنجائش ہے عربی غزل کا نمائندہ شاعر میں قاسمی صاحب نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ نظمیں تو کم ہی ہیں مگر خاصی ہیں۔ شمیم نیاز حسن نجمی سکندرپوری اور سیفی سرونجی کی غزلیں پسند آئیں افسانے ملنگی، تاریک روشنی، اور ہم خیال بہت پر اثر ہیں۔

سردار شفیق، مئوناتھ بھنجن

بقیہ: تبصرہ

سماجی اور ادبی صداقتوں کو اپنے معاش کے لئے نہیں بلکہ انسان دوستی اور انسانیت نوازی کی مشعل کو فروزاں رکھنے کے لئے بروئے کار لایا ہے۔ یہی ان کی عظمت ہے اور انفرادیت کی ضمانت بھی۔ جو آج کی صحافتی دنیا میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے



The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya
47 years of Publication

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

(غالب)

